itsurdu.blogspot.com

مشہور و معروف قلم کاروں اور مدیروں کی آپ بیتیوں پر مبنی

پاکستانی ادب کی پہلی تاریخ ساز کتاب

آپ بیتیاں

محبوب الٰہی مخمور

نوشاد عادل

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

شہید پاکستان محسن بچوں کا ادب

شہید حکیم محمّد سعید

عزم صمیم' جہدِ مسلسل اور قوت ایمانی کے ذریعہ انسان اپنی مشکل سے مشکل ترین منزل بھی حاصل کرسکتا ہے۔ دنیا کے تمام افراد کی سوانح ہمیں یہ بھی درس دیتی ہے اور اسی پر عمل کرتے ہوئے حکیم محمد سعید نے اپنے تمام عزائم کو نہ صرف پایہ تکمیل تک پہنچایا بلکہ آنے والی نسلوں کی راہنمائی کے واسطے ایسی شمعیں روشن کیں جن کی لو سے علم کی روشنی دور تک پھیلنے کا سبب بن رہی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ بھی بغیر کسی سہارے اور مال و دولت کے پاکستان آئے مگر ان کا سب سے بڑا سرمایہ ان کی قوت ایمانی' لگاتار محنت' دیانت داری اور وہ لگن تھی جس کی راہ میں بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی کوئی رخنہ نہ ڈال سکی۔ طب کے حوالے سے، بچوں کے ادب کے حوالے سے بھی ان کی کاوشوں کو فراموش کرنا مشکل ہے۔

سابق نگران گورنر سندھ، بحضور اطفال پاکستان، شہید وطن، محسن بچوں کا ادب، مینار عظمت، شہید پاکستان، ماہنامہ ہمدرد نونہال کے بانی، کئی کتابوں کے مصنف کی کتاب زیست کے ناقابل فراموش ابواب، جن کے ان مٹ نقوش آپ کے ذہن سے ہمیشہ کے لیے چسپاں ہو جائیں گے۔ بادشاہ گر شہید حکیم محمد سعید کی زندگی کے بہت سے پوشیدہ پہلوؤں سے پردے اٹھاتی ایک خوب صورت تحریر۔

دلی کے پالم ائرپورٹ پر جہاز روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ پاکستان کو آزاد ہوئے ابھی چند ماہ ہوئے تھے۔ اس جہاز میں ہندوستان سے کافی مسلمان نئے ملک پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ان مسافروں میں ایک اٹھائیس سالہ نوجوان محمد سعید بھی تھا۔ وہ ائرپورٹ پر اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ 9 جنوری 1948ء کا دن تھا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

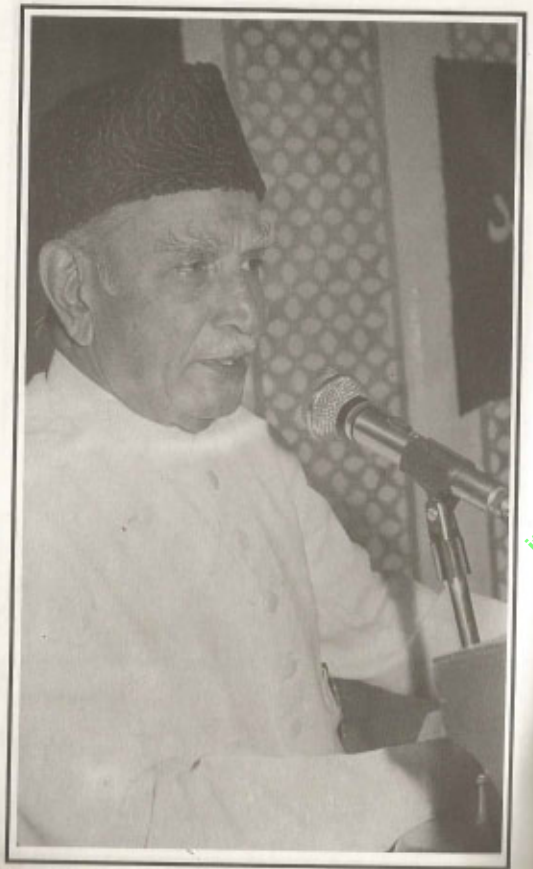

حکیم سعید کا ایک منفرد انداز

اور یہ اس کی سال گرہ کا بھی دن تھا۔

اسے الوداع کہنے کے لیے آنے والی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اس کے جانے والے اور عزیز چاہتے تھے کہ وہ پاکستان نہ جائے۔ کیوں کہ وہ سب ہی کو عزیز تھا۔ بڑے بھائی کے لیے اس کی حیثیت ایک بازو کی سی تھی۔ اس نے کیا کیا خواب نہ دیکھے تھے کہ میں محمد سعید کے ساتھ مل کر طب مشرق کو بام عروج تک پہنچاؤں گا۔ مگر آج وہی بھائی اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر ایک نئے ملک اور انجانی منزل کی طرف رواں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر محمد سعید کے ایک استاد نے کہا۔

"جانے دو! جب کراچی کی سڑکوں پر خاک چھانے گا تو فوراً ہی لوٹ کر دوبارہ دہلی آجائے گا۔"

یہ محض چند الفاظ نہ تھے بلکہ بم کا گولہ تھے جو گویا اس نوجوان کے ارادوں کے حصار کو ہلا رہے تھے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ اب کچھ بھی ہو جائے میں دوبارہ یہاں واپس نہیں آؤں گا اور پاکستان میں ہی کچھ کر کے دکھاؤں گا۔

جیسے ہی جہاز نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا تو اس نے ایک حسرت بھری نگاہ اس شہر پر ڈالی جہاں اس کا سارا خاندان رہائش پذیر تھا۔ یہیں اس کا شرارتوں بھرا بچپن اور پرعزم جوانی کے ابتدائی سال گزرے تھے۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسوؤں کی لڑیاں رواں ہوئیں اور ذہن کے دریچوں پر یادوں کے اوراق پلٹنے لگے۔

اور پھر اس کی نگاہوں میں اپنے بچپن کا ایک منظر گھوم گیا۔

بڑے بھائی اور بزرگوں کے ساتھ اس وقت وہ سب جنگل میں کسی شکار کی تلاش میں تھے۔ گرمی اور شدید دھوپ کے عالم میں دوپہر تک جب کوئی شکار ہاتھ نہ لگا تو وہ بڑا بے چین ہوا۔ ادھر پیاس کے مارے بھی حال برا ہو رہا تھا۔ اس نے گنے کے کھیت سے گزرتے ہوئے ایک گنا توڑ کر چوسنا شروع کر دیا۔ بڑے بھائی نے دیکھا تو پوچھا۔

"گنا توڑنے سے پہلے کیا کھیت کے مالک سے اجازت لی تھی.....؟"

یہ سوال اس کی سماعت سے ٹکرایا تو اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کیوں کہ یہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

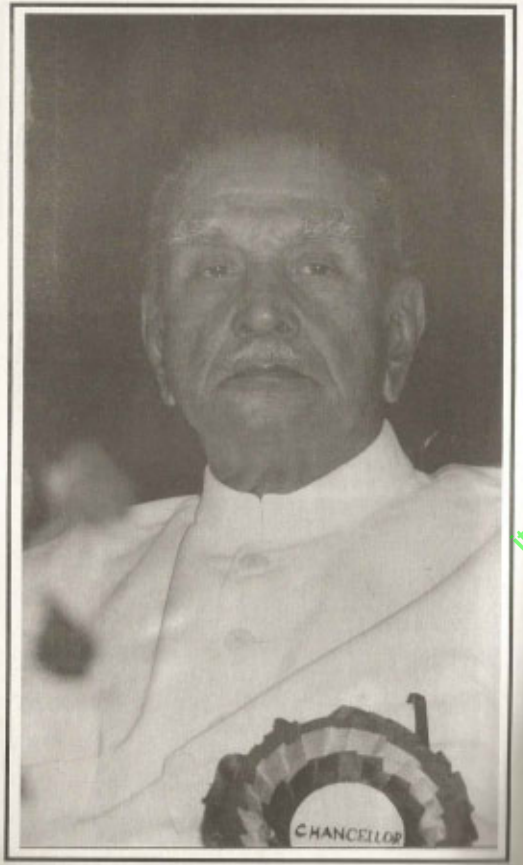

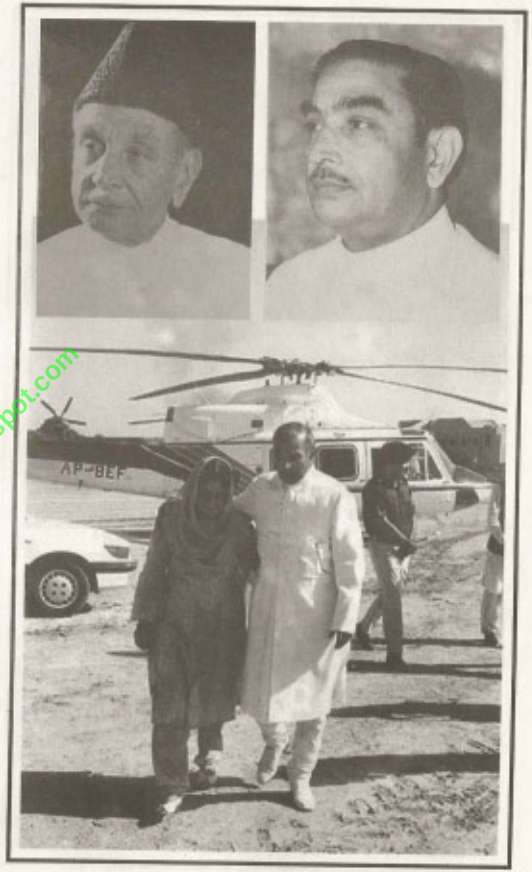

شہید پاکستان حکیم سعید اپنی صاحبزادی سعدیہ راشد کے ساتھ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

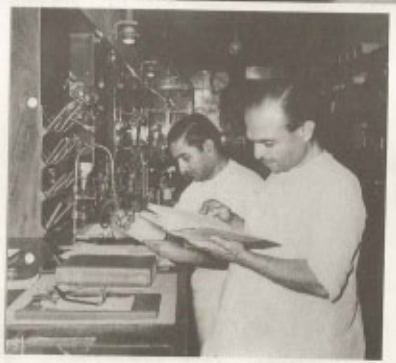

حکیم سعید جواہر لعل نہرو کے ساتھ

حکیم سعید ہمدرد لیبارٹری میں

itsurdu.blogspot.com

سوانحی خاکہ

☆ پیدائش: 9 جنوری 1920ء دہلی

☆ شادی: 1943ء

☆ تعلیم: بی آئی ایم ایس (دہلی)، ڈی ایس سی (میڈیسن آنرزینی)

☆ عہدے: چیئرمین ہمدرد وقف لیبارٹریز، صدر ہمدرد فاؤنڈیشن، بانی صدر مدینۃ الحکمت، چانسلر ہمدرد یونیورسٹی، وقف متولی ہمدرد بنگلہ دیش۔

☆ اعزازات: ستارہ امتیاز (پاکستان) 1966ء، اسلامک میڈیسن پرائز کویت 1982ء، بوعلی ابن سینا پرائز 2000ء

☆ خطابات: سعید ملت، قائد نونہال، سرسید ثانی، شہید پاکستان۔

☆ سرکاری عہدے: مشیر طب و صحت، صدر پاکستان 1979ء، گورنر سندھ 1993ء

☆ قلمی کاوشیں: اردو اور انگریزی کی 190 کتب تحریر کیں۔ پانچ سو سے زائد مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ ایک سو کے قریب مقالے مختلف کانفرنسوں میں پڑھے۔

☆ ادارت: ہمدرد صحت، ہمدرد نونہال، اخبار الطب، آواز اخلاق، ہمدرد میڈیکس، میڈیکل ہائلز، ہمدرد اسلامکس، اینڈیور، Spem

☆ شہادت: 17 اکتوبر 1998ء

خیال تو اسے آیا ہی نہ تھا۔ اب اسے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ بڑے بھائی نے فوراً مالک کی تلاش شروع کروائی۔ جب وہ ملا تو اسے سارا ماجرا بیان کر کے گنے کی رقم لینے پر اصرار کیا۔ اس نے یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا!

"بچہ ہے۔ لے لیا تو کیا ہوا...... اسے ہماری طرف سے تحفہ سمجھ لیجئے۔"

وہ اب تک بھائی کی تربیت کا یہ انداز بھول نہ پایا تھا اور آج ہی اسی تربیت گاہ اور باپ جیسے شفیق بھائی سے اس کا ساتھ چھوٹ رہا تھا۔

جہاز اب اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس کی نظریں دہلی کی طرف تھیں جو لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہا تھا۔ اس شہر سے اس کی جذباتی وابستگی تھی۔ ایک بار پھر وہ ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ منظر نامے میں اس بار وہ بڑے بھائی حکیم عبدالحمید کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"سعید میاں اتم کھیل تو سارے کھیل چکے۔ اب بتاؤ کیا ارادے ہیں؟ کیا زندگی اسی طرح کھیل کود میں بسر کرنی ہے یا کوئی کارنامہ بھی انجام دینا ہے؟"

وہ خاموش کھڑا بھائی جان کو دیکھتا رہا۔ وہ پھر بولے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

"اب تعلیم اور کھیل میں سے تمہیں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا اور فیصلہ بھی تمہیں خود ہی کرنا ہے۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو اور پھر مجھے بتاؤ۔"

بال آخر فیصلہ تعلیم کے حق میں ہوا۔ نوعمر محمد سعید کسی اسکول میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ انہیں ابتدائی تعلیم گھر ہی میں دی گئی۔ ماسٹر اقبال حسین نے انہیں انگریزی اور ماسٹر ممتاز حسین نے اردو اور حساب پڑھایا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم انہوں نے مشہور عالم مولانا قاضی سجاد حسین سے حاصل کی تھی۔ محمد سعید نے ناظرہ قرآن پاک چھ سال کی عمر میں اور حفظ نو سال کی عمر میں مکمل کر لیا تھا۔

سارے کھیل بند ہوئے اور پھر ایک دن بڑے بھائی حکیم عبدالحمید اس کا ہاتھ پکڑ کر دلی میں مسیح الملک حکیم اجمل خان کے قائم کردہ طبیہ کالج لے گئے اور رجسٹرار سے داخلے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جب طالب علم کی عمر بتائی گئی تو رجسٹرار نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ تھی کالج کے قواعد وضوابط کے مطابق اس کی عمر کم تھی۔ حکیم عبدالحمید تو اپنے چھوٹے بھائی کو داخلہ دلوانے کی نیت سے لائے تھے مگر ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ کسی طرح کالج کے قواعد وضوابط پر حرف نہ پڑے۔ انہوں نے رجسٹرار صاحب کو مشورہ دیا کہ امیدوار کا انگریزی' اردو' عربی اور فارسی کا امتحان لے لیا جائے۔ اگر وہ کامیاب ہو جائے تو پھر داخلہ دینے پر غور کیا جائے۔ تجویز مناسب تھی۔ رجسٹرار نے امتحان لیا اور نتیجے کے طور پر محمد سعید نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ ایسے ہونہار طالب علم کو داخلہ دینا کالج کے مفاد میں بھی تھا۔ اس کی لسانیات پر خصوصی توجہ کالج میں داخلے کا سبب بنی۔ اس نوجوان نے بڑی لگن اور توجہ سے طب کی تعلیم مکمل کی اور پھر وہ محمد سعید سے حکیم محمد سعید بن گئے۔

یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اسی دوران ہندوستان کے مسلمان بھی اپنی آزادی اور حقوق کے حصول کی جنگ میں مصروف تھے۔ بال آخر ان کی جدوجہد بار آور ہوئی اور 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور 14 اگست 1947ء کا دن اپنے جلو میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے آزادی کا سورج لے کر آیا۔

ایک بار پھر حکیم محمد سعید کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹا۔ کیوں کہ اب جہاز کراچی کی سرزمین پر لینڈ کر چکا تھا۔ سب مسافر آہستہ آہستہ اترنے لگے۔ جہاز سے اترنے والوں میں حکیم محمد سعید بھی

itsurdu.blogspot.com

تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور کمسن بچی تھی۔ اب کراچی ہی ان کا مستقل مسکن بننے والا تھا۔ وہ اپنے مختصر سے خاندان کے ساتھ جمشید کوارٹرز کی سب سے آخری کالونی "58 اپر سندھ" آ گئے جہاں وہ اپنی رہائش کا بندوبست پہلے ہی کر چکے تھے۔ اس گھر میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ حتیٰ کہ جب رات کو سونے کے لیے تکیے کی ضرورت پڑی تو وہ بھی نہ تھا۔ مجبوراً ننھی بیٹی سعدیہ کے نہالچوں سے ہی کام لینا پڑا۔

کراچی میں ان کی پہلی صبح کا آغاز ہوا۔

اس نئی اور اجنبی جگہ پر عملی زندگی کا آغاز کیسے ہوگا۔ یہ انہیں نہیں معلوم تھا مگر وہ خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر ہر کام کے لیے تیار کر چکے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ البتہ عزم و ارادے کا ایک دریا ان کے اندر موجزن تھا۔ وہ جب ہندوستان میں تھے تو ہمدرد کا ایک وسیع کاروبار تھا۔ ہر طرف محبت بھری نظریں ان کا استقبال کرتی تھیں۔ وہ سب ہی کے منظور نظر تھے۔ ان کی کون سی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ نازو نعم کے اس ماحول سے انہوں نے خود ہی تو نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلے کے وقت ان کے ایک عزیز نے مشورہ دیا تھا۔

"یہ جو ہمدرد کا اتنا وسیع کاروبار ہے۔ اس کے وارث تم دونوں بھائی تو ہو۔ اس لیے اس میں سے اپنا حصہ لے کر پاکستان جاؤ تا کہ عملی زندگی کے آغاز میں تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

مگر انہوں نے مشورہ دینے والے کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا۔

"یہ تو میری والدہ کی خواہش پر بھائی جان قوم کے نام وقف کر چکے ہیں اس لیے اس پر صرف اور صرف ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کا ہی حق ہے اور میں اس میں سے ایک روپیہ بھی لے جانے کا روادار نہیں۔"

اور یوں وہ خالی ہاتھ ہی پاکستان آئے۔

☆☆☆

حکیم محمد سعید جنوری 1920ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ حکیم صاحب کے والد حکیم عبدالمجید کے پانچ بچے تھے جن میں محمد سعید سب سے چھوٹے تھے۔ حکیم صاحب کے آباؤ اجداد سترہویں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

صدی کی ابتداء میں کاشغر سے ہجرت کر کے پشاور میں آ بسے تھے مگر اسی سال بعد اس کنبے نے یہاں سے بھی ترکِ وطن کیا اور ملتان کو آباد کیا۔ 1820ء میں حکیم محمد سعید کے پردادا ملتان سے نکل کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے دلی کا رخ کیا۔ حکیم صاحب کے دادا رحیم بخش پانی پت میں پیدا ہوئے مگر یہ لوگ پھر دلی میں آباد ہو گئے۔ اپنی جوانی میں رحیم بخش دلی سے پھر پانی پت لوٹ گئے جہاں حکیم سعید کے والد عبدالمجید 1883ء میں پیدا ہوئے لیکن پھر یہ خاندان واپس دلی لوٹ آیا جسے انہوں نے اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیا۔

خاندانی روایات اور اس دور کے طریقوں کے مطابق حکیم سعید کے والد حکیم عبدالمجید نے سب سے پہلے قرآن حفظ کیا اور اس کے بعد قاری اور خطاطی میں مہارت حاصل کی۔ حکیم صاحب کے بزرگوں نے اپنی ایک سے دوسری جگہ ہجرت اور پھر ملتان میں قیام کے دوران طبی جڑی بوٹیوں میں دل چسپی لینا شروع کی اور ان کا علم حاصل کیا۔ حکیم صاحب کے والد میں یہ موروثی خوبی نمایاں ہوئی اور انہوں نے اپنے دور کے عظیم طبیب حکیم اجمل خان کے دواخانے میں ملازم ہو کر یونانی اور اسلامی طریق علاج کی تربیت حاصل کی۔ یہاں حافظ حکیم عبدالمجید کو طب مشرق (یا جڑی بوٹیوں کی خصوصیات) کے وسیع مطالعہ کا موقع ملا اور جلد ہی انہوں نے نہ صرف اپنا علیحدہ مطب شروع کر لیا بلکہ دلی کے محلہ "قاضی کے حوض" میں ہمدرد دواخانے کے نام سے علاج معالجہ اور ادویات کی تیاری شروع کر دی۔ ان کے بڑے بیٹے عبدالحمید ان ہی کے نقشِ قدم پر چلے اور باپ کے قائم کردہ "ہمدرد" کو وسعت دی۔ انہیں اپنے چھوٹے بھائی محمد سعید سے بڑی توقعات تھیں مگر وہ مسلمانوں کے لیے حاصل کردہ نئے ملک کو چل دیے۔

☆☆☆

آج محمد سعید گھر سے باہر نکل کر یہ سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ وہ حافظ قرآن تھے۔ سوچا کہ چلو کسی اسکول میں بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں تاکہ گزر بسر کا کوئی آسرا تو ہو مگر یہ کام بھی نہیں بنا۔ ایک اسکول کے چوکیدار نے تو ان کی ظاہری حالت دیکھ کر انہیں اسکول کے اندر ہی داخل نہ ہونے دیا۔ اب وہ ہر روز صبح کام کی تلاش میں نکلتے تو پیدل ہی کراچی کی سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ حالاں کہ ہندوستان میں ان کے پاس وہ شاندار گاڑی تھی جو

افکار سعید

☆ اگر پاکستان میں روزِ اول سے نافع اور اسلامی تعلیم کا آغاز کرایا جاتا تو آج پاکستان کا شمار دنیا کے عظیم ممالک میں ہوتا اور اقوام عالم پاکستان کا اتباع کرتیں۔ مگر پاکستان میں ہم نے نافع تعلیم اور اسلامی تعلیم سے صرفِ نظر کیا۔ گناہ پر گناہ یہ کہ پوری قوم کو جہالت کی تاریکیوں کے حوالے کر دیا۔

☆ آج ریاست اسلامی پاکستان میں ایک حشر برپا ہے۔ ایک قیامت ہے کہ پاکستان پر ٹوٹ پڑی۔ اقتدار ہو کہ اختلاف، سیاست ہو کہ صحافت، امامت ہو کہ امارت۔ سب کے سب دولت کے پجاری بنے ہوئے ہیں۔ اس سے بڑی قیامت بھی بھلا کوئی ہو سکتی ہے کہ ہر انسان اپنا ایمان فروخت کرتا چلا جا رہا ہے۔ ہر شخص اپنی خودداری کا نیلام عام کر رہا ہے اور وطنوں کے انبار لگائے چلا جا رہا ہے۔ اپنی آزادی فروخت کر رہا ہے اور پاکستان کی آزادی سے کھیل رہا ہے۔ دولت کو کھو رہا ہے اور پاکستان سے آنکھیں بند کیے چلا جا رہا ہے۔

اس وقت صرف اور صرف وائسرائے ہی خریدنے کا متحمل ہو سکتا تھا مگر پھر بھی آج پیدل گھومتے ہوئے ان کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی کوئی احساس تاسف نہیں تھا۔ ہاں البتہ اب انہیں پیدل سفر کے دوران بھوک بہت لگنے لگی تھی۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ گھر آ کر بیگم سے کہا "اب روزانہ صبح ناشتے میں مجھے موٹا سا پراٹھا بنا کر دیا کرو تاکہ جلد بھوک نہ لگے۔"

ایک نئے ملک میں ناکافی وسائل کے ساتھ ایک طرح کی مفلوکانہ زندگی گزارنا آسان نہیں تھا مگر محمد سعید کے اندر انتہائی پائیدار جذبے موجود تھے اور ان کا عزم صمیم ان کے پختہ ارادوں کو قائم رکھے ہوئے تھا۔

کئی روز کی کوششوں کے بعد بالآخر انہیں ایک اسکول میں پڑھانے کا کام مل گیا۔ انہوں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ پاکستان میں ان کی پہلی ملازمت تھی مگر عارضی تھی۔ اسی دوران وہ برابر کوشش میں لگے رہے کہ اپنے بڑے بھائی کی خواہش کے مطابق وہ طب کا خاندانی پیشہ اپنائیں۔ انہیں ایک روز خیال آیا کہ آخر مطب کیوں نہ شروع کیا جائے۔ مگر کہاں؟

یہ بھی ایک اہم اور تکلیف دہ مسئلہ تھا کہ خالی ہاتھ مطب کے لیے جگہ کیسے حاصل کی جائے۔ خاصی بھاگ دوڑ کے بعد اعوان لاج کا ایک کمرا پسند آیا۔ اس کا مالک ایڈل ڈنشا تھا جو پگڑی کی رقم لیے بغیر کمرا کرائے پر دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ حکیم محمد سعید بھی اس پر کھلے لفظوں میں واضح کر چکے تھے کہ "مجھے ماہانہ کرایہ پچاس روپے منظور ہے مگر پگڑی کے لیے کوئی رقم میرے پاس

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔

حکیم محمد سعید کم و بیش روزانہ ہی اس کے پاس آتے رہے۔ بالآخر ایک روز اس نے ان کے عزم اور حوصلے کی داد دیتے ہوئے اپنے مطالبے سے دستبرداری کا فیصلہ کیا اور انہیں بغیر پگڑی لیے کمرا کرائے پر دے دیا۔ اس کمرے میں فرنیچر نہیں تھا لہٰذا انہوں نے ساڑھے بارہ روپے ماہانہ کرائے پر ضروری فرنیچر حاصل کیا اور یوں مطب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ گویا پاکستان میں ہمدرد کا آغاز تھا۔

مطب کے بعد اب انہیں دوا سازی کی بھی فکر ہوئی۔ اس کے لیے بھی کشادہ جگہ کی ضرورت تھی۔ اس بار ان کی نگاہِ انتخاب دھرم شالہ روڈ پر واقع ایک جگہ پر پڑی جس کی الاٹمنٹ جمشید نسروانجی کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ اس موقع پر ان کے بزرگ سید میراں محمد شاہ مدد کو آگے بڑھے اور انہوں نے حکیم محمد سعید کو ایک تعارفی رقعہ جمشید نسروانجی کے نام دیا۔ جب ان کی ملاقات جمشید صاحب سے ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

"تم جوان ہو..... یہ جگہ لے کر کیا کرو گے.....؟"

"میں حکیم ہوں، مطب قائم کر کے دوا سازی کروں گا۔ اس طرح لوگوں کی خدمت ہو گی۔" حکیم صاحب نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

"جمشید نسروانجی نے بخوشی اعوان لاج کے سامنے والا حصہ انہیں دے دیا اور یوں مطب کے ساتھ ساتھ دوا سازی کے کام کا بھی آغاز ہو گیا۔ بعد میں ان کے بہنوئی حکیم محمد یحییٰ بھی دہلی سے آ گئے جس سے انہیں کافی سہارا ملا اور دوا سازی کا کام پھیلنے لگا اس دوران بھائی حکیم عبدالحمید نے انہیں دہلی سے ہمدرد کے گرائپ واٹر "نونہال" کی سیکڑوں بوتلیں بھیج دیں۔ یہ ہمدرد پاکستان کے مالی استحکام کا سبب بنا۔

دہلی سے چلتے وقت حکیم محمد سعید کی والدہ نے آنسوؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا تھا اور بہو کے ہاتھ میں ایک تکیہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے سنبھال کر رکھنا۔ ایک دن نعمت بیگم نے کسی خیال کے تحت اس تکیے کو ادھیڑا تو اس میں سے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔ وہ دونوں ماں کی محبت اور ایثار کے اس جذبے سے بے حد متاثر ہوئے۔ ماں نے خالی ہاتھ جانے والے سب سے چھوٹے بیٹے کی

مالی مدد کا یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ حکیم محمد سعید کو ایسے حالات میں اس رقم نے بہت سہارا دیا۔

دوا سازی کا کام شروع ہوا تو ادویات کی تیاری کے بعد اسے فروخت کرنے کے لیے بھی ایک بڑی جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب تک حکیم محمد سعید مالی طور پر کافی مستحکم ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فریئر روڈ پر ایک دکان خرید لی۔ اسی دوران ان کے ایک کرم فرما بزرگ سید میراں محمد شاہ نے جو اس وقت وزیر مہاجرین تھے انہوں نے بجلی کا کنکشن فوراً دلوا دیا (بعد میں میراں محمد شاہ اپیین میں سفیر بھی رہے۔ واپس پاکستان آ کر KDA کے صدر بنے) ایک روز انہوں نے حکیم محمد سعید سے کہا۔

"میاں سعید! پاگل نہ بنو۔ اپنے لیے کوئی بڑا سا پلاٹ زمین کا ٹکڑا پسند کر لو۔ میں الاٹ کیے دیتا ہوں۔"

مگر وہ نہ مانے۔ جو گھر تھا وہ بھی ان کی بیگم کے نام تھا' ان کی بیگم کے انتقال کے بعد انہوں نے یہ گھر اپنی بیٹی سعدیہ راشد کے نام کرا دیا اور یوں وہ اپنی بیٹی کے کرایے دار بن گئے اور ہر ماہ اسے نقد کرایہ ادا کرتے رہے۔

اسی دوران ان کے ساتھ ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔ ایک روز پولیس نے مطب پر دھاوا بول دیا۔ پولیس پارٹی کے انچارج ڈی ایس پی حامد حسین کا مؤقف تھا کہ مطب پر قبضہ غیر قانونی ہے اور پولیس حکیم محمد سعید کی بات آسانی سے ماننے کو تیار نہ تھی۔ بالآخر کافی پریشانی کے بعد یہ مسئلہ حل ہوا اور حکیم صاحب کو ذہنی کوفت سے نجات ملی۔

حکیم محمد سعید کا معمول تھا کہ وہ مطب میں بیٹھ جاتے۔ مریض باری باری آتے اور مرض کی کیفیت بیان کرنے کے بعد دوا لے کر چلے جاتے۔ ایسی ہی قطار میں ایک دن جمشید نسروانجی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنی باری پر وہ آئے فرضی مرض بیان کیا' نسخہ لیا مگر دوا نہیں لی۔ بعد میں کسی نے نسروانجی سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ تھی؟ تو انہوں نے کہا "میں یہ دیکھنے کے لیے آیا تھا کہ مطب کیسا چل رہا ہے اور کیا واقعی یہ جگہ صحیح معنوں میں اسی کام کے لیے استعمال ہو رہی ہے جس کے لیے میں نے دی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ مطب کے ذریعے دکھی اور بیمار لوگوں کی خدمت ہو رہی ہے۔"

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ادھر ہمدرد کی تیار کردہ مصنوعات کی فروخت میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا گیا اور دوا سازی کے کام کے لیے مزید جگہ کی ضرورت ناگزیر ہوگئی۔ منصوبہ بندی کے بعد ناظم آباد میں فیکٹری کے لیے ایک وسیع جگہ خریدی گئی جس کے لیے ان کی بیگم کا زیور تک بک گیا۔ یوں ہمدرد لیبارٹریز کا کاروبار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ اسی دوران انہوں نے بھارت سے آئی ہوئی گرائپ واٹر کی بوتلوں کی قیمت بھی اپنے بھائی حکیم عبدالحمید کو واپس بھجوادی تاکہ ان کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ رہے۔ انہوں نے ہندوستان سے روانگی کے وقت کہا تھا کہ ''ہمدرد (وقف) انڈیا پروہاں کے بسنے والوں کا ہی حق ہے۔''

پاکستان میں ہمدرد کے پھلتے پھولتے کاروبار کو انہوں نے 1953ء میں والدہ کی خواہش اور بڑے بھائی کی تقلید میں قوم کے نام وقف کردیا۔ اسی سال انہوں نے بچوں کی تفریح، تعلیم اور تربیت کے لیے ایک ماہنامہ ''ہمدرد نونہال'' جاری کیا جو اپنے اندر بچوں کے لیے بے پناہ دل چسپی، معلومات اور تربیت کے کئی گُر لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ رسالہ آج بھی بلاناغہ اسی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

دو سال بعد پاکستان بھر کے اطبا کی رہنمائی اور ان سے رابطے کے لیے ''اخبار الطب'' جاری کیا۔ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی.....؟ اس کے لیے طبی تحریک کا پس منظر جاننا یقیناً دل چسپی کا باعث ہوگا۔

پاکستان کے قیام کے دو سال بعد ہی پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے ایک قرارداد پیش کی کہ طب یونانی غیر موثر اور فضول ہے۔ اس لیے اسے ممنوع قرار دیا جائے۔ 1950ء میں یہاں تک ہوا کہ رجسٹرار سندھ میڈیکل کونسل نے تمام اطبا کو نوٹس جاری کردیئے کہ وہ مطب کرنے کے مجاز نہیں۔ بعد ازاں ایک طبی بل اسمبلی میں پیش ہوا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر 17 اپریل 1957ء کو اس وقت کے وزیر صحت ظہیر الدین نے بل پیش کیا جو منظور کرلیا گیا۔

اس بل کی منظوری سے ایک سال قبل ہی حکیم محمد سعید نے طب مشرق کے احیاء کے لیے انجمن ترقی طب کے سیکریٹری کی حیثیت سے مختلف سیاست دانوں، ارکان اسمبلی اور اخبار و جرائد کے حوالے سے ایک تحریک چلائی جو بارآور ثابت ہوئی۔ اس تحریک کے نتیجے میں ایک طبی بورڈ

دادا..... حافظ رحیم بخش	نانا..... شیخ کریم بخش
والد..... حکیم حافظ عبدالمجید	والدہ..... راجہ بیگم
بھائی بہن..... حمیدہ بیگم، حکیم عبدالحمید، محمودہ بیگم، حافظ عبدالوحید	
شریک حیات..... نعمت بیگم	اولاد..... سعدیہ راشد
نواسیاں..... ڈاکٹر ماہم منیر احمد، آمنہ ہمایوں، میاں فاطمہ الزہرہ منیر احمد	
داماد..... بیرسٹر راشد منیر احمد	

قائم ہوا۔ جدوجہد ہوئی اور بالآخر 3 دسمبر 1966ء کو کراچی میں شاہراہ حکیم ابن سینا پر ادارہ حکمت و تحقیقات طب کا قیام عمل میں آیا۔ طب کے فروغ کے لیے انہوں نے ایک کوشش اور کی اور وہ یہ کہ انہوں نے کراچی میں ہمدرد طبیہ کالج قائم کیا۔ اس کا افتتاح 14 اگست 1958ء کو قائد اعظم کی عزیز بہن محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔

جون 1956ء کی بات ہے جب ایک دن شدید گرمی میں وہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد گھر لوٹے تو سخت کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ ان کا دل ڈوبنے لگا اور کچھ دیر بعد وہ بے ہوش ہوگئے۔ دوست احباب بھاگ کر آئے اور فوراً ہی انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ بلڈ پریشر انتہائی کم اور دل کی کیفیت بے حد نازک ہے۔ معالجین نے ہدایات دیں کہ ہر قسم کی حرکت سے گریز کیا جائے۔ غسل تو درکنار وضو بھی نہ کیا جائے۔ حکیم محمد سعید کو ہوش میں آنے کے بعد ان احتیاطی تدابیر سے آگاہ کردیا گیا۔

معالجین کو خطرہ تھا کہ انفلوئنزا کے جراثیم دل پر حملہ آور ہو چکے ہیں اور اس سے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ مریض کو نماز بھی اشاروں سے پڑھنا ہوگی۔ برش کرانے کا فرض بھی نرس انجام دے گی۔ اب حال یہ تھا کہ مریض کی معمولی سی حرکت تک معطل کردی گئی۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد بخار نے آدبوچا اور اس نے تریاق کا کام کیا۔ خون کا دباؤ بحال ہونے لگا اور کمزوری میں بھی رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی۔ دل کی حرکت بھی معمول پر آگئی اور آنکھیں خود بخود کھلنے لگیں۔ رات ایک بار پھر معالجین نے معائنے کے بعد بتایا کہ دل کی حالت

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

نازک ہے اور کسی بھی وقت یہ دوبارہ ٹھہر کر زندگی سے رشتہ توڑ سکتا ہے۔ یہ ان کی قوت برداشت کا امتحان تھا۔ موت انہیں چند قدم کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ادھر حرکت کی نہیں اور موت آئی نہیں۔

رات پابندیوں کے سائے میں کٹی۔ صبح ہوئی تو انہوں نے چپکے سے غسل کیا اور نماز فجر ادا کی۔ ''یا قوی'' کا ورد کیا اور پھر کسی کو پتا چلنے سے قبل ہی دوبارہ بستر پر دراز ہو گئے۔ اب تو یہ روزانہ کا معمول ہو گیا۔ نرس کے کرنے کا کوئی کام ہی نہ رہا۔ وہ بے کاری سے بیزار ہو کر چلی گئی۔

معالجین مطمئن تھے کہ مریض پوری طرح ان کی ہدایات پر عمل کر کے صحت یابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک روز انہوں نے اپنی حالت پر خود غور کرنا شروع کیا۔ پھر تازہ گلاب کا ایک پھول عرق گلاب میں پیس کر اس میں شہد ملایا اور پینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد پان کا پتا پودینہ اور ادرک کو جوش دے کر پینا شروع کیا۔ انہی دنوں انفلوئنزا اور ہارٹ اٹیک کے سبب تین اموات تواتر کے ساتھ ہوئیں اور یہ تینوں شخصیات نامور تھیں۔ ان میں لندن میں متعین ایک پاکستانی سفارت کار محمد سلیم، سر آغا خان اور فلم ساز فضل کریم شامل تھے۔ ان باتوں نے بھی ان پر وحشت طاری کر دی تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس قسم کی خبریں مریض کو معالجین کی ہدایات کا سختی سے پابند کرواتیں، مگر یہ مریض تو کچھ اور ہی انداز کا تھا۔ موت کو ابدی زندگی سے رابطے کا وسیلہ سمجھتا تھا۔ انہوں نے ایک نرالی حرکت کی۔ چپکے سے ریل کا ٹکٹ کٹایا اور راولپنڈی پہنچ گئے۔ پہلی رات ایک دوست صفدر کے ہاں بسر کی۔ دوسرے دن ایبٹ آباد چلے گئے ایبٹ آباد سے نتھیا گلی پہنچے اور وہاں چند دن رہنے کا ارادہ کیا۔ صفدر سے قسم لی کہ ''میرا پتہ کسی کو نہ بتانا۔''

اب نتھیا گلی کی فضائیں تھیں اور تنہائی۔ انہوں نے اپنا رابطہ مکمل یک سوئی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے جوڑا اور سوچنے لگے کہ میں بیمار ہونے سے قبل خود اپنے دن رات کے آرام سے بالکل بے خبر ہو گیا تھا اور انفلوئنزا کے مریضوں کی خدمت میں مصروف رہا۔ مجھے ان مریضوں سے ملنے والی تمام روحانی دعائیں کہاں گئیں؟ کیا وہ فضا میں تحلیل ہو گئیں؟ نہیں نہیں...... ایسا نہیں ہو سکتا۔

انہیں اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا تھا۔ ان لمحات میں فکر بیدار ہوئی اور روح کو تازگی ملی اور روحانی مسرتوں نے مرض سے آہستہ آہستہ نجات دلانی شروع کی۔

افکار سعید

☆ ''ہمیں ہر حال میں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ انگریزی عالمی زبان کو ثانوی تعلیم میں اختیار کیا جائے۔ دنیا کا ہر آزاد ملک ابتدائی تعلیم قومی زبان میں دیتا ہے۔ جرمنی کئی دہائیوں تک انگریزوں کے زیر اثر رہا اور امریکا کا ماتحت رہا مگر ذریعہ تعلیم جرمن زبان ہی رہی۔ یہی حال جاپان کا ہے چین کا ہے اور دنیا کے ہر ملک کا ہے۔ ہم نے پاکستان میں ابتدائی تعلیم کے لیے انگلش میڈیم کی اجازت دے کر پاکستان کی اساس اور بنیاد کو نقصان پہنچایا ہے اور تہذیب مغرب کو ہوا دی ہے۔''

☆ کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے مقام غیرت نہیں ہے کہ ہم پاکستان میں پچاس سال سے 27 رمضان اور قیام پاکستان کی اہمیت سے قطعاً صرف نظر کر رہے ہیں۔ اس سے بڑی بدبختی بھی کیا اور ہو سکتی ہے کہ بھلائے ابھی 27 رمضان قیام پاکستان ہے اور ہم 14 اگست کو ترک کرنے کے لیے تیار نہ کل تھے اور نہ آج ہیں!''

حکیم محمد سعید ہمدرد کے فروغ اور پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اپنا ہر لمحہ اور ہر سوچ قربان کر چکے تھے۔ یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کے قیام کے تقریباً ایک سال بعد ہی پاکستان کے بانی قائد اعظم محمد علی جناح انتقال کر گئے۔ اس کے بعد ملک کے تمام تر انتظامی معاملات کی ذمے داری قائد ملت لیاقت علی خان کے کاندھوں پر آن پڑی اور پھر 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد اقتدار کے حصول کے لیے جو رسہ کشی ہوئی اور جس طور کے لوگ حکمران بن بیٹھے وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس عرصے میں پاکستان کے قیام کی اصل روح ہی فراموش کر دی گئی تھی۔ یہ بات حکیم محمد سعید کو بہت کھٹکتی تھی لہٰذا انہوں نے ہمدرد کے پلیٹ فارم سے تمام تر دستیاب وسائل بروئے کار لا کر ''شام ہمدرد'' کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد شروع میں تو عظیم پاکستانیوں کو وثیقۂ اعتراف پیش کرنا تھا، مگر بعد ازاں اس کے مقصد کو مزید وسعت دیتے ہوئے ایک ایسا فکری ادارہ بنا دیا گیا جس میں علماء اور دانشور حضرات بیٹھ کر غور و فکر کرتے اور ملکی مسائل کے حل کے لیے تمام ممکنہ تدابیر تحریری رپورٹ کی صورت میں حکومت کو بھیجتے تاکہ ملک میں ترقی اور سدھار کا راستہ ہموار ہو۔ بعد میں اسے ہمدرد مجلس شوریٰ کا نام دے دیا گیا۔

حکیم محمد سعید کھلے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ انہوں نے طب یونانی کو طب مسلمانی کہا اور زندگی بھر اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کے مثبت پہلوؤں کے بھی معترف رہے۔ 1963ء میں چین جانے والے طبی وفد میں وہ بھی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

شامل تھے۔انہوں نے چین میں رہ کر وہاں کی طب کا بغور مشاہدہ مطالعہ کیا اور واپس آ کر کتاب ''میڈیسن ان چائنا'' لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔اس کتاب کے بارے میں چینی دانشوروں کا خیال ہے کہ حکیم محمد سعید نے ہمارے لیے وہ کام کیا ہے جو ہمارے اپنے نہ کر سکے۔

طب کے فروغ کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں 1966ء میں ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا۔

انہوں نے ملک میں طب کے حوالے سے تحقیقی کام کو سرکاری سطح پر کرنے کی کوشش کی مگر انہیں اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ایک بار انہوں نے کویت کے شیخ کو اسلامی تحقیقاتی ادارے کے قیام کا مشورہ دیا۔جواب میں انہیں دس منٹ کی ملاقات کی اجازت ملی۔وہ جب کویت جا کر شیخ سے ملے تو انہوں نے کہا ''میں آپ کا نیا کارڈیولوجی سینٹر دیکھ کر آیا ہوں۔وہ بہت اچھا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تحقیقی ادارے کی بھی اشد ضرورت ہے۔'' حکیم محمد سعید نے اس موقع پر بتایا ''ایک بار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو دل کا درد ہوا۔پسینہ بھی آنے لگا۔یہ دل کے دورے کی علامت تھی۔آنحضور ﷺ نے انہیں پہلے کسی طبیب کے پاس بھیجنے کا کہا مگر پھر واپس بلا لیا کہ اس سے کام نہیں ہوگا۔آپ نے سات عدد کھجوریں مع گٹھلیوں کے پیس کر سعد بن ابی وقاص کو پلایا۔اس سے دل کا درد دور ہو گیا۔حکیم محمد سعید نے کہا کہ ان دواؤں کے خواص کو جاننے کے لیے اسلامی تحقیقاتی ادارے کی اشد ضرورت ہے۔شیخ ان سے متفق ہوئے اور ادارے کے قیام کی اجازت دیتے ہوئے 60 کروڑ روپے اس کے لیے مختص کر دیے۔باتوں کا سلسلہ 10 منٹ کے بجائے 65 منٹ تک جاری رہا مگر شیخ نے انہیں نہ ٹوکا' بلکہ ملاقات کے اختتام پر انہیں خود دروازے تک چھوڑنے آئے۔

بابائے بصریات ابن الہیثم کی تحقیقات اور کام سے مسلمانوں کی بے خبری حکیم محمد سعید کو بہت کھٹکتی تھی۔ایک ابن الہیثم ہی کیا ہمارے اسلاف میں سے کئی نامور مسلمان سائنس دانوں کی عظیم علمی تحقیقات اور سائنسی کارناموں سے عالم اسلام کی بے خبری قابل افسوس ہے۔بتایا جاتا ہے کہ انسانی جسم میں خون کی گردش کا پہلا نظریہ ولیم ہاروے نے پیش کیا تھا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کئی سو سال پہلے مشہور مسلمان سائنس دان ابن النفیس یہ نظریہ پیش کر چکے تھے۔حکیم محمد سعید

☆ اے اللہ! دشمن اسلام کو نیست و نابود فرما جیسی دعاؤں کے لیے آج بھی ہمارے ہاتھ بلند و دراز ہیں مگر اللہ تعالیٰ کیسے ان دعاؤں کو شرف قبولیت بخشے گا۔جب کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ پورا عالم عرب و اسلام روح فکر سے خالی ہو چکا ہے۔روح عمل سے بیگانہ ہو چکا ہے۔تعلیمات قرآن حکیم سے غافل ہو چکا ہے۔عبادت الٰہی سے عاری ہو چکا ہے۔سنت نبوی ﷺ کو فراموش کر چکا ہے۔''

☆ ''پاکستان میں گزشتہ پچاس سال سے تعلیم کے ساتھ جو مذاق جاری ہے اس نے پاکستان کو آج غلامی کی ذہنی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔تعلیم ہی نقطہ وہ ہتھیار ہے جس کی طاقت سے قلوب فتح کیے جاتے ہیں۔فکر اغیار پر قابو حاصل ہوتا ہے۔حفظ حریت وطن کا جذبہ فراواں ہوتا ہے۔خودی اور خودداری کا تصور قائم رہتا ہے۔''

نے نومبر 1969ء میں ابن الہیثم کا ہزار سالہ جشن منانے کا اہتمام کیا اور اس جشن کے تحت مختلف مقامات پر شام ہمدرد میں مذکرات ہوئے۔انہوں نے اس عظیم شخصیت پر تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ابن الہیثم کی عربی تصنیف ''کتاب المناظر'' علم بصریات پر سب سے پہلی جامع کتاب ہے۔حکیم محمد سعید نے اس کی تلاش شروع کی۔یہ کتاب ناپید تھی۔تلاش کے دوران معلوم ہوا کہ اصل عربی کتاب کو اس وقت ہی ضائع کر دیا گیا تھا جب ایک برطانوی ماہر بصریات نے اس کا انگریزی ترجمہ لکھ کر اسے اپنی کتاب بنا کر پیش کیا۔جب حکیم محمد سعید نے معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو وہ اس راز تک پہنچے اور پھر اس کی کھوج میں لگ گئے۔وہ ''کتاب المناظر'' کی تلاش میں پہلے ترکی گئے' بعد میں بغداد اور مصر گئے۔یہاں سے بھی ناکامی ہوئی تو انہوں نے ایران کا رخ کیا۔بالآخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ ''کتاب المناظر'' کا نسخہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے انہیں معلوم ہوا کہ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہارورڈ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اے آئی صابرا نے کیا ہے۔ڈاکٹر کا تعلق مصر سے تھا۔حکیم محمد سعید اس کتاب کے لیے کئی بار ہارورڈ یونیورسٹی گئے اور یوں یہ ترجمہ ان کی کوششوں سے منظر عام پر آیا۔بعد میں پاکستان کے محکمہ ڈاک نے ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔انہوں نے ''کتاب المناظر'' کے علاوہ ابن الہیثم کے سات مقالات کا بھی اردو ترجمہ کروا کر اسے بڑے اہتمام سے شائع کروایا۔

حکیم محمد سعید کی دوسری پسندیدہ شخصیت ابوریحان محمد بن احمد البیرونی کی تھی جس کے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کارناموں کو اجاگر کرنے اور ان کی کتب کو سامنے لانے کے لیے انہوں نے پاکستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ملکوں میں اس کی کمیٹیاں بنوائیں اور اس کا کام کو پھیلایا۔ انہی کی کوششوں سے البیرونی پر ایک بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوئی۔

جب ایوب خان برسر اقتدار تھے تو انہوں نے حکیم محمد سعید کو سیاست میں حصہ لینے کا مشورہ دیا' مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ مولانا کوثر نیازی سے حکیم محمد سعید کے دیرینہ تعلقات تھے اور باوجود سیاسی اختلاف کے دونوں تا عمر اچھے دوست رہے۔

انہی دنوں کی بات ہے' حکیم محمد سعید کی ملی بگڑ چکی تھی مگر انہوں نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ اس سے قبل اپنے دل کے ساتھ کر چکے تھے۔ وہ 1970ء میں امریکا کے دورے پر گئے۔ محمد شعیب وہاں موجود تھے۔ وہ دونوں گہرے دوست تھے۔ محمد شعیب وزیر خزانہ بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے حکیم محمد سعید کو طبی معائنے کا مشورہ دیا۔ سرجن برنارڈ وائش نے معائنہ کیا اور مختلف رپورٹس کے نتیجے میں زیادہ فعال تلی کو نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ فیصلہ نہ صرف سرجن کا تھا بلکہ دوست احباب کی رائے بھی اسی کے حق میں تھی۔ حکیم محمد سعید نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور کہا ہار پھر اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اپنا علاج خود کریں گے۔

اسی زمانے میں ان کی ملاقات ایک ایسی امریکی خاتون سے ہوئی جو "کافی کپ" پڑھنے میں بڑی مشہور تھی۔ حکیم محمد سعید اس ملاقات سے قبل "کافی کپ" کو مذاق سمجھتے تھے۔ ان خاتون کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر پلاتی اور پھر کپ میں بچ جانے والی تلچھٹ ہلانا شروع کر دیتی۔ اس طرح کافی کے کپ میں ان کے مطالعے کے لیے نقش و نگار بن جاتے۔ وہ ان کا مطالعہ کر کے کافی پینے والے کا ماضی' حال اور مستقبل بیان کر دیتی۔

بڑی مشکل سے حکیم محمد سعید ان خاتون سے ملاقات کے لیے راضی ہوئے۔ ایک دن ملاقات کا وقت طے ہوا۔ مقررہ دن وہ خاتون آ گئیں اور اپنے ساتھ لائی ہوئی کافی بنا کر انہوں نے حکیم محمد سعید کو پلائی۔ بچ جانے والی تلچھٹ سے اس نے پڑھنا شروع کیا اور ان کا ماضی بتاتے ہوئے کہا کہ "خدمت خلق کے شعبے میں ان کی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے اور یہ بعد میں بھی یاد رکھی جائیں گی۔"

حال کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ "یہ اپنی بیماری کا علاج خود کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایسا کرنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔" مستقبل کے بارے میں ان کی گھریلو زندگی کے متعلق بتاتے ہوئے کہا کہ "ان کی بیٹی سعدیہ راشد کے ہاں کئی بیٹیاں پیدا ہوں گی۔" آج حکیم محمد سعید کی نواسیوں کی تعداد تین ہے۔

حکیم محمد سعید امریکا میں آپریشن کروائے بغیر پاکستان آ گئے۔ بعد ازاں ان خاتون کی بات سچ ثابت ہوئی اور ایک دن وہ اپنے مطب میں ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ محمد شعیب ان دنوں عالمی بینک کے نائب صدر تھے۔ انہوں نے اپنی بیگم کو واشنگٹن سے کراچی بھیجا اور حکیم محمد سعید کو امریکا بلا لیا۔ طبی معائنے کے بعد انکشاف ہوا کہ اگر تلی کا فوری آپریشن نہ کیا گیا تو زیادہ نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔ حکیم محمد سعید تلی کے متعلق ہونے والی تشخیص سے تو متفق تھے مگر علاج وہ اپنے دیسی طریقے سے کرنے پر بضد تھے۔ انہوں نے کراچی سے واشنگٹن جانے سے قبل اپنا وصیت نامہ تحریر کر کے اپنی سیکریٹری خانم للی ڈی سلوا کو دے دیا تھا۔ بال آخر وہ آپریشن کروانے پر راضی ہو گئے۔ جارج ٹاؤن اسپتال کے ریڈیو آئی سوٹوپ ڈویژن میں تلی کی کارکردگی کا ازسرنو جائزہ لیا گیا جس نے اس بات کی تصدیق کی کہ اگر مریض کا فوری آپریشن نہ کیا گیا تو ناقابل تلافی نقصان کا خطرہ موجود رہے گا۔ 3 مئی 1971ء کو آپریشن کا دن مقرر ہوا۔ خود کو بے ہوش کیے جانے سے قبل انہوں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ "میرا اپنڈکس کا آپریشن بھی لگے ہاتھوں کر دیجئے مگر خیال رہے کہ میں نے زندگی بھر اینٹی بایوٹک ادویات سے پرہیز کیا ہے' اسے ذہن میں رکھ کر میرے جسم کے ساتھ سلوک کیجئے گا اور کسی خطرناک آدمی کا خون مجھے نہ دیجئے گا۔"

اس کے بعد سات گھنٹے کا آپریشن ہوا جو بغیر و خوبی انجام پایا۔ دو روز بعد سرجن نے معائنہ کیا تو حیران رہ گیا۔ اینٹی بایوٹک کے بغیر بھی گھرے گھاؤ بھر چکے تھے۔ سرجن نے اپنی حیرت دور کرنے کے لیے ان سے پوچھا۔

"سعید صاحب! ایک بات تو بتائیں؟"

"جی فرمایئے.....!" حکیم محمد سعید نے کہا۔

"کیا آپ کا جسم عام انسانوں سے مختلف ہے؟ کیوں کہ سارے گھاؤ صرف دو دن میں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ابا جان

دفتر میں ابا جان ایک ڈسپلن قائم رکھتے تھے۔ میں پہلے دن آئی تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے میرے منہ سے "ابا جان" نکل گیا عادت جو ابا جان کہنے کی پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً مجھے ٹوک دیا۔ "دفتر میں میں ابا جان نہیں ہوں۔" میرے لیے اتنا ہی جملہ کافی تھا۔ اس کے بعد تو چیئرمین صاحب اور حکیم صاحب کہنے کی ایسی عادت پڑی کہ گھر میں بھی یہی کہنے لگی۔ میں ان کو دیکھتی تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور وہی کرتی تھی۔ میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ کہیں۔ ساری دنیا مجھے کہے لیکن مجھے پروا نہیں تھی لیکن میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ ابا جان مجھے کچھ کہیں۔

ابا جان کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے رفقائے کار سے مشورہ ضرور کرتے تھے۔ ایک دفعہ فیصلہ کر لیتے تو بس اس پر قائم رہتے۔ آخری دنوں میں تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ مجھے اپنی نیند کا ایک گھنٹہ اور کم کرنا پڑے گا۔ میں نے کہا آپ یہ کیسے کریں گے..... چار گھنٹے تو آپ سوتے ہیں تین گھنٹے سو کر آپ فنکشن کس طرح کریں گے۔ وہ کہنے لگے نہیں مجھے کام بہت ہے۔ مجھے اپنی نیند کا ایک گھنٹہ کم کرنا ہی پڑے گا۔

جب غیر ملکی کرنسی پر پابندیاں تھیں اور بیرونی سفر کے لیے اسٹیٹ بینک سے مقررہ زرمبادلہ ملتا تھا تو ابا جان سفر سے واپس آ کر بچا ہوا ایک ایک ڈالر واپس کر دیتے تھے۔ بعض اوقات تو جتنا فارن ایکسچینج لے گئے ہیں وہ بھی سارا واپس کر دیا ہے۔ ان کا کوئی "فارن اکاؤنٹ" نہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں بلایا جاتا اور سفر خرچ پیش کیا جاتا تو وہ لکھ دیتے کہ اس کی ضرورت نہیں میں اپنے خرچ پر آؤں گا۔ کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مقالوں پر اچھا خاصا معاوضہ لیتا مجھے پسند نہیں۔

ابا جان کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا۔ کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ ہمیشہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ایسے اچھے اور بھلے ایک نفس انسان پر کیسے گولیاں چلائی گئیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدمت کرنے والے امر ہو جاتے ہیں۔ وہ امر ہو گئے ہیں۔

(سعدیہ راشد)

بھر گئے ہیں!"

"اس جسم میں بڑی مضبوط روح ہے۔" حکیم صاحب نے مختصر مگر جامع جواب دے کر معالج کو خاموش کر دیا۔

مولانا کوثر نیازی نے 1977ء میں الیکشن کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر حکیم محمد سعید کو سیاست میں آنے کا مشورہ دیا جسے انہوں نے محبت کے ساتھ رد کر دیا۔ جب یہ بازگشت

خون جگر!

وزیر اعظم پاکستان کی حیثیت سے بے نظیر بھٹو صاحبہ مدینۃ الحکمۃ کا دورہ کر رہی تھیں۔ بیت الحکمۃ کے دورے کے دوران انہوں نے حکیم محمد سعید سے جوان دنوں صوبہ سندھ کے گورنر تھے کہا۔

"گورنر صاحب! کیا آپ ہمیں یونہی گھماتے پھراتے رہیں گے یا چائے وائے بھی پلوائیں گے۔"

اس موقع پر مرکزی وزیر آفتاب شعبان میرانی نے وزیر اعظم سے کہا "حکیم صاحب تو خود چائے نہیں پیتے۔"

اس پر بے نظیر بھٹو نے حیرت سے حکیم صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا "تو گورنر صاحب آپ کیا پیتے ہیں؟"

حکیم محمد سعید نے برجستہ جواب دیا "قوم کے غم میں اپنا خون جگر پیتا ہوں۔" اس پر بے نظیر بھٹو مسکرا کر خاموش ہو گئیں۔

سنی گئی تو روزنامہ "آفاق" کے مدیر مصطفیٰ صادق نے مولانا کوثر نیازی پر چوٹ کی کہ کسی کو تو غیر جانب دار رہنے دیں۔ لیکن مولانا کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے حکیم محمد سعید کے بہترین دوست مسرت حسین زبیری کو آگے بڑھایا وہ انہیں منائیں مگر حکیم صاحب قطعی طور پر سیاست کے خارزار میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

پھر ایک دن حکیم محمد سعید کی رائے اور خواہش کے برخلاف پاکستان پیپلز پارٹی نے اعلان کر دیا کہ انہیں ٹکٹ دیا جا رہا ہے۔ انہوں نے پی پی پی کے چیئرمین اور ملک کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے نام تار بھیجا کہ مجھے نظر انداز کر کے یہ ٹکٹ کسی اور کو دے دیا جائے۔ ان کی یہ درخواست بے اثر ثابت ہوئی اور یہ خبر پریس کو جاری کر دی گئی کہ حکیم محمد سعید پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیں گے۔

اب بے بسی کا عالم یہ تھا کہ قومی اسمبلی کا مبینہ امیدوار نہ چاہتے ہوئے بھی انتخابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر مجبور تھا۔ انتخاب اور سیاست میں حصہ نہ لینے کی دو بڑی وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کا مزاج سیاست کرنے کا نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ جس پارٹی نے انہیں ٹکٹ دیا تھا اس سے ان کی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کوئی وابستگی نہ تھی۔ انہیں تو حیرت اس بات پر تھی کہ وہ اس پارٹی کے ممبر بھی نہ تھے جس نے انہیں انتخابات میں اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا مگر وہ جانتے تھے کہ بھٹو صاحب کا اپنا مزاج تھا۔

اب انتخابی جلسوں میں عجیب تماشا ہوا۔ یہ ایک عام روش ہے کہ ان مواقع پر ہر امیدوار اپنے حریف کے ماضی کی ناکامیوں اور خامیوں کو اپنے ووٹروں کے سامنے مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اے این پی کے امیدوار رفیق باجوہ نے ایک انتخابی جلسے میں حکیم محمد سعید کے خلاف کچھ کہا تو جوابی طور پر وہ خاموش رہے۔ یہ رویہ پارٹی کی مرضی کے خلاف تھا۔ ان کے اس انداز سے تنگ آ کر پاکستان پیپلز پارٹی نے اندر ہی اندر ان کی مخالفت شروع کر دی۔ اب انہیں پارٹی کے رہنماؤں کی طرف سے وارننگ ملی کہ آپ اپنا رویہ تبدیل کریں اور پارٹی کے چیئرمین بھٹو صاحب کی ہر جلسے میں تعریف کیا کریں۔ مگر وہ تو سچائی کے علمبردار تھے۔ بھلا ایسا کیسے گوارا کر سکتے تھے۔ جب انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو وہ بری طرح شکست کھا چکے تھے اور وہ تو خود یہی چاہتے تھے۔

حکیم محمد سعید کے ساتھ دل اور تلی کے ساتھ آنکھ نے بھی بے وفائی کرنے کی کوشش کی۔ 1977ء میں مذاکرہ عالمی تعلیمی اسلامی کانفرنس کا انعقاد مکہ میں ہوا۔ پاکستان سے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں اے کے بروہی ڈاکٹر خیرات ابن رسا عبدالہاشم خان اور ڈاکٹر منظور احمد کے ساتھ حکیم محمد سعید بھی شامل تھے۔ اس کانفرنس کے دوران حکیم محمد سعید کی ذاتی رائے یہ تھی کہ ساری دنیا کے مسلمان ممالک میں پرائمری تعلیم ایک جیسی ہونی چاہیے۔ وہ عملی طور پر بھی اس فکر کو ساتھیوں میں عام کرنے کے لیے کوشاں رہے۔

قیام مکہ کے دوران حکیم محمد سعید کی راتیں خانہ کعبہ میں اور دن مذاکرے کی تیاری میں صرف ہوتے۔ یہ سلسلہ چار روز تک جاری رہا۔ ایک روز ان کے ساتھ آئے ہوئے مندوب ابن رسا نے پوچھا "بھائی سعید! کیا تمہیں سونے کی عادت نہیں؟ تم مسلسل چار روز سے جاگ رہے ہو۔" حکیم محمد سعید زیر لب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پانچویں رات انہوں نے مدینہ منورہ میں بسر کی۔ وہاں سے نماز فجر کے بعد روانگی ہوئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے حکیم محمد سعید کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے آنکھوں کے سامنے شعلے لپک رہے ہوں۔ یہ روشنی ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ دائیں آنکھ بند کی مگر

کیفیت پھر بھی وہی رہی۔ اسی کیفیت میں مکہ پہنچے اور پھر براستہ جدہ لندن آ گئے۔ جہاں وہ چودہ چودہ گھنٹے مطب کرنے لگے اور اس کے بعد کراچی آ گئے۔ آنکھ کی تکلیف نے ہر جگہ بے چین رکھا۔ جب تکلیف برداشت سے باہر ہوئی تو ماہرین امراض چشم سے مشورے ہوئے مگر ان کی تکلیف کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اسی دوران حکیم محمد سعید کو امریکا جانا پڑا۔ میزبان محمد شعیب نے ان کی آنکھ کے طبی معائنے کا پہلے ہی سے انتظام کر رکھا تھا۔ وہاں یہ حقیقت سامنے آئی کہ دائیں آنکھ کے قرنیہ میں سوراخ ہو چکا ہے اور یہ سوراخ اس قدر غیر معمولی ہے کہ آنکھ کا ڈھیلا کسی بھی وقت سامنے آ سکتا ہے۔ فوری آپریشن تجویز ہوا مگر یہاں بھی انہوں نے سوچنے کے لیے مہلت مانگی۔ بعد میں قرنیہ کے نامور سرجن ڈاکٹر بل کرٹن سے رابطہ ہوا اور آپریشن کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

مقررہ دن حکیم محمد سعید نے سن کرنے کی دوا کے استعمال کے بغیر آپریشن کرایا اور لیزر کے گیارہ جھٹکے برداشت کیے۔ آپریشن کے اختتام پر سرجن نے حیران ہو کر کہا "کمال ہے۔" یہ عمل تو بڑا تکلیف دہ تھا مگر آپ نے اف تک نہیں کی۔"

حکیم محمد سعید نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا محترم جوشاک میں پہلے اٹھا چکا ہوں وہ ان لیزر شعاعوں سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔

ایک جمہوری حکومت کی معزولی کے بعد جب جنرل محمد ضیاء الحق نے صدر کے عہدے کا بھی حلف اٹھا لیا تو انہوں نے حکیم محمد سعید کو اپنا مشیر طب بننے کی پیشکش کی۔ حکیم صاحب نے اس پر بہت غور و خوض کیا۔ وہ اس کے حق میں تو نہ تھے مگر صرف ایک مقصد ایسا تھا جس نے انہیں یہ عہدہ قبول کرنے پر آمادہ کیا اور اس خیال سے وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ "اس عہدے پر رہ کر میں طب کے فروغ کے لیے بہتر کام کر سکوں گا۔"

حکیم محمد سعید مشیر طب بن گئے۔ ان کا عہدہ وفاقی وزیر کے برابر تھا۔ اس عہدے کو قبول کرنے کے باوجود انہوں نے مطب نہ چھوڑا اور نہ ہی حکومت سے کسی قسم کی سہولت طلب کی۔ بلکہ فراہم کردہ سہولتیں بھی واپس کر دیں۔ جن میں سرکاری کار، پیٹرول، ٹیلی فون اور گارڈز وغیرہ شامل تھے۔

ایک بار سرکاری خرچ کے لیے ملنے والا غیر ملکی زرمبادلہ، جس کی مالیت بیانوے ہزار روپے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

بلا کا آدمی

"میرا نام...." اس نے اپنا کارڈ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ نام کے ساتھ بہت سی علمی ڈگریاں اور سماجی اعزازات مرقوم تھے۔ اخبار نویس، وکیل، منتظم، دانشور، آرٹسٹ، آج کل مجلس اقوام متحدہ کے میگزین کوریا کے تامل ایڈیشن کا ایڈیٹر ہے اور اسی تامل اخبار کی رونمائی کی مہم پر دنیا بھر میں گھوم رہا ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں پاکستانی ہوں تو پوچھا۔

"کیا آپ حکیم محمد سعید کو جانتے ہیں؟"

"جانتا کیا معنی۔" میں نے کہا "وہ ہمارے مخدوم ہیں ان کا شمار ہمارے ملک کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔"

وہ پچھلے ہفتے کسی کانفرنس کے سلسلے میں امریکا میں ایک ہفتہ حکیم محمد سعید کے ساتھ ایک ہی ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں مقیم رہا تھا اور جہاں علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں حکیم صاحب کے درک و دستگاہ کا معترف تھا وہیں حکیم صاحب کے بعض معمولات سے بھی بہت متاثر تھا۔

"صاحب بلا کا آدمی ہے تمہارا حکیم صاحب۔ غضب کی سردی میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہاتا ہے۔ ٹھنڈا شیروانی پہنتا ہے۔ ایک وقت کا کھانا نہیں کھاتا۔ روزانہ اٹھارہ بیس گھنٹے کام کرتا ہے۔ رات کو ڈائری لکھ کر بستر پر جاتا ہے۔"

وہ حکیم محمد سعید صاحب کی مصروفیات، معمولات سے کافی باخبر تھا۔ حیرت اس پر ہوئی کہ اسے یہ بات معلوم نہ تھی کہ حکیم صاحب نے پاکستان قومی اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا تھا۔

(ضمیر جعفری کے سفرنامے "سورج میرے پیچھے" سے اقتباس۔ مطبوعہ 1995ء)

تھی انہوں نے دوبارہ سرکاری خزانے میں جمع کرادیا جس پر ان کی وزارت کے ایک آفیسر نے ان سے کہا "آپ غلط روایات قائم کررہے ہیں۔"

ان کی سرکاری مصروفیات ان کی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی راہ میں رکاوٹ بننے لگیں تو انہوں نے ایک روز اس عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور اس کی وجہ یہ لکھی۔

"میرے لمحات بہت قیمتی ہیں۔ میں مزید انہیں ضائع نہیں کرسکتا۔ اس لیے مجھے چھٹی دے دی جائے۔"

اگست 1981ء میں انہیں ایک سانحے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کی رفیقہ حیات کا اس دن

انتقال ہوا۔ ان کی شادی 1943ء میں دہلی میں ہوئی تھی۔ 1948ء میں وہ اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ کراچی آگئیں تھیں۔ انہوں نے گھر کی تمام ترذمے داریاں اپنے سر لے کر شوہر کو زندگی کے دیگر معاملات کے لیے آزاد کردیا تھا۔ حکیم صاحب آخری وقت تک اپنی بیوی کے ان احسانات کو نہیں بھولے۔ وہ اکثر اپنی بیگم کے اس ایثار کا ذکر کرتے تھے کہ انہوں نے "ہمدرد پاکستان" کے قیام کے لیے اپنا زیور تک بیچ دیا اور کبھی اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ ایک بار حکیم محمد سعید نے کہا کہ زیور واپس لے لو تو کہا کہ میرا زیور تو آپ ہیں۔ 38 سالہ رفاقت کے اس سفر میں انہوں نے ہمیشہ رات دیر تک آنے پر شوہر کا انتظار کیا اور ان سے پہلے کبھی رات کا کھانا نہیں کھایا۔ اولاد نرینہ نہ ہونے پر انہوں نے حکیم محمد سعید کو دوسری شادی کا بھی مشورہ دیا جو انہوں نے نہ مانا۔

1983ء کا سال حکیم محمد سعید کے لیے اہم تھا۔ خانہ کعبہ میں انہیں ایک ایسے شہر کے بسانے کا خیال آیا جو علم وحکمت کا منبع ہو اور جہاں بیک وقت تعلیم وتحقیق کی تمام ترسہولتیں میسر ہوں۔ اسی خیال کو انہوں نے زندگی کا مشن بنالیا۔ اس شہر علم وحکمت کے لیے کراچی سے چند میل دور ایک بیاباں میں 1260 ایکڑز مین خریدی گئی۔ اس جگہ کی پسندیدگی کی وجہ یہ تھی کہ تاریخی شواہد کے مطابق یہاں محمد بن قاسم کے قدم سندھ میں داخلے کے وقت سب سے پہلے پہنچے تھے۔ جب حکیم محمد سعید نے زمین خرید کر یہاں ایک شہر علم وحکمت بسانے کا خیال ظاہر کیا تو سب ہی نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا۔ ایسی بے آباد جگہ جہاں پانی کا بھی انتظام نہ تھا وہاں تعلیمی شہر بسانے کا خواب عقل سے ماورا لگتا تھا۔ مگر وہ تو کام کے دھنی تھے۔ ارادہ کرکے فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیتے تھے اور خود عملی کام میں مصروف ہوجاتے تھے۔

دسمبر 1983ء کی ایک سرد شام ملک کے دانشوروں اور عالموں نے اپنے اپنے نام کی ایک اینٹ رکھ کر اس کی تعمیر کا آغاز کیا۔ کام آگے بڑھتا گیا۔ دو سال بعد ایک بڑی جامعہ "ہمدرد یونی ورسٹی" کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس کے دو سال بعد 1987ء میں ہمدرد پبلک اسکول کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جب یہ اسکول مکمل ہوگیا تو یہاں تعلیم کا آغاز ہوا۔

1991ء میں بڑی کوششوں کے بعد ہمدرد یونیورسٹی کا چارٹر منظور ہوا اور حکیم محمد سعید اس کے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کالم نویسوں کا خراجِ عقیدت

☆حکیم صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ دلی کے ایک متوسط گھرانے کا لڑکا جو باپ کے سائے سے محروم ماں اور بڑے بھائی کے سہارے دنیا کمانے نکلا تھا اس نے اپنا سفر اس تیزی سے طے کیا کہ پھر تو دنیا پیچھے رہ گئی اور وہ علم و ادب کی خدمت کا سودا سر میں لیے منزلوں مارتا چلا گیا۔ افسوس جسے دلی کے بلوائی نہ مار سکے اسے ہم نے مار دیا۔ (زاہدہ حنا)

☆پاکستان کے پچاس برسوں پر نگاہ دوڑائیں تو تین عظیم ترین پاکستانی دکھائی دیتے ہیں۔ قائداعظم ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور حکیم محمد سعید (عبدالقادر حسن)

☆وہ اپنی زبان سے اپنے قلم سے اپنی دولت سے اپنی محنت سے اپنے خیالات سے اس دنیا کو بدل دینا چاہتے تھے۔ اس ملک کو عظیم تر بنا دینا چاہتے تھے اور اس شہر کی روشنیوں میں اضافہ کر دینا چاہتے تھے۔ افسوس کہ جس شہر نے ان کی صلاحیتوں سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اسی کی سڑک پر ان کی لاش خون میں نہائی پڑی تھی۔ ان کی شہادت سے دورِ مسیحائی تمام ہوا۔ (نفیس صدیقی)

☆جس کے دل میں پاکستان کی محبت تھی جو غریبوں کا ہمدرد تھا۔ جس کے خون کے ہر قطرے میں اسلام کی عقیدت اور علم کے چراغ جل رہے تھے۔ اس گرم خون کو سڑک پر بہا دیا گیا۔ ایک خوش پوش نفیس شخص کو فرش پر گرا دیا۔ چند سکوں کی دو چنگی بارود اور لوہے کے برادے نے مدینۃ الحکمۃ اور لاکھوں کتابوں کو ذہن میں رکھنے اور سینکڑوں کتابوں کو لکھنے والے کو خاموش کر دیا۔ (قمر علی عباسی)

تمہارے بچوں میں جو بانٹتا تھا علم کا نور
اسی ستارۂ دانش کو دفنا دیا لوگو.........!

(اقبال حیدر)

ہم جو بیمار ہیں کہاں جائیں
جب مسیحائے روزگار گیا
ہو گئی بارگاہِ طب ویران
آخری بار لُٹ گیا یونان

(جون ایلیا)

3 جون اور ہمدرد

☆3 جون 1947ء کو ریڈیو دہلی سے تقسیم ہند کا منصوبہ پیش ہوا۔ یہ تاریخ ہمدرد کے لیے بھی اہم ہے۔
☆3 جون 1948ء کو کراچی میں حکیم محمد سعید کے ہاتھوں ہمدرد کا قیام عمل میں آیا۔
☆3 جون 1991ء کو صدر پاکستان کے ہاتھوں حکیم محمد سعید کو ہمدرد یونیورسٹی کا چارٹر ملا۔
☆3 جون 1998ء کو وزیر اعلیٰ پنجاب کے ہاتھوں ہمدرد مرکز، ہمدرد مطب اور ہمدرد کا نفرنس سینٹر کا افتتاح ہوا۔

تاحیات چانسلر منتخب ہوئے۔ انہوں نے ڈاکٹر منظور الدین احمد کو اس کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا۔ یہیں ہمدرد لائبریری کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اسے ''بیت الحکمۃ'' کا نام دیا گیا۔ یہاں پر ہمدرد سینٹر کراچی سے حکیم محمد سعید کے ذاتی ذخیرے کی تمام کتب لائی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے پبلشروں اور لائبریریوں سے خریداری اور تبادلے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ حکیم محمد سعید کا عزم تھا کہ اسے پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری بنایا جائے۔ اس لائبریری کا افتتاح 11 دسمبر 1989ء کو اس وقت کے صدر غلام اسحٰق خان نے کیا۔ بیت الحکمۃ کی یہ عمارت ایک لاکھ ستائیس ہزار مربع فٹ پر مشتمل ہے جو مکمل طور پر ایئر کنڈیشن ہے۔ یہاں پر کمپیوٹر، ٹیلی فون، انٹرکام، فیکس، اسکیننگ مشین، انٹرنیٹ، آڈیو ویڈیو سیکشن، پروجیکٹرز اور ہیڈ پروجیکٹر، فلم، مائیکرو فش، لیمی نیشن اور فوٹو کاپی کی سہولتیں موجود ہیں۔

اس لائبریری میں عربی، اردو، فارسی اور انگریزی کی تقریباً سوا چار لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ حکیم محمد سعید کی خصوصی توجہ تو سارے شعبوں پر ہی رہی مگر دو شعبے خصوصی طور پر پروان چڑھے۔ ان میں ایک ترجمہ قرآن ہے۔ یہاں پر 64 زبانوں پر مشتمل 359 تراجم قرآن کے نسخے ہیں۔ دوسرا شعبہ تراشہ جات کا ہے۔ جہاں تقریباً گیارہ سو موضوعات پر تراشہ جات کی فائلیں قارئین کے استفادے کے لیے موجود ہیں۔

حکیم محمد سعید کی کتاب سے محبت کا یہ واقعہ بھی یاد رکھا جائے گا کہ ایک بار ایران میں گھومتے ہوئے لب سڑک کسی پرانے کتب فروش سے انہوں نے فارسی کی ایک کتاب خریدی اور بعد میں اسے ہمدرد لائبریری کے ذخیرے میں جمع کرا دیا۔ حکیم محمد سعید اس کتاب کو بھول چکے تھے۔ ایک

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

بار پھر اس کتاب کی کہانی گردش میں آئی جب ایران کے سرکاری علمی تحقیقی ادارے کا ایک وفد بیت الحکمۃ کا دورہ کرنے آیا۔ وہ لائبریری کی خدمات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اسی دوران ان کی نظر فارسی شاعری کے اس مجموعے پر پڑی جو حکیم محمد سعید ایران کے پرانے کتب فروش سے خرید کرلائے تھے۔ وفد کے ارکان جان گئے کہ یہ تو ایران کے عظیم شاعر فردوسی کا خود ہاتھ سے لکھا ہوا مسودہ "شاہنامہ" ہے۔ وفد حکیم محمد سعید سے ملا اور اس مسودے کو ملک کے میوزیم میں رکھنے کے لیے مانگا۔ اس کے بدلے انہوں نے حکیم محمد سعید کو خطیر رقم کی پیشکش بھی کی مگر حکیم محمد سعید نے ان کا مطالبہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ کتاب اب بیت الحکمۃ کی امانت ہے اور اس پر صرف اور صرف اس کے قارئین کو ہی مطالعے کا حق ہے۔

حکیم محمد سعید کا علم و ادب میں خدمت کا سفر یہاں تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے شام ہمدرد کا پلیٹ فارم بھی اس سے قبل تشکیل دیا تھا۔ تعلیمی ادارے بھی قائم کرتے جا رہے تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور تفریح کے لیے انہوں نے 1953ء میں ہمدرد نونہال بھی جاری کیا تھا۔ 1988ء میں بزم ہمدرد نونہال کا آغاز ہوا۔ حکیم محمد سعید نے خود زندگی بھر وقت کی پابندی کو شعار بنایا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ بچوں کو اس تربیت سے محروم کرتے۔ انہوں نے یہاں بھی پابندی وقت کا درس دیا اور ہمیشہ یہ بزم مقررہ وقت پر شروع کرا دیتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بچوں کے ادب پر توجہ نہیں دی گئی۔ حکیم محمد سعید کو اس کا بڑا قلق تھا۔ انہوں نے ہمدرد کے پلیٹ فارم سے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور ریڈیو پاکستان کے سینئر براڈ کاسٹر رفیع الزمان زبیری کی خدمات حاصل کر کے ایک شعبہ نونہال ادب قائم کیا اور اس کے تحت بچوں کی کتب کی اشاعت کا آغاز کر دیا گیا۔ اس کے لیے ملک کے تمام ادیبوں سے مسودات طلب کیے گئے۔ خود حکیم محمد سعید نے بھی اس شعبے کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ انہیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ بچوں کے لیے سب سے زیادہ سفر نامے انہوں نے ہی لکھے ہیں۔ بچوں کے لیے سب سے پہلا سفر نامہ لکھنے کا اعزاز ان کے رفیق خاص مسعود احمد برکاتی کو حاصل ہے۔

1993ء میں ملک کے وزیر اعظم محمد نواز شریف مستعفی ہوئے تو سندھ حکومت میں بھی تبدیلی

افکار سعید

☆ "ہم نے زبان سے اقرار کیا ہے مگر اپنے تسلسل عمل سے اس حقیقت کی نفی کی ہے کہ نونہال بھی پاکستان کا عنوان ہیں۔ نونہالوں کا عظمت پاکستان کی عظمت و رفعت ہے۔ اگر ہم نے اپنے نونہالوں کو عظیم نہ بنایا تو پاکستان عظیم و رفیع نہیں بن سکتا۔ گزشتہ پچاس سال سے ہم پورے ظلم و تسلسل کے ساتھ نونہالوں کو جہل اور جہالت کی نظر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے نہایت بے شرمی کے ساتھ گولڈن جوبلی منائی مگر ہم نے 95فی صد نونہالوں کو تعلیم و تربیت سے محروم کر رکھا ہے۔ اگر آج پاکستان حقیر، فقیر اور سراپا تقصیر ہے تو اس کی وجہ تربیت و تعلیم نونہالان سے غفلت ہے۔"

ہوئی۔ حکیم محمد سعید اعلیٰ حکومتی اداروں کے بے حد اصرار اور ملکی مفاد میں سندھ کے گورنر بنے۔ وہ تقریباً چھ ماہ اس عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران انہوں نے صوبے میں جامعات کے اضافے کے لیے کوششیں کیں اور کامیاب بھی رہے۔ ان کے دور میں چار نئی جامعات کو چارٹر ملے۔ اس کے علاوہ تعلیمی مسائل کے حل کے لیے انہوں نے ماہرین تعلیم اور محکمہ تعلیم کے ذمے داران پر مشتمل ایک تعلیمی گول میز کانفرنس بھی بلائی۔

15 دسمبر 1994ء کو کراچی کے ایک ہوٹل میں یو یسف کی بچوں سے متعلق ایک رپورٹ کی تعارفی تقریب تھی۔ جس کی صدارت نثار کھوڑو کر رہے تھے۔ حکیم محمد سعید کو بھی اس تقریب میں بطور خاص بلایا گیا تھا۔ انہوں نے اس تقریب میں نونہالان پاکستان کی بے بسی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جب بھوک اور فاقہ کشی کے شکار نحیف و نزار بچے کوڑوں کے ڈھیر پر غذا تلاش کرتے نظر آتے ہیں تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو ان کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔ اگر ہم نے اس وقت قوم کے ان نونہالوں کے حال پر توجہ نہیں دی تو انسانیت کے بنیادی مسائل اور گمبھیر ہو جائیں گے۔"

تقریب کے اختتام پر حکیم محمد سعید اپنے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے کہ ایک صحافی ان کے پاس آیا اور نہایت رازداری کے ساتھ اپنا پیجر ان کے سامنے کر دیا۔ پیجر پر پیغام تھا۔

"حکیم سعید کو گولی مار دی گئی!"

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

انہوں نے یہ پڑھ کر ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ اس پر وہ صحافی ہی نہیں آس پاس موجود دیگر دوست واحباب بھی انہیں غور سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں ہوٹل کا منیجر پریشانی کے عالم میں آیا اور کہنے لگا "سر ہوٹل میں ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ گیا ہے اور ہر کوئی آپ کے بارے میں معلوم کر رہا ہے۔" یہ بات آناً فاناً ہوٹل میں موجود تمام ہی لوگوں کو معلوم ہو گئی اور وہ حکیم محمد سعید کے قریب آتے گئے اور ان سے خیریت دریافت کرنے لگے۔ وہ ہنس کر سب کو جواب دیتے۔ دوسری جانب ہمدرد سینٹر میں بھی پاکستان کے ہر کونے اور دنیا بھر سے حکیم محمد سعید کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون آنے لگے اور وہاں موجود عملہ انہیں مطمئن انداز میں جواب دیتا رہا۔ یہی عالم اخبارات کے دفاتر میں بھی رہا۔

ریڈیو پاکستان کراچی نے عوام میں پھیلی بے اطمینانی اور حکیم محمد سعید سے ان کی محبت دیکھ کر فوری طور پر حکیم محمد سعید کا اپنی خیریت کے بارے میں پیغام ریکارڈ کیا اور ریڈیو کی جاری نشریات میں ہر گھنٹے بعد نشر کرتے رہے۔

اس افواہ کے بعد حکیم محمد سعید مطب کرنے جس شہر بھی گئے لوگ بے اختیار ان سے لپٹ گئے۔ حکیم محمد سعید کی آنکھوں سے اس وقت آنسو رواں ہو جاتے اور ان کا دل فرطِ مسرت سے بھر آیا۔ وہ خود کو خوش قسمت انسان تصور کر رہے تھے کہ لوگ ان سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ اس افواہ پر ان کا تبصرہ تھا۔

"یہ افواہ دراصل پاکستان میں میری عوامی مقبولیت کا ایک جائزہ تھا۔ ان افواہ گروں کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ افواہ بجلی کی لہروں کی طرح پاکستان کے کونے کونے تک پہنچ جائے گی۔ خود مجھے بھی یہ اندازہ نہ تھا۔ اب ان افواہ سازوں کو میرے قتل کے لیے زیادہ غور کرنا پڑے گا۔"

ایک بار حکیم محمد سعید نے چند غیر ملکی حضرات کے اعزاز میں ایک بڑے ہوٹل میں دعوت کا اہتمام کیا۔ کفایت شعاری کے خیال کے پیشِ نظر فیصلہ یہ کیا گیا کہ ہمدرد کے کارکنان اس ہوٹل میں کھانا نہیں کھائیں گے۔ ان کے لیے الگ انتظام کیا گیا تھا۔ ڈائریکٹر انفارمیشن سید رحمٰن علی کو یہ بات ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنے ہم خیال ساتھیوں سے کہا کہ وہ کھانا ہی نہ کھائیں۔ جب حکیم محمد سعید کو یہ اطلاع ملی تو وہ مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ کارکنان کے قریب آئے۔ سید رحمٰن علی

سے مخاطب ہو کر کہا "آج بھوک لگ رہی ہے۔ بہتر ہے کہ کھانا ابھی اور اسی ہوٹل میں کھا لیا جائے۔"

رحمٰن علی نے حیرت کے انداز میں انہیں دیکھا اور بڑی مشکل سے ایک جملہ کہا "مگر حکیم صاحب......! آپ تو دوپہر کا کھانا کھاتے ہی نہیں......!"

"کبھی کبھار احباب کے ساتھ کھا لینے میں لطف آتا ہے۔" ان کا جواب تھا۔ اس کے ساتھ ہی کھانا بھی لگ گیا اور پھر سب نے ساتھ ہی اس ہوٹل میں کھانا کھایا۔ خود حکیم محمد سعید نے آم کی چند قاشیں ہی کھائیں اور وہ اپنے ساتھیوں کو کھانا دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ بعد میں جب ساتھیوں کو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو وہ بڑے شرمندہ ہوئے۔ حکیم محمد سعید نے ثابت کر دیا کہ جب احباب کی دل شکنی ہو رہی ہو تو اصولوں کو قربان کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ایک واقعہ پشاور کے مطب میں پیش آیا۔ ایک معمر خاتون اپنی باری پر ان کے مطب میں آئی۔ اس کے پاؤں میں شدید تکلیف تھی۔ طبیب نے مریض کے گھریلو حالات بھی معلوم کیے تاکہ درد کے اصل اسباب تک پہنچا جا سکے۔ مریضہ نے بتایا کہ وہ بیوہ ہے اور اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اسے سلائی مشین پر بیٹھ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ جسے پاؤں سے چلایا جاتا ہے۔ مرض کی نوعیت کے پیشِ نظر حکیم محمد سعید نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ سلائی مشین میں موٹر لگوا لیں۔

موٹر کا سن کر مریضہ نے کہا "اتنے پیسے کہاں سے لاؤں کہ موٹر لگوا سکوں۔" حکیم محمد سعید نے دل جوئی کے انداز میں اس سے گھر کا پتا معلوم کیا۔ ان کے مخصوص اشارے پر ان کے معاون یہ پتا لکھ رہے تھے۔ جب وہ خاتون مطب سے باہر نکلیں تو انہوں نے حکم دیا کہ "رات ہونے سے قبل ان خاتون کی سلائی مشین میں موٹر لگ جانی چاہیے۔"

حکیم محمد سعید ایک انقلابی انسان تھے۔ قتل کی افواہ جیسے منفی پروپیگنڈے سے ان کے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ پاکستان کی خدمت کرنے کو اپنا شعار بنایا۔ وہ پاکستان میں موجود سماج دشمن عناصر کے خلاف سینہ تان کر ڈٹ گئے۔ اب تقریر کے ساتھ ساتھ انہوں نے تحریر کی رفتار بھی تیز کر دی۔ ایک بار انہوں نے اپنے ساتھی رفیع الزماں زبیری سے کہا کہ مجھے بہت کام کرنا ہے اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی نیند کا ایک گھنٹا کم

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کروں۔ زبیری صاحب فکر مند ہوئے اور کہا" حکیم صاحب آپ پہلے ہی نیند کم لے رہے ہیں۔ کہیں اس کے مضر اثرات آپ کی صحت پر نہ پڑیں۔"

انہوں نے جواب دیا" اللہ مالک ہے"۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ راشد بھی ان کے اس فیصلے سے پریشان ہوگیں۔

حکیم محمد سعید ارسطو کے اس قول کی انسانی نقل تھے کہ" کسی بھی پیشے میں کامیابی اور مہارت کے لیے تین چیزیں لازمی ہیں۔ فطرت (قدرتی صلاحیتیں اور عادات) مطالعہ اور پھر اس پر عمل۔"

وہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے پاکستان اور اسلام کو نقصان پہنچانے والوں کے خلاف سرگرم عمل ہوگئے۔ قومی اخبارات کے ساتھ ہمدرد روزہ آواز اخلاق میں جس کے وہ خود مدیر تھے ان کے مضامین تواتر کے ساتھ شائع ہونے لگے۔

17 اکتوبر 1998ء کی صبح کا آغاز ہونے والا تھا۔ وہ روزہ کی نیت کر کے نماز فجر کی ادائگی کے بعد اپنی گاڑی میں آرام باغ مطب کی جانب روانہ ہوئے۔ ہر ہفتہ اور اتوار کو آرام باغ میں مطب کرنا ان کا معمول تھا۔ آج بھی مطب میں مریضوں کا جم غفیر تھا جو اپنے مسیحا کی آمد کے منتظر تھے۔ گاڑی مطب کے پاس رکی۔ گاڑی کا

حوالہ جات!

1 حیات۔ سعید از ستار طاہر۔
2۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ' لاہور۔ جنوری 1999ء۔
3۔ وہ بھی کیا دن تھے از مسعود احمد برکاتی۔
4۔ سہ ماہی انشاء' حیدر آباد۔
5۔ بچوں کے حکیم محمد سعید۔
6۔ سال گرہ از حکیم محمد سعید۔
7۔ حکیم محمد سعید۔ یادیں اور باتیں مرتبہ رفیع الزماں زبیری۔
8۔ اردو ڈائجسٹ مارچ 2002ء۔
9۔ سورج میرے پیچھے از ضمیر جعفری۔
10۔ کتاب سعید از ڈاکٹر ظہور احمد اعوان۔
11۔ "دردن روس۔ دیدو شنید" از حکیم محمد سعید۔
12۔ زیرو پوائنٹ از جاوید چوہدری۔
13۔ خبرنامہ ہمدرد۔ مختلف شمارے۔
14۔ روزنامہ جنگ کراچی کی متعدد اشاعتیں۔
15 روزنامہ امت کراچی کی متعدد اشاعتیں۔
16۔ ذاتی ملاقات از رفیع الزماں زبیری۔

دروازہ کھولنے کے لیے ایک کارکن ولی خان آگے بڑھا۔ حکیم محمد سعید گاڑی سے اترے اور اپنی ٹوپی کارکن کے حوالے کرتے ہوئے آگے بڑھنے کے لیے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ تین جانب سے ان پر فائرنگ ہوئی اور وہ اپنے کارکن اور معاون حکیم عبدالقادر قریشی کے ساتھ ہی زمین پر گر پڑے۔ ان کی صاف شفاف سفید شیروانی خون میں نہا گئی۔ حکیم محمد سعید کی روح اسی وقت قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے کارکن بھی ان پر قربان ہو کر موت کی آغوش میں جا سوئے تھے۔

ادھر مریضوں کے لیے یہ منظر انتہائی صدمہ اور دکھ کا باعث بنا اور کیوں نہ ہوتا ان کا مسیحا ان کا ہمدرد آج ان کے سامنے خون میں نہا گیا تھا۔ حکیم محمد سعید کی شہادت نے ملکی اور بین الاقوامی طور پر سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کوئی معمولی موت نہیں تھی بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کی موت تھی۔ انہوں نے تشکیل پاکستان میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ان کی آخری خواہش تھی۔

"میں ایسے حال میں فرشتۂ اجل کا استقبال کرنا چاہتا ہوں کہ میری نگاہوں کے سامنے ہمدرد اسکول اور الفرقان میں پانچ ہزار بچے تعلیم پا رہے ہوں۔ ہمدرد یونیورسٹی امتیازات کے ساتھ ہزارہا جوانوں کو انسان کامل بنا رہی ہو۔ یہ جوان دنیا بھر میں پھیل کر آواز حق بلند کرنے کی تیاری میں کر رہے ہوں۔"

اسی دن شام کو انہیں ان کی متعین کردہ جگہ پر مدینۃ الحکمہ میں دفن کر دیا گیا۔

لو وصل کی ساعت آ پہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا در باز کیا

(تحریر: غلام حسین میمن)

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

مسعود احمد برکاتی

نصف صدی سے بھی زائد زندگی بچوں کے ادب کی آب یاری پر صرف کرنے والے کی مختصر مگر لازوال کتھا، جنھوں نے پاکستان کے ایک بچوں کے مقبول ماہ نامے کی طویل ترین ادارت کا ناقابلِ تسخیر ریکارڈ بنا ڈالا۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والا رسالہ ماہ نامہ ہمدرد نونہال اب تیسری نسل پڑھ رہی ہے۔

ماہ نامہ ہمدرد نونہال کے مدیر اعلیٰ مسعود احمد برکاتی کی سوانح حیات۔

میرا خاندانی نام سید مسعود احمد برکاتی اور قلمی نام مسعود احمد برکاتی ہے۔

میری تاریخ پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۳۳ء اور جائے پیدائش ٹونک راجستھان، بھارت ہے۔

میں نے چودہ برس کی عمر سے ۱۹۴۷ء سے صحافت کا آغاز کیا اور اپنے دادا علامہ حکیم سید برکات احمد کے نام پر "البرکات" کے نام سے ایک قلمی رسالہ نکالا۔

۱۳ سال کی عمر سے مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ میرے دادا علامہ حکیم سید برکات اپنے دور کی ممتاز اور محترم شخصیت تھے۔ والد مولانا حکیم سید محمد احمد عالم، مصنف، فلسفی اور طبیب تھے۔

جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میں ڈیڑھ برس کا تھا۔ بچپن میں اس سانحے کا احساس نہیں ہوا، کیوں کہ گھر کے حالات بہت اچھے تھے۔ جاگیر کی وجہ سے ہر سہولت میسر تھی اور پھر باپ، دادا سے علمی اور روحانی عقیدت کی وجہ سے ہر شخص محبت اور عزت سے پیش آتا تھا۔

ہاں! اب والد یاد آتے ہیں کہ کاش والد کی شفقت اور علم سے ہم مستفید ہوئے ہوتے۔

باپ کے بعد دادی اور والدہ نے ہم بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔

ہمارے گھر کا ماحول خاصا پرسکون تھا، کیوں کہ علمی اور ادبی ماحول میں میں نے آنکھ کھولی۔

لکھنے پڑھنے کا ذوق اور کتاب و قلم سے محبت مجھے ورثے میں ملی ہے۔ اردو، فارسی، عربی اور طب کی تعلیم اپنے دادا کے قائم کردہ دار العلوم خلیلیہ (ٹونک) سے اور انگریزی زبان کی تعلیم گھر پر اتالیق سے حاصل کی۔ میری ایک بہن ہیں اور ہم تینوں بھائیوں میں، میں سب سے چھوٹا ہوں۔ جن میں بہن سیدہ فاطمہ اور بھائی مولانا اختر احمد برکاتی (مصنف) انتقال کر گئے۔

مجھے مطالعے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ گھر میں باپ، دادا کا کتب خانہ تھا، گھر میں اکثر باتیں بھی کتابوں، مصنفوں اور ادیبوں کی ہوتیں۔ دراصل مجھے کھیل کود کا زیادہ شوق نہیں تھا، میں شرمیلا اور کم گو تھا۔ میرے پورے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ میرے بڑے بھائی حکیم سید محمود احمد برکاتی صاحب الحمدللہ حیات ہیں۔ کراچی میں ان کا مقبول مطب ہے۔ انھوں نے کئی اہم علمی اور تحقیقی کتابیں تالیف کی ہیں۔

بچپن ہی سے اردو کے ادبی رسائل کے مضامین اور منٹو، کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانے بھی پڑھے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی مشکل تحریروں کا پرزور طرز بہت بھاتا تھا۔ ان کی کتابیں اکثر میں جھوم جھوم کر تقریر کے انداز میں پڑھتا تھا۔ اس میدان میں پہلے مولانا کی کتاب "تذکرہ" مطالعے میں آئی۔ پھر "غبار خاطر" کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، حامد حسن قادری کو بھی پڑھا۔ جدید مزاج کے ادیبوں میں احسن فاروقی اور محمد حسن عسکری کی تحریروں کا جستہ جستہ مطالعہ کیا۔ ان دنوں اخبارات بھی دل چسپی سے پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دہلی سے نکلنے والے اخبارات ٹونک پہنچتے پہنچتے شام ہو جاتی تھی۔ ہم ان کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔

میں نے دار العلوم خلیلیہ میں فارسی، عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اساتذہ میں ممتاز علما شامل تھے، جن سے میں نے براہ راست فیض حاصل کیا۔ انگریزی تعلیم کے لیے گھر پر استاد شیر خان صاحب آیا کرتے تھے۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں "البرکات" نامی قلمی رسالہ بھی میں نے نکالا، جو طبع نہیں ہوتا تھا اور بغیر چھپوائے کتابت کرا کر "سرکولیٹ" کیا جاتا تھا۔

"البرکات" کا محرک گھر کا علمی ماحول بنا۔ چوں کہ مالی رکاوٹیں نہیں تھیں، اس لیے کوئی دقت

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

پیش نہیں آئی۔ میں کتابی کیڑا ہونے کے باوجود میرا دل نصابی کتابوں میں کم ہی لگتا تھا۔ دراصل مجھے کورس کی کتابیں کم معیار کی لگتی تھیں۔

علمی، ادبی لحاظ سے تو میں مولانا ابوالکلام آزاد سے سب سے پہلے متاثر ہوا۔ ان کو بالکل نوعمری میں پڑھا۔ ان کے اخبار "الہلال" کی کئی جلدیں ہمارے گھر کے کتب خانے میں تھیں، پھر ہمارے گھر (حویلی کے بیرونی مردانے حصے میں) ایک طالب علم، مولوی ظفیر الدین رہتے تھے، ان کی صحبت میں یہ عقیدت کا رنگ اور چڑھا۔ باوجود اس کے کہ بہت سے الفاظ مولانا کے میری سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے، لیکن انہماک سے بار بار پڑھنے سے مجھے مولانا کی تحریروں کے پیرے کے پیرے زبانی یاد ہو گئے تھے۔ پھر اختر شیرانی صاحب سے بھی ملنا جلنا ہونے لگا۔ آزادی سے پہلے چند سال تک وہ ٹونک ہی میں رہے، ورنہ ان کی زندگی تو لاہور ہی میں گزری۔ بہرحال ہم نے انھیں ٹونک میں بہت قریب سے دیکھا، خالص انسان تھے اور صرف ایک چہرہ تھا۔ انھوں نے والد علامہ حکیم سید محمد احمد سے فارسی پڑھی تھی۔ ان پر میں ایک مختصر مضمون لکھ چکا ہوں۔ ایک اور عالم مولانا عبدالرحمن چشتی تھے، وہ دکن سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ٹونک میں میرے دادا سے پڑھنے آئے تھے، پھر وہیں ہمارے گھر ہی میں آخر تک رہے۔ بڑے عالم اور بہت کھرے آدمی تھے۔ شادی نہیں کی تھی۔ مطالعہ کتب اور درس و تدریس میں زندگی گزاری۔ دارالعلوم خلیلیہ کے صدر مدرس بھی رہے، کتابوں کی جلدیں عمدہ اور قیمتی بنواتے تھے اور سلیقے اور ترتیب سے رکھتے تھے۔ ان کا اثر غیر شعوری طور پر مجھ پر بھی پڑنا لازمی تھا۔

میرے چچا شفاء الملک مولانا حکیم سید ظہیر احمد کی شخصیت بھی میرے لیے بڑی پرکشش تھی۔ بہرحال دو تین نام اور گن لیجیے، پاکستانی ادیبوں میں مولانا صلاح الدین احمد سے بہت متاثر ہوا۔ ان سے دو بار ہی ملا۔ وہ ۱۹۶۴ء تک کراچی میں حکیم محمد سعید صاحب کے منعقد کردہ ایک سیمینار میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان کے ہر انداز سے اردو کی لگن، تڑپ اور جذباتی محبت ظاہر ہوتی تھی۔ ان کے چند خطوط اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔

ایک اور شخصیت حکیم نصیر الدین ندوی سے متاثر ہوں۔ ڈاکٹر سید اسلم (ماہر قلب) سے بھی متاثر ہوں۔ شہید حکیم محمد سعید سے بہت متاثر ہوں۔ وہ منفرد انسان تھے۔ ان کی زندگی بڑی

جناب مسعود احمد برکاتی کی زندگی کا سفر تصاویر کے آئینے میں

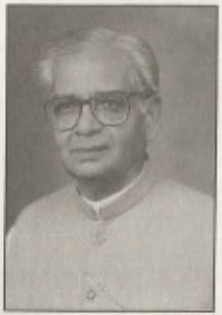

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

جناب مسعود احمد برکاتی اپنی 77ویں سالگرہ کے موقع پر ہمدرد نونہال کے دفتر واقع ناظم آباد میں جہاں انہوں نے زندگی کے 57 برس نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں گزار دیے

شہید پاکستان حکیم محمد سعید کے ہمراہ مسعود احمد برکاتی کی ایک یادگار تصویر

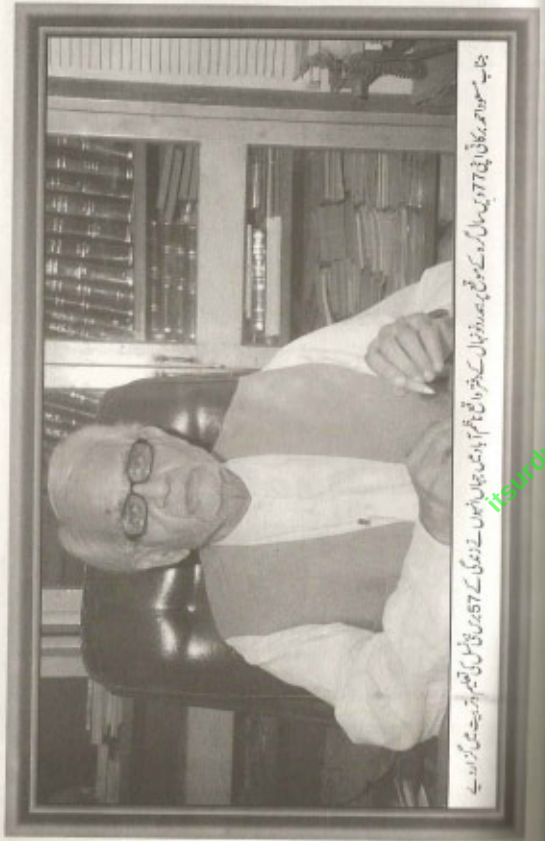

پروفیسر جمیل اختر، شان الحق حقی، ادا جعفری، علی حسن، حکیم محمد سعید، صبا لکھنوی، مسعود احمد برکاتی اور دیگر کا 21 مارچ 1984 کو لیا گیا ایک یادگار گروپ فوٹو

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

سبق آموز ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں والدہ سے پاکستان دیکھنے کی ضد کی اور پھر میں اکیلا ہی چلا آیا۔ ابتداً حیدرآباد میں اپنے چچا کے ہاں قیام کیا۔ چند دن تو سکون میں گزرے، لیکن پھر ہندوستان، پاکستان میں آمدورفت پر پابندیاں لگ گئیں، قوم کی ایک ملک سے دوسرے ملک منتقلی مشکل ہوگئی۔ وہ دور پریشانی کے عالم میں گزرا۔ زندہ رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ کبھی سوچا نہ تھا کہ کمانے کے لیے کچھ کرنا بھی پڑے گا، لیکن اب کوئی صورت نہیں تھی۔ ٹیوشن پڑھانی شروع کی، مجھے یاد ہے کہ پہلی کمائی تیئیس روپے مہینہ تھی۔ زندگی کا سفر جاری رکھنے کے لیے اس عرصے میں میں چھوٹی موٹی نوکریاں بھی کرتا رہا۔ پھر مجھے ایک سرکاری ادارے میں ساٹھ روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی، ٹیوشنز پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسی عرصے میں انجمن ترقی اردو کے رسالے "معاشیات" میں اشتراکیت جیسے دقیق موضوع پر میرے کئی مفصل مضامین شائع ہوئے۔ میں نے سوشلزم کو پوری طرح سمجھنے کے لیے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے پہلا مضمون "معاشیات" کے ایڈیٹر جناب محمد احمد سبزواری کو بھیجا۔ یہ شاید ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ حیدرآباد سندھ میں تھا۔ ایک ہفتے بعد سبزواری صاحب قبلہ کا خط آیا۔ انھیں مضمون بہت پسند آیا تھا۔ مزید لکھنے کی فرمائش کی اور لکھا کہ کراچی آئیں تو ضرور ملیں۔

کراچی پہنچنے کے بعد سبزواری صاحب کے توسط سے میری بابائے اردو سے بھی ملاقات ہوئی۔ پھر کراچی میں چند روز ہجت کی نعمت کے بغیر بھی گزرے۔ غرض یہ کہ میں نے اپنی زندگی آپ بنائی۔

آخر والدہ اور بھائی صاحب بھی ۱۹۵۲ء میں پاکستان آگئے۔ ہندستان میں جاگیر اور جائداد ضبط کرلی گئی تھی۔ ۱۹۵۲ء ہی میں، میں "ہمدرد" سے وابستہ ہوا اور گزشتہ ۶۰ سال سے میری وابستگی قائم ہے۔ (یہ آپ بیتی ۲۰۱۲ء میں لکھی گئی تھی)۔

جوانی میں دو تین بار میں نے مختلف اخبارات کی پیش کش قبول کرنی چاہی، لیکن شہید حکیم محمد سعید نے کہہ دیا کہ سب باتیں ٹھیک ہیں، بس جانے کی بات نہ کیا کرو، سو آج بھی میں ہمدرد ہی میں ہوں۔

مسعود احمد برکاتی ایک تقریب سے خطاب کررہے ہیں

محترمہ سعدیہ راشد صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان نے حج بیت اللہ سے واپسی کے موقع پر ڈاکٹر نوید اللظر کے اعزاز میں 7 مارچ 2003ء کو ہمدرد ہاؤس میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر محترمہ سعدیہ راشد، ڈاکٹر نوید اللظر، مسعود احمد برکاتی اور دیگر ڈائریکٹرز ہمدرد فاؤنڈیشن کے ہمراہ گروپ فوٹو

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات مارچ ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ بس! اسی وقت سے حکیم صاحب نے ہمدرد کا بنالیا اور میں اب بھی ہمدرد کا ہوں۔ حکیم صاحب کے بارے میں میرا ابتدائی تاثر ہی بہت مثبت تھا۔ اصل میں میرا تعارف حکیم فضل الرحمان صاحب نے کروایا تھا۔ وہ بہت فاضل طبیب اور حکیم محمد سعید صاحب کے استاد تھے۔ چوں کہ نوٹنکی کے تھے، اس لیے میرے خاندان کو جانتے تھے۔ میں کراچی آنے کے بعد ادبی اداروں میں خاصہ سرگرم رہا ہوں، تاہم کسی خاص گروپ سے کبھی وابستہ نہیں ہوا۔

۱۹۵۳ء میں "ہمدرد نونہال" جاری ہوا۔ لکھنے کے ساتھ ساتھ رسالہ مرتب کرنے کی ذمے داری بھی حکیم صاحب نے مجھے سونپی۔ ۱۹۶۷ء میں معاون مدیر سے مدیر ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں مدیر اعلا کا عہدہ سنبھالا اور تاحال اسی حیثیت سے مصروف خدمت ہوں۔ میں نے بچوں کے لیے بہت لکھا ہے۔ اردو کی تاریخ میں کوئی دوسرا ادیب اتنے عرصے تک مسلسل بچوں کے ادب سے وابستہ نہیں رہا اور نہ کوئی شخص بچوں کے رسالے کا مسلسل ۶۰ سال تک مدیر رہا۔ بچوں کے لیے میری تحریروں کی تعداد ہزاروں میں ہوگی، لیکن رسالے کو وقت پر شائع کرنے کے لیے مجھے بہت زیادہ وقت اور توانائی صرف کرنا پڑتی ہے، اس لیے میں اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں زیادہ شائع نہیں کر سکا اور یوں میری کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حال آنکہ ناشروں اور قارئین دونوں کی طلب ہے۔

مجھے حقیقی معنی میں علم و ادب کی اور نئی نسل کی خدمت کا موقع ملا۔ "ہمدرد نونہال" کے ذریعے ہم نے ہر شعبۂ زندگی کے لیے افراد تیار کیے ہیں، جن میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کے علاوہ تعلیم، تحقیق، دین، سائنس، قانون اور سیاست کے اہم نمائندے شامل ہیں۔ "ہمدرد نونہال" کے ساٹھ سال مکمل ہونا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے زندگی ضائع نہیں کی، بلکہ قوم کی تعمیر میں صرف کی، خصوصاً بچوں کے لیے کام کیا، یعنی آنے والی نسلوں کو کچھ دیا۔ مجھے شہید حکیم محمد سعید بہت یاد آتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی ذہنی ترقی اور ادبی تربیت کو پوری اہمیت دی۔ وہ ہمدرد نونہال کی ترقی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے بھی میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

وہ کہتے تھے "یہ تاریخ ساز کام ہے، کبھی اس سے بددل نہیں ہونا، یہ نسلوں کی آب یاری ہے۔"

۱۹۹۶ء میں اے پی این ایس کی جانب سے مجھے پاکستان کا سینئر ترین ایڈیٹر کا نشان سپاس پیش کیا گیا۔ میرے دل کو اطمینان ہوا کہ ادب و صحافت کی پُرخلوص خدمت کا صحافیوں اور ادیبوں کو احساس و اعتراف ہے۔ آج کل میں ماہ نامہ "ہمدرد صحت" کا ایگزیکٹو ایڈیٹر بھی ہوں۔ حکیم سعید کی صاحب زادی سعدیہ راشد اس کی مدیر اعلا ہیں۔

میں نے "ہمدرد" کے پرچم تلے ماہ نامے "یونیسکو کوریر" کا اردو ایڈیشن "پیامی" کے نام سے بھی نکالا۔ اس ماہ نامے میں مختلف موضوعات پر عالمی سطح کے ماہرین کے مضامین شامل ہوتے تھے، جن کا میں بھی بڑی ذمے داری اور توجہ سے اردو ترجمہ کیا کرتا تھا۔ ہمدرد نے چودہ سال تک یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے جاری رکھا۔ پھر حکومت نے ایک سرکاری جامعہ کو یہ ذمے داری سونپ دی، جو دو سال بھی یہ سلسلہ نہ چلا سکی۔

میں نے اپنے علم میں وسعت پیدا کرنے کے لیے روسی زبان بھی سیکھی۔ اس وقت سوویت یونین قائم تھا۔ کراچی میں "فرینڈ شپ ہاؤس" میں روسی زبان پر کلاسز ہوا کرتی تھیں۔ محترم ڈاکٹر شریف حسین پڑھاتے تھے۔ میں نے بھی داخلہ لے لیا اور روزانہ شام میں جا کر روسی سیکھنے لگا۔ صحافتی مصروفیات کے باعث سیاحت کا زیادہ وقت نہیں ملا، البتہ ہندستان کے علاوہ انگلستان، فرانس اور سعودی عرب جا چکا ہوں اور حج، عمرہ بھی کر چکا ہوں۔ ہندستان میں ہونے والے سیمینارز میں مقالات بھی پیش کیے ہیں۔ میں ملکی اور غیر ملکی کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت و صدارت اور مقالات بھی پیش کر چکا ہوں۔

میں نے اخبار جنگ کی فرمائش پر ۱۹۹۷ء میں بچوں کے ادب کا پچاس سالہ جائزہ مرتب کیا تھا۔ جو "جنگ" خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس میں، میں نے کافی محنت سے بچوں کے ادب اور ادیبوں کے کاموں پر تاریخی نظر ڈالی تھی اور بہت سی وہ باتیں بھی لکھ دی تھیں، جو میں ہی اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر لکھ سکتا تھا۔

میں نے خود بعض وقت سوچا کہ مجھے ادب کا یا لکھنے کا شوق کیوں ہوا؟ جواب میری سمجھ میں نہیں آیا، یعنی میرے ذہن میں کوئی واحد عامل (فیکٹر) نہیں آیا۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ ادب

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

وراثت میں ملا۔ گھر میں بلکہ تمام کنبے میں علم و ادب کی، کتابوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ میرے پردادا عالم اور حکیم، دادا بہت بڑے عالم، استاد، مصنف، حکیم، شاعر، میرے والد عالم، مصنف، حکیم تھے۔ بڑے بھائی حکیم محمود احمد برکاتی محقق، مصنف، حکیم، شاعر ہیں تو شاید کچھ غیر شعوری طور پر میں بھی اس میں شامل ہو گیا ہوں۔

مجھے بچوں کے لیے لکھنا پڑا اور لکھتا ہی رہا۔ دوسری زبانوں کا ادب اطفال بھی پڑھا اور کچھ کلاسیکی فکشن کے تراجم بھی کیے۔ بچوں کے لیے ایک سفرنامہ ''دو مسافر دو ملک'' شامل ہے۔ یہ بچوں کے لیے اردو میں پہلا سفرنامہ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے چند مشہور و مقبول کلاسیکی ناول انگریزی سے اردو میں منتقل کیے اور کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

میں لباس میں شیروانی کو ترجیح دیتا ہوں۔ عام طور سے سفید اور آسمانی رنگ کا چناؤ کرتا ہوں، معتدل موسم پسند ہے۔ میٹھی ڈشز شوق سے کھاتا ہوں۔ ستاروں پر یقین نہیں رکھتا۔ ویسے میرا برج ''اسد'' ہے۔ پسندیدہ کتاب ''سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' ہے۔ نثر نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد، ملا واحدی، اور شاعروں میں ''میر تقی میر'' کا مداح ہوں۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

حنیف سحر

برسوں پہلے قلم ہاتھ میں تھاما اور ایسا چلایا کہ آج تک بے تکان لکھ رہے ہیں۔ بچوں اور بڑوں کے بہت سے رسائل کی کمان بھی سنبھالی، جو اور جہاں لکھا، لوہا منوالیا۔ بچوں کی کہانیاں، ناولٹ اور بڑوں کے افسانوں اور کالم سے لے کر ٹی وی ڈراموں تک کا سفر طویل، لیکن کامرانیوں کے تمغوں سے مالا مال ہے۔ پھر قلم ہی ان کا ذریعہ معاش ٹھہرا۔ منی پاکستان کے ایک نابغہ روزگار قلم کار کا اپنی زندگی کے بارے میں دل چسپ انکشافات۔

سینئر صحافی، ڈرامہ و کالم نگار، بڑوں اور بچوں کے ادیب

اس سے پہلے بھی میں دو بار یہ بہت ہی غیر دل چسپ کام کر چکا ہوں، یعنی خود پر جو گزری وہ داستان لکھنا۔ پہلے بھی دونوں بار دو دوستوں کے کہنے پر دل پر جبر کر کے یہ ''کارنامہ'' انجام دیا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہے۔ محبوب الٰہی مخمور کو انکار کرنا میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ نیت شروع سے ہی یہ تھی کہ کہا ہے تو لکھوں گا بھی، لیکن وقت اور مصروفیات آڑے آتی رہیں اور اپنا وعدہ بروقت پورا نہیں کر سکا۔ جی کڑا کر کے اب کہہ دیتا ہوں۔۔۔ یوں سمجھئے.....

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

محبوب الٰہی مخمور میرا دوست ہے اور مجھ سے زیادہ وہ بچوں کا اور بچوں کے ادب کا دوست ہے۔ جس مستقل مزاجی اور خلوص نیت سے اس نے اپنی عمر کے بے شمار رنگین اور سنگین ایام اس شعبے کو دیے ہیں، اس کی تعریف اس کے دشمن بھی کریں (اگر دشمن ہوں)، ورنہ اس مرنجان مرنج انسان سے کون عقل کا دشمن دشمنی کر سکتا ہے۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ رسالہ ہے ''انوکھی کہانیاں'' جسے وہ مدت سے نکال رہا ہے۔ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں سے بڑے بڑے کام

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کر دالیتا ہے اور وہ تو بے اسم با مسمّٰی ہیں۔

میری دوستی اور جان پہچان تو محبوب الٰہی مخمور سے قریب 25 سال پر محیط ہے اور یہ دوستی ایک ایسا موقع آیا جب میرے لیے کسی حیرت کدے جیسی حیثیت اختیار کر گئی۔ مجھے ایک دوست کی زبانی یہ عجوبہ بات سننے کو ملی...... آپ بھی سنیے اور اس بے حد معصوم انسان کی مردم شناسی پر غریق تحیر ہو جائیے......

"میں نے بہت سے رسائل کی ادارت کا فریضہ انجام دیا ہے...... اُن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر میں ان کی تفصیل یہاں لکھوں گا تو یہ آپ بیتی کسی بھی طرح عمرو عیار کی زنبیل سے کم ثابت نہ ہوگی۔ جس میں سے ہر رنگ اور ہر نسل کا قصہ برآمد ہوتا چلا جائے گا اور وہ بھی سب کے سب ناختم...... چناں چہ ان سب رسائل میں سے بیش تر ایسے ہیں جو اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں، یعنی زیادہ تر بند ہو چکے ہیں۔ کسی کسی انسان کے پیروں میں چکر ہوتا ہے۔ جیسے مستنصر حسین تارڑ صاحب نے اتنے سفر نامے لکھے ہیں کہ ان کے پاؤں میں چکر بھی چھوٹا پڑ جاتا ہے ہم وہ صاحب کمال ہیں، جو لکھا پتھر پہ لکیر کی طرح مستند اور قابل اعتنا لکھا۔ میں کیا میری اوقات کیا ہے۔ ان رسائل کی قسمت کہ یہ کسی بھی وجہ سے بند ہوتے رہے اور ان کے بند ہو جانے کی وجہ سے مجھے کچھ لوگ منحوس یا سبز قدم وغیرہ سمجھنے لگے ہوں گے...... انھی سمجھداروں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ میں ایک ایسا شاطر اور لٹیرا قسم کا انسان ہوں (پتا نہیں لٹیروں کو انسان کہنا چاہیے یا نہیں؟) جس کی ریشہ دوانیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے متذکرہ رسائل نکالنے والے ادارے تباہ ہو جاتے ہیں اور ان میں اپنی اشاعت آگے جاری رکھنے کی سکت باقی نہیں رہتی...... چناں چہ بند ہو جاتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں...... اسی قسم کی ایک الزام تراشی کوئی صاحب کسی محفل میں محبوب الٰہی مخمور کے سامنے بھی کر رہے تھے...... میں وہاں موجود نہیں تھا۔

سخن دراز کی بات سن کر محبوب الٰہی مخمور نے اپنی مخصوص ہنسی اور انداز سے انھیں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آپ حنیف کو بالکل نہیں جانتے اور میں اسے جتنا جانتا ہوں اسی کی بنیاد پر کہتا ہوں۔ وہ ایسا انسان ہے جسے دنیا میں کوئی بے وقوف بھی چاہے تو لوٹ سکتا ہے، مگر وہ خود کسی کو لوٹنا یا دھوکا دینا چاہے تو یقین کیجیے...... اس میں ایسی ایک بھی صلاحیت موجود نہیں ہے!"

بتانے والے نے مجھے بتایا اور میں ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ اپنا قد تو مجھے کبھی بڑا نہیں معلوم ہوا، مگر محبوب الٰہی مخمور کا قد میری نظروں میں یکا یک آسمان کو چھوتا ہوا محسوس ہوا، اس لیے نہیں کہ اس نے میری شرافت کی گواہی دی تھی یا میری ایمان داری کو سند فراہم کر دی تھی، بلکہ اس لیے کہ فی زمانہ کسی کے کردار کی اس طرح پیٹھ پیچھے حفاظت کرنا، یہ کسی معمولی انسان کا کام نہیں ہے، ورنہ پیٹھ پیچھے تو صرف غیبت کا ڈنکا بجایا کرتا ہے۔ بھلا ایسی گواہی کون دے سکتا ہے۔ یہ بڑی جرات کا کام ہے اور محبوب الٰہی مخمور کی جرات کو سو سلام۔

وہ حقیقت میں قابل توصیف ہے اور حیرت در حیرت اس لیے بھی کہ جب میں ٹوٹ بٹوٹ رسالے کا ایڈیٹر تھا تو بہت سے لکھنے والوں کی طرح محبوب الٰہی مخمور بھی میرے پاس اپنی کہانیاں شائع کرانے کے لیے لایا کرتا تھا۔ میں اس کی کہانیوں کو چاہتے ہوئے بھی شائع نہیں کر پاتا تھا کہ میرے پاس کہانیاں بہت زیادہ ہوا کرتیں اور صفحات کم۔ کہانیاں اتنی زیادہ ہوتیں کہ میں اگر چاہتا تو بھی تو اپنی پسند سے ان سب کہانیوں کو آگے پیچھے نہیں کر سکتا تھا اور اس آگے پیچھے کی باری میں محبوب الٰہی مخمور کا نمبر ہمیشہ بہت پیچھے...... بہت ہی پیچھے رہ جایا کرتا تھا۔ چناں چہ مجھ سے جن لکھنے والوں کو لاتعداد شکایات تھیں، ان کی اول صف میں محبوب کا نام ہونا چاہیے...... پر مجھے یاد نہیں وہ کس صف میں شامل تھا، البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے سامنے سرخرو ہونے کا ایک موقع بہرحال ضرور دیا اور وہ یہ کہ میں نے اس کی چند بہترین کہانیوں میں سے ایک "امن مشن" ٹوٹ بٹوٹ میں چھاپی تھی۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بڑی لمبی اور بے تکان داستان ہے یہ۔

لیجیے...... اب کچھ اپنے بارے میں کہتا ہوں۔

بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، مگر کتنے خواب تھے جو ادھورے رہ گئے۔ ماتم ہے کہ ختم ہوتا نہیں۔ ہر گام پر خواب بنتا ہوں اور ہر رہ گزر پہ قزاق استادہ ہیں، جن کا کام ہے کہ لوٹا کریں۔ خواب نشینوں کی نگر آبادیاں۔ سو لٹتے رہے وہ سب خواب سراب۔ ایسے خوابوں کے کارواں جن کے میر کارواں نہ تھے کوئی۔

والد کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میرا ڈاکٹر بننے کا خواب ادھورا رہا۔ وہ مجھے میٹرک کے زمانوں میں ہی بے آسرا چھوڑ کے دنیا سے چلے گئے، ورنہ میری اس خواہش کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

حنیف سحر بچوں و بڑوں کے معروف ادیب، کالم نگار، ڈرامہ نگار، سینئر صحافی

جب میں نے نویں جماعت کا امتحان آرٹس کے مضمون میں دے دیا تو ایک دن اپنے ہی میرے والد جانے کس موڈ میں تھے۔ مجھ سے بولے۔ "تجھے جتنا پڑھنا ہے پڑھ۔۔۔۔ میں پڑھاؤں گا۔"

اور یوں میں نے اپنے علاقے قصبہ کالونی کے ابراہیم علی بھائی اسکول میں پھر سے سائنس کے شعبے میں داخلہ لے لیا۔ مجھے یاد نہیں انھوں نے یہ داخلہ مجھے ساتویں جماعت میں دیا تھا یا آٹھویں میں، کیوں کہ اسکول والوں کا خیال تھا کہ مجھے ایک دو سال ان کے اسکول میں پڑھنا ہوگا پھر وہ مجھے نویں جماعت سے سائنس میں داخل ہونے کی اجازت دیں گے۔ وارفتگی شوق کہ میں نے ان کی یہ شرط مان لی، لیکن پھر یوں ہوا کہ خدا کے بھیجے ہوئے اجل کے فرشتے کو میری یہ جرات ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ چند ہی مہینے بعد میرے والد کی روح جسم سے کھینچ کر اگلے جہان لے گیا۔ وہ گئے اور ساتھ میرے خواب بھی لے گئے۔ میں نے پھر سے وہی آرٹس کا مضمون جا پکڑا اور یوں اسی شعبے کے ذریعے میری تعلیم مکمل ہوئی۔

پھر جب میں نے صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تو مہناز باجی سے پوچھا کہ کیا مجھے اس شعبے میں آنا چاہیے۔ ان کا جواب مجھے آج بھی یاد ہے۔ انھوں نے کہا بہت اذیت ناک شعبہ ہے اور معاشی تنگ دستی سے مالا مال بھی ہے۔ آج یہی شعبہ یوں سمجھیں کہ سب سے زیادہ زرخیز ہے کوئی ڈاکٹر ہو یا انجینئر اس شعبے میں آنے کو بے چین اور تیار ہے۔ ہر قسم کی مساعی کے بعد اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا چاہتا ہے بہت سے ایسے لوگ تو بنا چکے ہیں جن کا ماس کمیونی کیشن سے کوئی تعلق نہیں ہے، مگر یہ تب ہوا جب اس شعبے کی ساری اذیت مجھ جیسوں نے جھیل کے اپنی زندگی برباد کرلی۔ اب کچھ بوڑھے باقی بچے ہیں، جو اس عمر میں خوش حالی کے مزے لوٹ رہے ہیں، ورنہ آنے والی نسل کو سب کچھ خوب لہلہاتا ہوا ہی ملا ہے۔ لیکن میرے جیسوں اور مجھ سے آگے والوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اخروٹ تب کھانے کو ملا جب منہ میں دانت نقلی ہیں۔ میں نے مہناز باجی کے ڈراوے کے باوجود اس شعبے کو اپنایا اور مجھے یہاں سے کبھی وہ خوش حالی نصیب نہیں ہوئی، جو آج اس شعبے کے بیش تر لوگوں کا مقدر ہے۔

کہتے ہیں زیادہ تر ایسے لوگ دنیا کے حصول میں کامیاب ہوتے ہیں جو غلط کو صحیح کہنے کی بے دھڑک صلاحیت رکھتے ہوں اور جنھیں اپنے ضمیر کا ٹھکانہ معلوم نہ ہو۔ برعکس اس کے کہ جن کا ضمیر ہر

itsurdu.blogspot.com

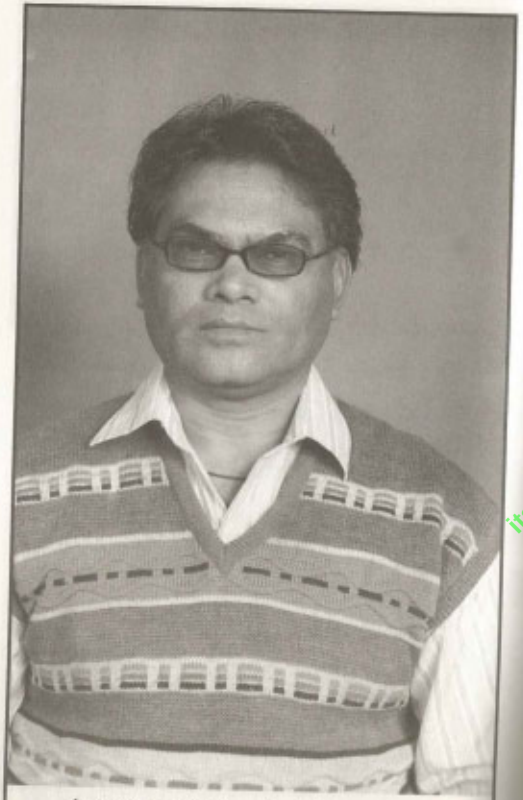

itsurdu.blogspot.com

آج ٹی وی کے ایک ڈرامے کے سیٹ پر عدیل رزاق (اس ڈرامے میں عدیل نے اداکاری بھی کی)
محمد خرم (ہدایت کار) حنیف سحر اور دو اداکار خواتین

انڈس چینل کے ڈرامے اولاد کے سیٹ پر سونیا شیخ، بدر خلیل، جلی کا مدار اور حنیف سحر

محمود شام صاحب ٹوٹ پھوٹ کے روح رواں اور میرے لیے بہت زیادہ محترم ہستی۔

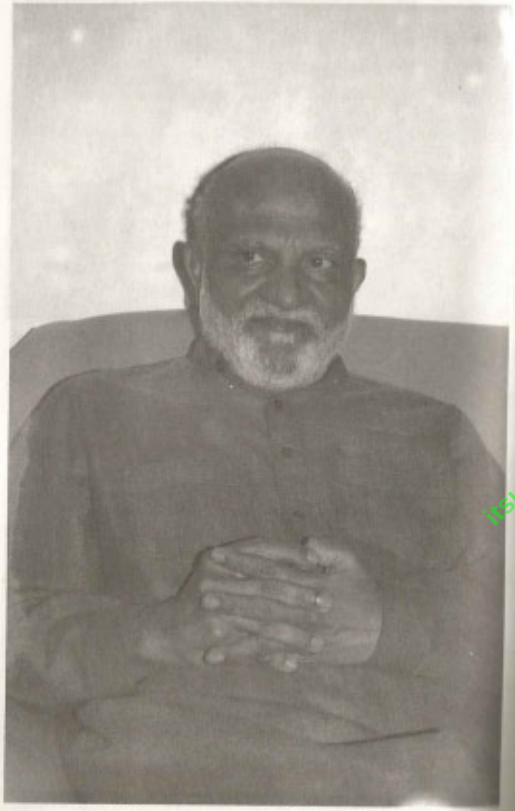

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محبوب الٰہی مخمور، سید خالد محمود، حنیف سحر اور سید ذاکت علی ایکشن کمیٹی کے اجلاس میں گروپ فوٹو۔

مہناز رحمن ۔ معروف صحافی اور سوشل ورکر میری روحانی استاد، بہن اور ہمیشہ میری مددگار

ماضی کی ایک یادگار تصویر۔ پاکستان چلڈرن میگزین ایکشن کمیٹی کے اجلاس سے محبوب الٰہی خطاب کر رہے ہیں ساتھ میں حنیف سحر بھی موجود ہیں

وقت چوکنے چوکی دار کی طرح ''جاگتے رہو'' کہتا رہتا ہے۔ وہ یہاں بھی نامرادی رہتے ہیں ۔۔۔جو میں رہا۔۔۔ اور کبھی نہیں جان سکا کہ دنیا کیسے کمائی جاتی ہے۔

کہتے ہیں انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ اس کی معصومیت ہوتی ہے اور جو اسے بیچنے میں کامیاب رہے دولت و ثروت اس کے گھر کی لونڈی بن جاتی ہے اور جنھیں اسے بیچنے کا ہنر نہ آتا ہو وہ ساری زندگی عسرت میں گزار کے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ دولت کی فراوانی اور افلاس کی طغیانی دونوں ہی حالتوں میں انسانیت کا دم نکل جاتا ہے۔

جن دنوں میں بچوں کی کہانیاں لکھا کرتا تھا، انھی زمانوں میں حریت اخبار کے بچوں کے صفحے پر میری ایک کہانی شائع ہوئی تھی جس کا عنوان ''ڈاکٹر'' تھا۔ یہ میری اسی ادھوری خواہش کے نتیجے میں میرے قلم سے تخلیق ہونے والی تحریر تھی، جس میں میں نے صحافی کو سماج کا مسیحا یعنی ڈاکٹر بتایا تھا۔ یوں کہیے میں نے طب کے شعبے سے مایوسی کے بعد۔۔۔۔ سماج کو اپنی مسیحائی کے لیے چن لیا تھا۔

یاد آیا اس کہانی کا ایک قصہ بھی ہے۔ ساتھ ہی سنا دیتا ہوں ورنہ بھول جاؤں گا۔ شمع زیدی حریت کے صفحے کی انچارج تھیں۔ یہ خاتون بھی میری سگی بہنوں جیسی ہیں اور آج بھی میں ان کی وہ میری زندگی کا بہت اہم حصہ ہیں، تاہم جس عہد میں یہ کہانی شائع ہوئی، وہ مجھے بچوں کے ایک لکھاری سے زیادہ نہ جانتی تھیں اور نہ ہی میرا اُن کا تعلق ایسے مخلصانہ جذبوں سے مزین تھا، جو بعد میں بنتا چلا گیا۔

قصہ یہ ہے کہ شمع زیدی نے اس کہانی کی پیشانی پر یہ سطر لکھوا دی کہ ''اس کہانی کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اسے حنیف سحر نے لکھا ہے'' ہر چند کہ یہ ان کی ذرہ نوازی ہی تھی، لیکن اس وقت پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس خوشی کی اتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ ہوا یوں کہ اس سطر نے کئی لکھنے والے بچوں کے ادیبوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ ان میں حیدرآباد کے ایک ادیب مسیح جمن اکبرآبادی بھی تھے، جنھوں نے اس سطر کے خلاف کم سے کم 10 صفحات پر مشتمل ایک رنگین اور سنگین خط براہِ راست ایڈیٹر کو لکھ مارا۔ کہانی کی طوالت سے کم پانچ گنا زیادہ طویل خط تھا۔ اس خط میں اس بات کا بڑا گرجتا برستا اظہار کیا گیا کہ شمع

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

زیدی صاحب نے حنیف سحر کو غلط طور پر نوازا ہے، ورنہ وہ اس قابل نہیں ہیں۔ ایڈیٹر نے شمع زیدی کو طلب کر لیا اور اس خط کی وضاحت کرنے کو کہا۔ شمع نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ انھوں نے جواب میں ایڈیٹر صاحب سے صرف اتنا کہا تھا آپ کہانی پڑھ کے دیکھ لیں۔ اگر میری بات غلط محسوس ہو تو میں اس کی تردید لگا دوں گی۔ غالباً ایڈیٹر صاحب نے کہانی پڑھے بغیر ہی خط چمن کو پرزے پرزے کر کے شمع کے حوالے کر دیا یا ان سے کہا کہ وہ اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں اور اپنا کام جاری رکھیں۔

میرے خاندان کا تعلق انڈیا کی ریاست جے پور سے ہے اور ہم راجپوت چوہان ہیں۔ میرا شناختی کارڈ والا نام محمد حنیف چوہان ہے۔ جب بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا تو ابتدا میں کچھ نظمیں بھی لکھیں۔ اسی وجہ سے میرا نام حنیف سحر ہو گیا۔۔۔ ''سحر'' میرا تخلص ہے۔ کالج کے زمانوں میں باقاعدہ شاعری بھی کی تو یہ تخلص جیسے نام کا مستقل حصہ بن گیا اور اب یہ تخلص اس وقت بہت تکلیف دیتا ہے۔ جب کسی ادارے سے مجھے حنیف سحر کے نام کا کراس چیک ملتا ہے، کیوں کہ بینک اکاؤنٹ تو محمد حنیف چوہان کے نام پر ہے۔۔۔۔ اور یوں بھی اب میں شاعری نہیں کرتا۔ بہت پہلے ہی چھوڑ چکا ہوں۔ بس بار خدا مت اٹھائے پھرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری میری عادت کبھی نہیں بنی، ورنہ شاید چھٹتی نہیں یہ کافر لگی ہوئی۔ نوجوانی اور لڑکپن میں دوسرے عظیم شاعروں کو نہیں پڑھا تھا تو سمجھا کہ ہم بھی اس میدان کارزار میں کافی فتوحات کے جھنڈے گاڑیں گے، لیکن جب بہت سے عظیم شاعروں کو پڑھا، جن میں میر تقی میر، مرزا اسد اللہ خاں غالب، حضرت علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، میراجی، سردار جعفری، کیفی اعظمی، احمد فراز اور بھی بے شمار ہیں۔ ان سب کو پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ جو میں شاعری کرتا ہوں وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسے شاعری کہا جا سکے، اس لیے چھوڑ دی۔ نثر میں بھی بہت بڑے اور عظیم لکھنے والوں کو پڑھا، جن میں قراۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، عبداللہ حسین، کرشن چندر، منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، جمیلہ ہاشمی، شوکت صدیقی، رجب علی بیگ سرور، ڈپٹی نذیر احمد اور بھی بے شمار ہیں۔ نثر بھی سب کی ہی مجھ سے ہزار تو کیا لاکھوں درجے بہتر تھی، لیکن نثر چھوڑ دینے کا مطلب ہوتا کہ میں جینا ہی

چھوڑ دوں، اس لیے نثر لکھتا رہا۔ میری ذہنی اور ادبی تربیت قراۃ العین حیدر کے ناولوں سے ہوئی۔۔ نویں جماعت میں ہی تھا، جب میں نے اردو ادب کا سب سے اہم ناول آگ کا دریا پڑھ لیا تھا۔ اس وقت سمجھ میں تو نہیں آیا تھا، مگر اس ناول نے میرے ذہن و دل پر ایسے اثرات مرتسم کیے کہ جو آج بھی مجھے اپنی روح کے اندر تک اُترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، جیسے قطرہ قطرہ..... کوئی پیاس ہے جو بجھ رہی ہے اور شاید کبھی نہ بجھے۔

غیر ملکی ادیبوں کو بھی بڑی تعداد میں پڑھا۔ ان کے نام لکھنا مجھے زیب نہیں دیتا، کیوں کہ ان میں سے کوئی انگریزی ادیب ہے، کوئی روسی کوئی لبنانی، کوئی فرانسیسی کوئی جرمنی کا اور کوئی اٹلی کا اور کوئی چیکوسلواکیہ کا۔ میں نے ان سب کو زیادہ تر اردو میں پڑھا، اس لیے یہ کہنا کہ میں نے ان ادیبوں کو پڑھا ہے۔ سراسر اپنا قد بڑھانے والی بات ہے، کیوں کہ کسی بھی زبان کا ادب خواہ وہ کیسا ہی اچھا ترجمہ کیوں نہ کیا گیا ہو۔ اس کا ''اصل'' پڑھنے والے تک اس کی اسی زبان میں پہنچ سکتا ہے جس میں وہ تخلیق کیا گیا ہو۔ کوئی بھی دوسری زبان کسی بھی ادب کا حق مثل اصل ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

میں جب انٹر میں تھا تب ہی مجھے ایک میگزین خوشبو۔ میں باقاعدہ جاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ بہت کم عمر ے کی جاب تھی۔ کالج کے زمانوں میں ہم روپ میگزین میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ بعد میں اسی میگزین کا میں ایڈیٹر بھی بنا۔ یہ بڑوں کے کسی میگزین کی میری پہلی باقاعدہ جاب تھی۔ اس سے پہلے میں نے ٹوٹ بٹوٹ میں ملازمت کی۔ بچوں کے اس میگزین کا میں کچھ عرصے بعد ایڈیٹر کہلایا۔ اس سے قبل میری بچوں کی کہانیاں لکھنے کی۔ ابتدا امن اخبار کے بچوں کے صفحے سے ہو چکی تھی، یہاں مہناز رحمان بچوں کے صفحے کی انچارج تھیں۔ ان خاتون کے حسن اخلاق اور حوصلہ افزائی سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ چند ہی دنوں میں ان کا گرویدہ ہو گیا اور اسی خلوص کی وجہ سے میں جب بھی وقت ملتا ان کے دفتر چلا جاتا تھا۔ جہاں وہ کام کرتیں تو میں انھیں کام کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا، یوں سمجھئے لکھنے کے میدان میں یہ عظیم اور محترم خاتون میری پہلی استاد بھی ہیں اور بعد میں انھوں نے مجھے اس قدر شفقت اور شاگرد کی حیثیت سے اہمیت دی کہ وہ میرے لیے سگی بہنوں اور ماں جیسی حیثیت اختیار کر گئیں اور یہ رشتا اس قدر مضبوط و توانا ہوا کہ آج

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

بھی مہناز باجی مجھے اسی طرح ٹریٹ کرتی ہیں، جیسے میں وہ ہی میٹرک میں پڑھتا ہوا بچہ ہوں اور وہ میری بڑی بہن اور ماں جیسی کوئی ہستی ہیں۔ اتنا پیار اور خلوص میں نے کبھی کسی انسان میں نہیں دیکھا اور...... میں ان کی جس بات پر ہمیشہ حیران ہوتا ہوں وہ یہ کہ آپ کیسی ہی غلطی کر لیں ان کی ناراضی ایسی ہوتی ہے جیسے پانی کا بلبلہ...... مجھ سے تو وہ کبھی ناراض ہی نہیں ہوئیں۔ اب تو ہم دونوں میں ایک قدر اور مشترک ہے اور وہ ہے "صوفی ازم" ہم دونوں اس رستے کے مسافر ہیں اور یوں سمجھیے۔ اب دراصل ہم ایک قسم کے روحانی رشتے میں بھی باندھے جا چکے ہیں۔ آج کل مہناز باجی۔ عورت فاؤنڈیشن نامی پاکستان کی سب سے بڑی این جی او میں ریزیڈنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتی ہیں۔ بہت سے افسانے انھوں نے لکھے اور صحافت میں تو ایک زمانہ انھیں جانتا اور مانتا ہے۔ ایکسپریس اخبار کے میگزین ایڈیٹر احفاظ الرحمٰن ان کے شوہر ہیں اور احفاظ بھائی کی صحافیانہ خدمات سے کون کافر انکار کر سکتا ہے۔

امن اخبار کے بچوں کے صفحے پر جن دنوں ہم لکھا کرتے تھے۔ میں کافی تند مزاج اور سرکشی پر مائل تھا۔ انقلابیوں کی ایسی ہی عادت ہوا کرتی تھی۔ میری کئی تحریریں اس اخبار میں شائع ہوئیں کئی لوگوں کی ناراضگی کا سبب بنیں۔ "آزادی کا مفہوم" نامی ایک کہانی تو باقاعدہ سینسر کا شکار بھی ہوئی، جس پر امن اخبار کے مرحوم ایڈیٹر افضل صدیقی نے مجھے بٹھا کر سمجھایا کہ میاں اخبار کو نکلنے دیجئے، ورنہ جو کچھ ہم بین السطور کہہ رہے ہیں اس سے بھی جائیں گے۔ ایسی ہی ایک تحریر "جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی" بھی تھی۔ امن اخبار میں اور بھی بہت سے لکھنے والے لکھ رہے تھے، جن میں شبیر بیدار بھٹو، شہناز شورو، یاسمین حفیظ اور کئی نام ہیں، جو مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں ہیں، جن کے نام میں نہ لکھ پاؤں، اُن سے پیشگی معافی کا خواستگار ہوں۔

بچوں کی کہانیاں جب میں نے لکھنا شروع کیں تو قریب سب ہی اخبارات میں بچوں کے صفحات ہفتے میں ایک یا دو بار بڑی باقاعدگی سے شائع ہوا کرتے تھے اور بچوں کے رسائل کی بھی بہت بڑی تعداد ہر مہینے ہمارے ہاتھوں میں پہنچا کرتی تھی، جن میں تعلیم و تربیت، نونہال، ٹوٹ بٹوٹ، بچوں کا ڈائجسٹ، غنچہ، ہونہار، بچوں کا باغ، بچوں کی دنیا، بچوں کی باجی درمیان میں یا بعد میں جگنو بھی ایک رسالہ نکلا تھا...... ہو سکتا ہے کچھ رسائل مجھے یاد نہ رہے ہوں۔

جن اخبارات کے صفحات پر ہم لکھا کرتے تھے ان میں جنگ، مشرق، امن، جسارت، حریت، انقلاب، وغیرہ شامل تھے۔ حریت میں میں نے ایک سلسلے وار ناول بھی لکھا تھا، جس کے اختتام پر مصطفیٰ ہاشمی اور یاسمین حفیظ نے میرا انٹرویو کیا تھا، جو حریت ہی میں شائع ہوا تھا۔ جسارت کے بچوں کے صفحے پر بھی ایک سلسلے وار ناول شائع ہوا، جب کہ امن اخبار میں میرے دو عدد انٹرویوز کے سلسلے شائع ہوئے، ایک میرا بچپن اور دوسرا بڑے لوگوں کا بچپن۔ بہت سے رسائل میں سینکڑوں کہانیاں شائع ہوئیں، مگر ان سب کے نہ تو نام مجھے یاد ہیں اور نہ ہی یہ کہ کس اخبار اور رسالے میں کتنی کہانیاں شائع ہوئیں۔ رسائل میں سب سے زیادہ کہانیاں ٹوٹ بٹوٹ، بچوں کا ڈائجسٹ اور غنچہ میں شائع ہوئیں۔

جب میں انٹر میں تھا تب ہی مجھے ٹوٹ بٹوٹ میں ملازمت ملی۔ ان زمانوں میں ٹوٹ بٹوٹ شام صاحب کے گھر سے ہی نکلا کرتا تھا اور وہ خود جنگ اخبار میں کام کیا کرتے تھے۔ میں ان کے گھر واقع گلشن اقبال کی اوپری منزل میں بیٹھا کرتا تھا۔ آج بھی شام صاحب کا گھر وہ ہی ہے۔ ابتدائی کچھ مہینے شام صاحب کے گھر پر میں نے کام کیا۔ پھر ٹوٹ بٹوٹ کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر منتقل ہو گیا، جہاں سے ہفت روزہ معیار کا بھی پھر سے باقاعدہ آغاز ہوا۔ تب تک میں اس قابل ہو چکا تھا کہ مجھے ٹوٹ بٹوٹ کا ایڈیٹر کہا جا سکتا تھا۔ اس طرح میری صحافتی تربیت محمود شام صاحب کے زیرِ سایہ اور نگرانی میں ہوئی۔ اپنی زندگی میں میں جن لوگوں سے واقعی بہت متاثر ہوا اور ان کی بیش بہا صلاحیتوں پر حیران رہ گیا ان میں محمود شام پہلے انسان ہیں۔ وہ شاعر ہیں تو باکمال، صحافی ہیں تو بلند پایہ، دانش ور، اور فلاسفر کونسی خوبی ہے جو ان میں نہیں ہے۔ شام صاحب کی صلاحیتوں سے میں اتنا متاثر ہوں کہ انھیں دیکھتا ہوں تو ہمیشہ یہ خیال آتا ہے اس بہت عظیم آدمی کو ہمارے ملک اور معاشرے نے وہ مقام نہیں دیا جس کے یہ بجا طور پر مستحق تھے۔ ممکن ہے کبھی اس کی تلافی ہو سکے۔ ہر چند کہ وہ اب بھی اپنے ہم عصروں میں بلند قامت ہیں، لیکن میں انھیں اس سے بہت زیادہ...... اوجِ ثریا سے بھی آگے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا طرزِ نگارش ایسا ہے کہ جو لکھتے ہیں سیدھا دلوں میں اتر جاتا ہے۔ ان کی خوبیاں اتنی زیادہ ہیں کہ میرا قلم اور میری سوچ ان کا کوئی ایک سرا بھی پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہے، مثلاً ایک بات میں یہاں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

آپ کو بتاؤں۔۔ میں ان کے ادارے میں ملازم تھا وہ مجھے ہر مہینے تنخواہ دیا کرتے تھے، یعنی وہ میرے مالک تھے مگر اتنا مہذب، اتنا وضع دار، بامروت اور انسان کی قدر سمجھنے والا مالک شاید آپ نے پاکستان کے معاشرے میں کوئی دیکھا ہو۔ وہ میرے مالک تھے...... چاہتے تو چھوٹی سے چھوٹی بات پر اوروں کی طرح ڈانٹ ڈپٹ اور چیخم دھاڑ سے ہماری روحوں کو لرزا دیتے، جیسا کہ ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ پر شام صاحب نے بات غصے کی ہو یا ناراضی کی ہمیشہ مجھ سے لکھ کر بات کی وہ تعریف بھی اسی طرح کیا کرتے تھے اور یہ تو میری خواہش تھی۔ پر ڈانٹ ڈپٹ، غصے اور ناپسندیدگی کا اظہار...... وہ بھی لکھ کر۔ میں نے بے شمار اداروں میں ملازمت کی...... پر ایسا مہذب، وضع دار، متمدن اور انسانی بلندی سے زیادہ شریف النفس مالک کسی کو نہیں پایا۔ قریب ہر روز ہی ان کا لکھا ہوا ایک پرچا مجھے میرے ٹیبل پر ملا کرتا تھا، جس میں میری غلطیوں اور خوبیوں دونوں کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ زبانی کلامی اس بے پناہ انوکھی بات کا اظہار میں متعدد بار بہت سے موقعوں پر کر چکا ہوں، لیکن لکھ کر پہلی بار کر رہا ہوں۔

شام صاحب کے تین بیٹے ہیں ایک قاسم، ایک سلیم اور ایک نعیم۔ قاسم کے بڑے اور نعیم کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے میری ان سے کم ہی بات ہوتی تھی لیکن سلیم سے میری باقاعدہ دوستی تھی اور مجھے اب بھی یاد ہے، سلیم مجھ سے کہا کرتے تھے، (جب میں ایڈیٹر تھا) ''آپ اپنا سلسلے وار ناول کیوں نہیں شروع کرتے، کہانیاں بھی کم لکھتے ہیں کیوں؟''

میں انھیں کبھی یہ جواب نہ دے سکا کہ ٹوٹ بٹوٹ میں ہر مہینے اتنی زیادہ کہانیاں موصول ہوتی ہیں کہ اگر میں اپنا ناول یا کہانی بھی شائع کرنا شروع کر دوں تو کسی نہ کسی ایک یا دو لکھنے والوں کو جگہ نہیں مل سکے گی، اس لیے...... میں نہیں لکھتا تھا، تاکہ دوسرے لکھنے والوں کو جگہ مل سکے۔

اسی طرح ایک بار میں نے ایک کہانی ''قربانی'' صرف ایک صفحے کی لکھی اور ایک کہانی کا عنوان تھا۔ ''ریگن'' جو اس وقت امریکا کے صدر تھے، یہ دونوں کہانیاں ٹوٹ بٹوٹ میں شائع کیں۔ قربانی میں نے لکھی اور ریگن کسی اور کی لکھی ہوئی تھی۔ شام صاحب نے ان دونوں کہانیوں پر غور نہیں کیا۔ ایک میں ریگن کتے کا نام تھا اور دوسری میں قربانی کے موقع پر جانوروں کے دکھ کو محسوس کرایا گیا تھا۔ اس طرح عید قرباں کے نظریے کو بہت ہی دھیمے انداز میں ٹھیس پہنچ رہی

itsurdu.blogspot.com

تھی۔ شام صاحب نے مجھ سے کہا۔ ان کہانیوں پر چیف منسٹر ہاؤس سے اعتراض کیا گیا ہے۔ آپ بچوں کے رسالے میں ایہامات کیجیے۔ انھوں نے ٹھیک کہا تھا، ہمیں بچوں سے ان کا بچپن چھین لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بچوں کے رسالے میں ایسی ہی کہانیاں شائع کرنی چاہییں جو ان کی ذہنی سطح کے مطابق ہوں۔

شام صاحب کی یہ ایک اور خوبی تو انھیں انسان سے بھی بلند کر دیتی ہے اور میں ہمیشہ حیران رہ جاتا ہوں۔ بچوں کے لکھنے والے ادیبوں سے وہ اتنی زیادہ محبت اور شفقت کرتے ہیں کہ کسی بھی مسند جلیلہ پر متمکن ہوں، بچوں کے ادیبوں سے گریز پائی اختیار نہیں کرتے۔ بچوں کے لکھنے والوں کو ہمیشہ ایسی عزت اور اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی توصیف میں الفاظ معمولی اور حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یوں جانیے شام صاحب میرے روحانی استاد ہیں اور میں ان کا مرید ہوں۔ میں ان سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا جو کچھ مجھے اب آتا ہے وہ انھی سے سیکھا ہے، مگر ان کے پاس اتنا کچھ تھا کہ میرا دامن تنگ پڑ گیا اور میں ان کی گرد کو بھی نہیں چھو سکا۔ ایک انسان اتنی بے شمار خوبیوں کا مالک کیسے ہو سکتا ہے یہ راز میں آج بھی جان نہیں سکا اور میں ہی کیا شام صاحب نے اتنے پودے لگائے ہیں کہ کئی نسلیں انھی کی سینچی ہوئی لگتی ہیں۔ بچوں کے وہ سارے ادیب جو آج کسی بھی مقام پر اپنی شان دار صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان سب کو شام صاحب کی توجہ اور شفقت نے ہی اس قابل بنایا ہے کہ آج وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جسارت کر پائے ہیں۔

بے شمار نام ہیں جو میں یہاں لکھنا شروع کروں تو یہ فہرست اتنی طویل ہو سکتی ہے کہ میرے ہاتھ تھک جائیں گے پر فہرست مکمل نہ ہوگی۔ جن شخصیات کے لیے ''عظیم'' لکھا جانا چاہیے، شام صاحب ان کی اولین فہرست میں شامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بچوں کے رسائل میں وہ پہلے انسان ہیں، جنھوں نے نو آموز لکھنے والوں کی کہانیاں شائع کرنے کا ''رسک'' لیا، ورنہ ان زمانوں میں نئے لکھنے والوں کی کہانیاں کوئی بھی رسالہ اس فراوانی اور فیاضی سے شائع نہیں کرتا تھا، جیسے ٹوٹ بٹوٹ نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا۔ نونہال اور تعلیم و تربیت اور ہونہار بھی سب کے سب بڑے اور کہنہ مشق لکھنے والوں کی کہانیاں چھاپا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان

itsurdu.blogspot.com

سب ہی رسائل نے رسالے کے آخری صفحات نئے لکھنے والوں کے لیے مختص کیے ہوئے تھے۔ ان صفحات میں کوئی بھی چھپی ہوئی تحریر تخلیق سے زیادہ کوئی ایسا مراسلہ معلوم ہوتی تھی، جسے دیکھ کر دل کو خوشی اور اطمینان بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نونہال اور تعلیم و تربیت میں کبھی کوئی کہانی چھپنے کے لیے بھیجی ہی نہیں۔ اس کے برعکس ٹوٹ بٹوٹ میں نئے لکھنے والوں کو ایسے اہتمام اور باوقار آرائش و زیبائش سے شائع کیا جاتا تھا کہ ٹوٹ بٹوٹ میں لکھنے والے سب ہی ادیب خود کو بڑے ادیبوں جیسی شخصیت اور کروفر کی فضاء میں محسوس کرنے لگتے تھے اور یہ شام صاحب کا ہی کارنامہ ہے۔

میں نے سب سے زیادہ کہانیاں ٹوٹ بٹوٹ میں ہی لکھیں۔ اس کے بعد بچوں کا ڈائجسٹ اور غنچہ میں بھی میری بہت سی کہانیاں شائع ہوئیں۔ یہ بھی شام صاحب کا اعتماد اور فراخی ہے کہ انھوں نے ایک نوجوان کو کسی رسالے کا ایڈیٹر بنانے کی داغ بیل ڈالی۔ اس سے پہلے نوجوانوں کو ایسی ذمے داری کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کا آغاز مجھ سے ہوا اور میرے بعد ٹوٹ بٹوٹ کے ایڈیٹرز زیادہ تر نوجوان ہی رہے ہیں۔ مجھ سے قبل شہناز احمد (جو ٹوٹ بٹوٹ کی پہلی ایڈیٹر بھی تھیں) اس کے بعد شبانہ بشیر اور اس کے بعد میں اور میرے بعد بے شمار ہیں سب کے نام مجھے یاد نہیں ہیں۔ کہتے ہیں ٹوٹ بٹوٹ کی سب سے زیادہ اشاعت میرے ادارتی عہد میں رہی ہے ......واللہ عالم بالصواب!

میرے دور میں جن ادیبوں کے نام پردہ افق پر نمودار ہوئے، ان میں ظفر رفیق صدیقی، مصطفیٰ چاند (مصطفیٰ ہاشمی)، کاوش صدیقی، علی حسن ساجد، کاشان جعفری، محبوب الٰہی مخمور، نعمان ریاض، عابد رضا، سلمیٰ کنول قاسمی، عبدالعزیز عزمی، خواجہ وقار احمد، محمد جمال صدیقی، مرتضیٰ احسن، یاسمین حفیظ، مظہر مشتاق، محمد عادل منہاج، اقبال ناز، ابن شہباز خان اور حیدر آباد کے بھی کئی ادیب تھے، جن کے مجھے نام یاد نہیں آرہے۔ بڑے غضب کی کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ ایک غیر معمولی ادیب شاہد علی سحر بھی تھے، جن کا تعلق تو کراچی سے ہے، لیکن ان کی اس دریا دلی کا میں آج بھی معترف ہوں۔ وہ مجھ سے اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے نام کے آگے جو ''سحر'' کا اضافہ کیا ہے، وہ میری ہی وجہ سے کیا تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مجھ سے زیادہ اچھا لکھا

کرتے تھے۔ ان کی ہر کہانی بے مثال اور یاد رہ جانے والی ہوتی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ شاہد علی سحر اس وقت کے سب ہی لکھنے والوں میں ایک غیر معمولی ادیب تھے۔ محمد عمر احمد خان نے ٹوٹ بٹوٹ میں کم لکھا زیادہ ہونہار رسالے میں لکھا تھا، مگر یہ ادیب ایسا با کمال لکھا کرتا تھا کہ نوجوانی میں کہنہ مشق لکھنے والوں کو شرماتا تھا۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے اور میں اس وقت بہت حیران ہوتا ہوں، جب یہ بہت اچھا اور بڑا انسان مجھے اپنا استاد کہتا ہے، حالاں کہ اس جیسی اور شاہد علی سحر کے مقابلے کی تو میں ایک بھی کہانی نہیں لکھ سکا۔ اور بھی کئی نام ہیں بے شمار و بے کنار، مگر مجھے سب کے نام یاد نہیں آرہے۔ مصطفیٰ چاند، جو اب مصطفیٰ ہاشمی کے نام سے ٹی وی ڈرامے لکھنے میں مصروف ہیں اور ہم نیٹ ورک میں ملازم ہیں۔ ان کا پہلا ناول میرے ہی دور میں ''فرار'' کے نام سے ٹوٹ بٹوٹ میں شائع ہوا تھا۔ ایک اور ادیب بہت محنت کش اور غریب بچہ ظفر احمد خان بھی تھا۔ یہ ادیب غالباً بعد میں ٹوٹ بٹوٹ کا ایڈیٹر بھی رہا ہے۔ جب اس نے لکھنا شروع کیا تو میں جیکب لائین میں واقع اس کے گھر بھی پہنچ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر ظفر اس قدر حیران ہوا کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اصل میں اس عہد میں کسی رسالے کے ایڈیٹر کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی اور کوئی لکھنے والا ذرا مشکل سے ہی یہ توقع کر سکتا تھا کہ کوئی ایڈیٹر بنا کسی دوستی اور پہلے سے مراسم نہ ہونے کے باوجود اس کے گھر آسکتا ہے۔ یہ غالباً بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ اور میں کسی کے بھی گھر پہنچ سکتا تھا۔ بس اس کا ادیب ہونا شرط ہونا چاہیے۔ ظفر کو شاید یہ بات یاد ہو کہ میں نے ہمیشہ انسان کی عزت اور قدر اس کے ان محاسن کو سامنے رکھ کر کی، جو اسے اچھا انسان بناتے ہوں اور ظفر وہ تو بچوں کا ادیب تھا، جو ایک بڑی افضل خوبی ہے۔

اس عہد میں ادبی تنظیمیں بھی کئی تھیں، جو بچوں کے ادب اور ادیبوں کی سرگرمیوں پر مشتمل تقریبات منعقد کیا کرتی تھیں، جن میں علامہ اقبال رائٹرز ایسوسی ایشن۔ محبوب الٰہی مخمور اس کے روح رواں تھے۔ شاہین ادبی سوسائٹی...... امتیاز ملک اور اقبال ناز اس کے کرتا دھرتا تھے۔

ٹوٹ بٹوٹ کے زمانوں کی اتنی زیادہ یادیں ہیں کہ یہ بذات خود ایک الگ داستان ہے۔ اس سے نکلنا میرے لیے بہت ہی مشکل ہے، کیوں کہ بچوں کے حوالے سے میں نے سب سے زیادہ زرخیز اور رنگ برنگ زمانہ یہیں گزارا ہے۔ ٹوٹ بٹوٹ کی ہر مہینے ایک میٹنگ ہوا کرتی تھی،

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

جس میں سب ہی لکھنے والوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ شام صاحب جیسے عظیم انسان بچوں کے روبرو میرے ساتھ پیش ہوتے تھے اور شرکاء کے تند و تیز جملوں اور کڑی تنقید کا سامنا کیا کرتے تھے۔ سوچتا ہوں تو شام صاحب کی عظمت کے سمندر میں بہتا چلا جاتا ہوں۔ یہ میٹنگز کبھی پریس کلب میں اور کبھی ہوٹلز میں برپا ہوا کرتی تھیں۔ سب ہی لکھنے والے اور شرکاء تابڑ توڑ حملوں سے (قارئین کو بھی شرکت کی دعوت عام دی جاتی تھی) میری ایڈیٹری کا جلوس نکال دیتے تھے اور ان سب کے سامنے میں جاہل مطلق بن کے رہ جاتا، ان میں سے کچھ میری عزت اور کچھ مجھ سے محبت بھی کرتے تھے، جو میری کوتاہیوں سے صرف نظر کیا کرتے تھے، اُن میں مصطفیٰ چاند، خواجہ وقار احمد، کاشان جعفری اور نعمان ریاض کے نام نمایاں ہیں۔

نوٹ بوٹ ہی وہ پہلا رسالہ ہے، جس نے بچوں کے ادیبوں کے لیے باقاعدہ ایوارڈ کا اجراء کیا تھا۔ یہ تجویز میں نے ہی اس وقت دی تھی، جب نوٹ بوٹ کی مدیر شبانہ یونس ہوا کرتی تھیں۔ اس تجویز پر جلد ہی عمل درآمد شروع کر دیا گیا، لیکن ایوارڈ کی پہلی تقریب میرے دور میں منعقد ہوئی، جب میں نوٹ بوٹ کا ایڈیٹر تھا۔ اس طرح یہ سہرا میرے سر باندھا جاتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں نوٹ بوٹ کے ہر سنہری اور یادگار کارنامے کا سہرا محمود شام کے سر ہی بندھنا چاہیے، وہ ہماری خواہشوں کی تکمیل میں ساتھ نہ دیتے تو یہ سب کبھی نہ ہوتا۔

پہلی تقریب تاج محل (اس وقت ریجنٹ پلازہ ہوٹل کا یہی نام تھا) کے موتی محل آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی تھی۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ سید غوث علی شاہ اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے، لیکن پشاور میں ایک ہوائی جہاز کے حادثے کی وجہ سے انھیں عین اسی دن اسلام آباد جانا پڑا تو وہ اس تقریب میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ اُن کی جگہ اس وقت کے وفاقی وزیر برائے صنعت و حرفت نے شرکت کی تھی، لیکن بعد میں جب غوث علی شاہ کراچی آئے تو انھوں نے نوٹ بوٹ کے ایوارڈ یافتہ مصنفین کو وزیر اعلیٰ ہاؤس میں مدعو کیا اور یہ بھی ایک شان دار تقریب کا ہی انعقاد تھا، جو چیف منسٹر ہاؤس کے سبزہ زار میں برپا کی گئی۔ اس تقریب کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ چیف منسٹر ہاؤس میں منعقد ہونے والی یہ کسی بھی میگزین کی پہلی تقریب تھی اور میں اس تقریب میں اس لیے شریک تھا، کیوں کہ یہ میری ایڈیٹری کا زمانہ تھا اور یہ سارا کریڈیٹ نوٹ بوٹ اور محمود شام کو جاتا ہے۔

انھوں نے بچوں کے نوآموز لکھنے والوں کو ایسی رفعت و توقیر سے سرفراز کیا، جس کا بیان مشکل ہے۔ میرے عہد میں ایک اور تقریب منعقد ہوئی، جو موتی محل میں ہی ہوئی تھی اور اس کے بھی مہمان خصوصی غوث علی شاہ ہی تھے، جو اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ تھے۔ اس طرح میرے دور میں دو سال کے مصنفین کو ایوارڈز دیے گئے، مگر تقریبات تین برپا ہوئیں۔

میں کوئی دو سے ڈھائی سال تک نوٹ بوٹ کا مدیر رہا۔ اس کے بعد دوسرے جہانوں کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ اسی زمانے میں ایک رسالہ آنکھ مچولی بھی نکالا تھا۔ اس میں..... میں نے ایک کہانی اور غالباً دو فیچرز لکھے تھے۔ یہ رسالہ کافی مقبول ہوا تھا۔

بہت عرصے بعد ایک بار اور میں نوٹ بوٹ کا ایڈیٹر بنایا گیا تھا، مگر اس وقت اس رسالے کو سرور راؤ نکالا کرتے تھے۔ مجھے اس لیے یاد ہے کہ اس دور میں نوٹ بوٹ کے ایک خاص شمارے کا میں نے جو ٹائٹل ڈیزائن کیا تھا، اسے دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد کی جانب سے پہلا انعام ملا تھا۔ دوسری بار شام صاحب کے ساتھ میں معیار میں فیچر ایڈیٹر کی حیثیت میں شامل ہوا تھا اور تیسری بار جہان پاکستان اخبار میں ایک کالم نویس کی حیثیت سے جاب کی یہ اخبار حال ہی میں نکلا تھا اور اب ہم دونوں اس اخبار کا حصہ نہیں ہیں۔۔۔

میری کوشش ہے کہ میں صرف بچوں کے ادب اور لکھنے کی سرگرمیوں تک ہی اپنی یہ آپ بیتی محدود رکھوں، ورنہ میری زندگی اتنی جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے کہ اسے لکھنا کوئی اتنا آسان نہیں ہے اور انوکھی کہانیاں کے صفحات بھی اس کے لیے کم ہیں، لہٰذا بچوں کی دنیا میں واپس چلتے ہیں۔ نوٹ بوٹ کے بعد میں نے جو نہار رسالے میں کئی کہانیاں لکھیں۔ دو مقابلوں میں بھی حصہ لیا، جن میں سے ایک میں میری کہانی ''کارنامہ'' کو دوسرا انعام ملا تھا اور دوسرے میں میری کہانی ''بائی جیکر'' کو پہلا انعام دیا گیا تھا۔

بچوں کے ادب کی داستان لکھنے جنھوں اور مرحوم مظہر یوسف زئی کا نام نہ لوں، اس سے زیادہ کوتاہی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ جب میں نوٹ بوٹ کا ایڈیٹر تھا تو مظہر یوسف زئی ہونہار رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ یہ انھی کا کارنامہ تھا کہ ہونہار میں نوآموز لکھنے والوں کو لکھنے کی راہ ملی اور اس رسالے میں بھی ہم سب کی کہانیاں شائع ہونے لگیں۔ میں شام کو نوٹ بوٹ کے دفتر سے نکل کر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہونہار کے دفتر (واقع اورنگزیب مارکیٹ) چلا جاتا تھا، وہاں مظہر صاحب شام کو ہی تشریف لاتے تھے۔ ان کے ساتھ اور ہونہار میں موجود دیگر ادیبوں کے ساتھ دیر تک گفتگو ہا کرتی اور میں وہاں موجود شرکاء کو شام صاحب اور ٹوٹ بٹوٹ کی ناقابل فراموش خدمات پر قائل کیا کرتا تھا۔ رات گئے تک یہ گفتگو مختلف حوالوں سے جاری رہتی تھی۔ میں اور مظہر صاحب دیر تک ساتھ رہا کرتے تھے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ ہونہار کے دفتر سے نکل کر میں اور مظہر صاحب وہیں اے ون نامی ایک کیفے میں جا بیٹھتے، جو جمیل مسجد این جے وی اسکول کے سامنے واقع تھا۔ پھر ہم دونوں الگ سے وہاں بیٹھ کر دیر تک جانے کون کون سے جہانوں کی طولانی گفتگو کیا کرتے تھے۔ مظہر صاحب عمر اور مرتبے میں مجھ سے بہت بڑے تھے، مگر ہم دونوں میں ایسی زبردست دوستی تھی، جو ان کی حیات کے آخری دن تک قائم رہی۔

جب میں ٹوٹ بٹوٹ میں تھا تو میں نے محبوب الٰہی مخمور اور عبدالعزیز عزمی کے ساتھ مل کر بچوں کے ادیبوں کے لیے ایک پکنک کا اہتمام بھی کیا تھا۔ یہ بچوں کے ادیبوں کی پہلی پکنک تھی، جسے بھلایا نہیں جا سکا۔ ہم گڈانی بلوچستان کے ساحل پر گئے تھے۔ قریب بیس کے لگ بھگ ادیب اس پکنک میں شریک ہوئے تھے۔ ساحل سمندر پر ہم نے ایک ادبی نشست بھی منعقد کی تھی۔ بہت ہی شان دار پکنک تھی، جس کی یادیں ہم کبھی بھلا نہیں سکیں گے۔ بقول محبوب الٰہی مخمور...... اس سے اچھی پکنک پھر کبھی نہیں ہو سکی، حالاں کہ اس کے بعد بھی ہم کئی پکنکیں منعقد کر چکے ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

ٹوٹ بٹوٹ کے بعد میں نے روپ میگزین میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ اس رسالے میں بھی بچوں کا ایک گوشہ ''کہکشاں'' کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اداکار سلیم ناصر مرحوم کے رسالے چائلڈ اسٹار میں ملازمت کر لی، جہاں میں نے ابن آس کو دریافت کیا۔ بہت اچھا ادیب ہے اور بہت عمدہ لکھتا ہے۔ چائلڈ اسٹار کے علاوہ سلیم ناصر بڑوں کے لیے ایک ڈائجسٹ بھی نکالا کرتے تھے، جس کا نام پازیب تھا۔ اس ڈائجسٹ کے مدیر کاوش صدیقی تھے، جو ان دنوں لاہور میں شاہ صاحب کے نام سے پہنچے ہوئے پیر کی مسند پر متمکن ہیں اور ان کے پاس دور دور سے لوگ اپنے مسائل حل کرانے آتے ہیں۔ کاوش صدیقی نے اقبال ناز اور امتیاز ملک

کے ساتھ ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے، لیکن ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے کاوش کی سب سے اچھی دوستی مجھ سے ہی ہوئی۔ کاوش اور مصطفیٰ ہاشمی کے پہلے ناولوں کی طرح ان کی پہلی کہانیاں بھی میں نے ہی شائع کرائیں۔ کاوش کا پہلا ناول جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھا تھا، اس کا عنوان ''سفر'' تھا اور یہ بھی ٹوٹ بٹوٹ میں ہی شائع ہوا تھا۔ کاوش اور مصطفیٰ ہاشمی نے بعد میں ڈائجسٹوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں اور دونوں ہی ڈائجسٹوں اور بچوں کے رسالوں کے مدیر بھی رہے ہیں۔

واپس ابن آس کی طرف آتا ہوں۔ اس نے بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ ڈھیروں تراجم بھی کیے ہیں۔ یہ واحد بچوں کا ادیب ہے جو پورے حوصلے سے مجھے اپنا استاد اس کے باوجود مانتا ہے کہ اس نے بھی مجھ سے زیادہ اور یقیناً بہتر لکھا ہے، تاہم بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اس کی کئی ادیبوں کی طرح سماج سے شاید وہ اُمیدیں پوری نہیں ہو سکیں، جنھیں پورا ہونا چاہیے تھا اور جو اس کا حق تھا۔ کئی دوستوں کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں ہیں، جن کا یہاں اظہار مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ابن آس کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا وہ ایک مزدور ادیب تھا اور اسے اپنے مزدور ہونے پر کوئی ملال بھی نہیں ہے، تاہم مجھے کوئی اپنا استاد کہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں، اس سے میری بڑائی سے زیادہ اس کے اپنے بڑے ہونے کا پتا چلتا ہے اور ابن آس میں بھی یہ بڑائی موجود ہے۔ اسے ترقی کرتے دیکھ کر میرا دل ہمیشہ خوش ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے کوئی پھول تھا، جسے میں نے مرجھانے نہیں دیا۔ آج کل ٹی وی ڈرامے لکھنے میں مصروف ہے۔

چائلڈ اسٹار کے بعد کاوش صدیقی نے نوعمر کے نام سے ایک میگزین بچوں کے لیے نکالا تھا۔ میں اس میں بھی ان کے ساتھ تھا اور یہاں مجھے عمران مشتاق ملے اور ذیشان ہاشمی، علی مرتضیٰ وغیرہ۔ پھر بہت عرصے تک میں بڑوں کے رسائل میں ایڈیٹری کرتا رہا جن میں روپ، صبح نو، کراچی آبزرور، فلم سٹی، ونسٹن، فیمنا، فاصلہ، اسٹار اینڈ اسٹائل، فیشن میگ، ٹی وی پلس، اسٹار پلس، نمود وغیرہ شامل ہیں۔ اخبارات میں حریت، جنگ، ڈوانیوز، خبریں، جنٹس اور جہان پاکستان میں میں کام کر چکا ہوں۔

ایک رسالہ اسکول لائف کے عنوان سے بچوں کے لیے نکلا تو میں اس میں بھی شامل ہوا۔ پھر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میں نے خود چائلڈ اسٹار اور چلڈرن نائمز کے نام سے رسائل نکالے۔ میرے ساتھ مظہر یوسف زئی بھی شامل رہے۔ نٹ کھٹ نامی ایک رسالے میں جسے محمد وسیم خان نکالتے ہیں، میری کئی کہانیاں شائع ہوئیں اور آپ بیتی بھی چھپی۔ یہ رسالہ حیدر آباد سے نکلتا ہے۔ میری چھوٹی چھوٹی بچوں کے لیے بارہ کتابیں بھی شائع ہوئیں، جو آغا خان اسکول کے نصاب میں کچھ عرصے تک پڑھائی جاتی رہیں۔ ان کتابوں کو خالدہ محمود نے چھاپا تھا۔ بہت اچھے صحافی اور انسان کی صلاحیتوں کی قدر کرنے والے انسان ہیں۔ علی حسن ساجد نے ایک رسالہ جنگل منگل کے نام سے نکالا تو اس میں بھی میں نے کچھ کہانیاں لکھیں۔ اسی رسالے میں میری کہانی "ڈر" چھپی، جسے میں نے اپنے بچوں کے لیے لکھا تھا۔

اپنی شادی اور بچوں اور گھر بار کا تذکرہ آگے کروں گا۔

زندگی عجیب گورکھ دھندہ ہے۔ سینکڑوں سال سے ہر دور کے مصلح اور مفکر..... انسان کو اس کے انت اور اس کے بعد آنے والے روزِ حساب سے ڈراتے چلے آتے ہیں اور شاید یہ بات اب اب اتنی قدیم اور سال خوردہ ہو چکی ہے کہ ہر دور کے مصلحین نے اپنے لوگوں سے کہا کہ قیامت قریب ہے اور یہ ہر دور میں ایسا ہی کہا گیا اور سمجھا گیا کہ اس عہد میں جو کچھ ہو رہا تھا جو لہو لعب کے مناظر تھے وہ سب قربِ قیامت کی نشانیاں تھے۔ معصوم انسانوں نے ہر دور میں ہر ایسی بات کو سچ مانا اور جزوِ ایمان سمجھا۔ پر یہ کوئی نہ جان سکا کہ آخر قیامت کی اصل اور حقیقی نشانی ہے کیا۔ سائنس دان کہتے ہیں، ابھی دنیا کے ختم ہونے میں کروڑوں برس باقی ہیں اور مصلحین کے بقول جیسے قیامت سر پہ کھڑی ہے۔ سچ کیا ہے یہ جس نے بھی جاننے کی کوشش کی اس کی راہ میں اتنی بھول بھلیاں تھیں کہ اسے راستا ملا ہی نہیں۔ کوئی بھٹک گیا اور جو واپس آیا اسے اپنے عہد کو اوڑھ کے جینا پڑا یا اس نے عہد سے آنکھیں پھیر کے خود کے لیے گوشہ عافیت تعمیر کر لیا۔ یہ گوشہ عافیت کسی کے خیالوں میں تعمیر ہوتا رہا۔ کوئی اسے زمین پر کنکر اور ریت سے مضبوط بناتا رہا، پر یہ کوئی نہیں بتا سکا کہ اصل زندگی دنیا میں جیتے چلے جانے کا نام ہے یا دنیا سے منہ موڑ کے زندگی کرنے کا نام زندگی ہے۔ عظیم اور معتبر سمجھے جانے والے سب ہی مختلف اُلخیال لوگ جو اللہ کے بندے تھے۔ دنیا میں دل لگانے کو انسان کی نادانی سے تعمیر کرتے رہے اور اسی شدت سے انسانوں کے زیادہ بڑے

گروہ دنیا میں مگن ہوتے چلے گئے۔ ایسے ہی زندگی کی ترقی کا فسانہ ہے ہر دور میں ہر قوم ترقی کی طرف دوڑتی رہی۔

کہتے ہیں دنیا میں جو کچھ گزر گیا ہے بیت چکا ہے۔ وہ بھی ایسے ترقی یافتہ زمانے تھے کہ آج کی بیش بہا ترقی اس زمانے کی بعض چیزوں پر سر دھن رہی ہے اور جان نہیں پاتی کہ وہ سب کچھ کیسے ہوا ہوگا جیسے خوفو کا مقبرہ، اہرام مصر اور اسی نوع کی بے شمار عجوبہ باتیں، عمارتیں اور مختلف الاقسام کہانیاں۔ اب تک بھی ایک سربستہ راز ہے، جیسے خدا کا مخفی ہونا، جسے ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کو بے شمار انسان انگنت مسافتیں طے کر چکے ہیں اور انھوں نے شاید خدا کو پا بھی لیا، مگر ان میں سے کوئی ایک بھی خدا کو کسی دوسرے کو دکھانے سے معذور ہے اور کہا گیا کہ خدا پردے میں رہنا چاہتا ہے اور اسی کا عشق حقیقی ہے، باقی ساری محبتیں مجازی اور خیالی ہیں۔ دنیا میں وہ چیز یا وہ بات حقیقت سمجھی جاتی ہے جو دکھائی دے، جسے چھوا جا سکتا ہو یا، جو انسان کے کسی معلوم حواس خمسہ سے ثابت ہوتی ہو، مگر خدا کی دنیا میں صرف وہ چیز حقیقت ہے جو دکھائی نہ دے اور جو انسان کے حواس خمسہ کی گرفت میں نہ آتی ہو۔ چناں چہ انسان اپنی عقل کے دائروں میں بھٹک کے رہ گیا کہ کیا حقیقی ہے اور کیا خیالی ہے۔ اگر نظر نہ آنے والی دنیا حقیقی ہے جیسے جنت اور دوزخ جیسے خدا تو پھر یہ دنیا جس میں ہم جیتے مرتے ہیں یہ کیا ہے؟ سوال اب بھی انسانی زندگی میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہزاروں مصلح الدین، پیغمبر اور مسیحا انسانی دنیا کی اس ترقی سے دامن بچانے کی تلقین کرتے ہیں، جس کے پیچھے دنیا کے قریب سب ہی انسان بھاگتے رہے ہیں۔ ۔۔تو پھر اصل کیا ہے۔ ہمارا سماج بھی ایسی ترقی اور خوش حالی کو جا پکڑنے کو تیار اور آمادہ ہے، جیسی مغرب کے پاس ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اسی ترقی اور خوشحالی کی مثالیں دی جاتی ہیں تو پھر اصل دنیا کیا ہے۔۔۔؟ انسان اگر دنیا کی ترقی اور خوش حالی کے پیچھے جائے تو وہ اس حقیقی دنیا کے لیے وقت کہاں سے لائے، جو خدا کی دنیا ہے، چناں چہ آج کی دنیا کا انسان اسی کشمکش کا شکار ہے، جیسی کشمکش ہزاروں سال پہلے والے انسان کے مقدر کا اور زندگی کا حصہ تھی۔ سچ کیا ہے یہ جاننا ناممکن نہیں تو اتنا مشکل ضرور ہے کہ اسے دنیا کے سب انسان کبھی نہیں جان پائیں گے۔ اصل مسیحا وہ ہے جو حقیقی دنیا کی تعمیر کی طرف بلاتا ہے یا وہ ہے جو موجود اور دکھائی دینے والی دنیا کی تعمیر کو ہی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

سب کچھ سمجھتا ہے۔ کوئی مانے چاہے نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے ..... دنیا کا ایک بھی ایسا عہد نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہو کہ انسان نے حقیقی اور مجازی دونوں دنیاؤں میں ایک ساتھ ترقی کی ۔۔۔ اور یہ باعث مثال بھی ہو۔

میں چاہتا ہوں آپ سے ایسی باتیں نہ کروں، جن کا سمجھنا آپ کے لیے دشوار ہو، کیوں کہ فی زمانہ ۔۔۔ مشکل باتوں سے پرہیز اور گریز کا زمانہ ہے۔ انسان صرف وہ ہی دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے جو اسے دکھائی دے اور بنا کوئی مشقت کیے سمجھ میں آجائے ۔۔۔ بتائیں کیا یہ ممکن تھا کہ گزرے عہد کے لوگ کوئی مشقت نہ کرتے اور جو چاہتے وہ پالیتے ۔۔۔ ظاہر ہے نہیں ۔۔۔ یہ پہلے کہ لوگوں کی مشقتوں اور محنتوں اور ریاضتوں کا ہی ثمر ہے کہ آج دنیا موجودہ عہد کے انسان کے لیے آسان اور قابل فہم نظر آتی ہے، لیکن کیا ایسا ہے کہ دنیا کے اور انسان کے اور کائنات کے سب مسائل حل کیے جا چکے؟ یہی وہ سوال ہے جسے کسی نہ کسی ایسے انسان کو کھوجنا ہے جو دنیا میں چین سے جینے کے لیے نہیں بھیجا جائے گا۔ بے چینی ہی اصل میں کائنات کے سربستہ رازوں کو نظر نہ آنے والی دنیا کی حقیقتوں تک پہنچنے کی علامت ہے۔

پتا نہیں ان باتوں سے آپ کو کوئی دل چسپی ہے بھی یا نہیں ..... پر میں چوں کہ اپنی آپ بیتی لکھ رہا ہوں تو مجھے یہ حق پہنچتا ہے کہ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیے کہ میری زندگی کن الجھیڑوں میں گزرتی رہی ہے ان کا کچھ بیان قلمبند کروں ۔۔۔ مجھے اس دنیا نے جو ہمیں دکھائی دیتی ہے جسے ہم دیکھ سکتے ہیں چھو بھی سکتے ہیں ۔۔۔ کبھی متاثر کیا نہ اتنا پریشان کہ میں اسے چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیتا۔ مجھے تو اسی دنیا نے پریشان رکھا ہے جو دکھائی نہیں دیتی، جہاں کہیں اللہ ہے، فرشتے ہیں اور جنت ہے دوزخ ہے اور نجانے کیا کیا ہے۔ ہمیں سب کہاں معلوم ہے ۔۔۔ آپ کہیں گے کہ اللہ تو ہر جگہ ہے ۔۔۔ یہ بات میں بھی مانتا ہوں ۔۔۔ پر ایسا ہمارا خیال ہے اور خیال کو حقیقت تک لے جانے یا اس کی حقیقت تک پہنچنے کی جستجو اس کے باوجود ہزاروں لاکھوں لوگوں نے کی ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اللہ کو تلاش کیا جائے ۔۔۔ اور اُن گنت لوگ ایسے گزرے ہیں جو اس کی تلاش میں نکلے بھی ہیں۔ بھلے ہی انھیں اللہ اسی طرح ملا کہ انھوں نے اسے اپنی شہ رگ سے قریب اور اپنے دل کے نہاں خانوں میں کہیں پایا، لیکن یہ شہ رگ اور دل کا نہاں خانہ بھی

ڈھونڈنا تو پڑتا ہے اور یہ بات سب مانتے ہیں کہ اس تلاش میں سب کو کامیابی ملتی بھی نہیں ہے، جیسے صوفیوں کا ایک سلسلہ ہے، جسے صوفی ازم کہا جاتا ہے اور جو شروع ہی اس طرح سے ہوتا ہے کہ اس میں سفر کرنے والے پہلے دنیا کی آلائش اور یہاں کی ان چیزوں سے کنارا کشی اختیار کرتے ہیں، جس کے پیچھے ساری دنیا لگی ہوئی ہے۔ اس بات نے مجھے ہمیشہ ایک قسم کے استہزا سے ہم کنار کیا کہ دنیا میں جو صوفیوں کے مزارات ہیں، ان میں سے بیش تر نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا تھا، جیسے کسی نے بادشاہت چھوڑی تو کسی نے گھر بار چھوڑا اور لطیفہ یہ ہے کہ ان سب ہی مزارات اور استادو بقید حیات صوفیوں سے دنیا والے وہ ہی چیزیں مانگنے جاتے ہیں جو انھوں نے چھوڑ دی تھیں، یعنی ایک انسان کے پاس اگر کوئی سائیکل ہے تو میں اس سے عاریتاً یا مستقل اس کی سائیکل ہی مانگ سکتا ہوں، مگر صوفیوں کے پاس بادشاہت نہیں ہے، ان کے پاس دنیا کی دولت بھی نہیں ہے پھر بھی لوگ ان سے یہی سب کچھ مانگتے ہیں، حتیٰ کہ لوگ ان سے ایسی گاڑیاں تک مانگتے ہیں، جو ان کے عہد میں موجود ہی نہیں تھیں تو کیا ہم انھیں اپنے جیسا انسان نہیں مانتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ کے ایسے بندے ہیں، جو ہم سے مختلف ہیں، مگر وہ پیدا تو انسان ہی ہوئے تھے اور انسان ہی بن کر۔

انھوں نے زندگی گزاری تو پھر ہم انھیں انسان کیوں نہیں مانتے۔ اور اگر ایسا اس لیے ہے کہ انھوں نے اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کی خاطر دنیا چھوڑ دی تھی، اسی لیے وہ اس قابل ہوئے کہ اللہ کے مقرب بندے بن گئے اور ان کے اختیار میں اب وہ سب کچھ ہے جو دنیا داروں کے اختیار میں نہیں ہے تو کیا اللہ کا مقرب ہونے کے لیے ہر انسان کو اسی کی بنائی ہوئی دنیا چھوڑ دینی چاہیے۔ تب وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس آکر دنیا کے طاقت ور ترین بادشاہ بھی اپنی آرزوئیں طلب کریں تو پھر دنیا کی بادشاہت کی اوقات کیا ہے کیوں انسان اس فقیری سے ہی رجوع نہیں کر لیتا جو بادشاہت سے بلند ہے ۔۔۔؟ اسی قسم کے سوالوں نے مجھے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔

میں جب بچوں کی کہانیاں لکھا کرتا تھا، تب بھی میری کہانیوں میں ایسے ہی موضوعات ہوا کرتے تھے، جیسے ٹوٹ بٹوٹ میں میری ایک ایسی ہی کہانی شائع ہوئی تھی، جس میں دنیا سے منہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

موڑنے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ میری ایسی سب ہی کہانیاں کبھی بھی مقبول نہیں ہوئیں، کیوں کہ دنیا داروں کو صرف ایسی ہی باتیں پسند آتی ہیں، جو ان کے مطلب کی ہوں۔ ایک ایسی ہی کہانی میں نے بڑوں کے لیے بھی لکھی تھی۔ "پردہ گرائے جانے کی صدا" اس کہانی کو جنت میں بیٹھ کر لکھا گیا تھا اور اس کے کردار اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اسے جب میں نے ایک ادبی نشست میں تنقید کے لیے پڑھا تو کچھ شرکا، جن میں بڑے بڑے ادیب و شاعر شامل تھے، وہ اس پر لعن طعن کرنے لگے کہ ایسی کہانیاں لکھنا ہی نہیں چاہئیں، جب کہ بعض ایسے بڑے ادیب اور شاعر بھی اس محفل میں مدعو تھے، جو میری اس تخلیق پر اس قدر خوش ہوئے کہ ان کی حیرانی جاتی ہی نہیں تھی۔ ان میں سے بعض نے میرے ہاتھ چومے کہ میں نے ایسی حیرت انگیز کہانی یا افسانہ لکھا ہے۔ انھی میں میرے پروفیسر آذر حفیظ مرحوم بھی تھے، جو انگریزی کے استاد تھے گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ "حنیف میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر کمال کے کہانی کار ہو۔ میں تو تمھیں بس ایک جرنلسٹ سمجھتا تھا۔"

لیکن میں نے کہانیاں اور افسانے کچھ اتنے زیادہ نہیں لکھے زیادہ سے زیادہ سو ہوں گے جن میں سے بیش تر چھپ چکے ہیں مختلف رسائل میں۔ (یہ میں بڑوں کی کہانیوں کی بات کر رہا ہوں۔)

اسی طرح جب میں نے ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھے تو ان میں سے ایک ڈراما ایسا بھی لکھا، جس کا موضوع تھا "عورت پیغمبر کیوں نہیں ہوتی؟" یہ ڈراما آج تک کسی نے نہیں بنایا۔ سب کا خیال ہے کہ اسے کوئی دیکھے گا ہی نہیں، کیوں کہ پاکستان میں صرف کچن ڈرامے دیکھے جاتے ہیں، کیوں کہ ہم بہت کھاتی پیتی قوم ہیں۔ ہماری خواتین کا زیادہ تر زندگی کا حصہ کچن میں ہی گزرتا ہے اور وہ ایسے ہی ڈرامے دیکھنا پسند کرتی ہیں۔

لوٹتا ہوں بچوں کی طرف...... جب میں نوٹ بوٹ کا ایڈیٹر تھا تو میری ایک عادت تھی کہ مجھے جب بھی کوئی اچھی کہانی ڈاک کے ذریعے موصول ہوتی تھی تو میں اس ادیب کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ اس کا مقصد اسے شاباش دینا اور زیادہ سے زیادہ اچھی کہانیاں لکھنے پر اکسانا ہوتا تھا۔ اس سفر میں...... میں نے جو ادیب دریافت کیے، ان میں کاشان فیملی بھی شامل ہے۔ کاشان کی کوئی کہانی میرے نوٹ بوٹ میں آنے سے پہلے سے آئی ہوئی تھی۔ میں ان سب لفافوں میں

سے کہانیاں نکال نکال کر پڑھا کرتا تھا، جو ایک مدت سے بند تھے اور جنھیں شاید اس طرح کھولا گیا تھا کہ کھول کے رکھ دیا گیا تھا، پڑھا نہیں گیا تھا۔ اسی میں کاشان کی کہانی بھی موجود تھی اور یوں کاشان کی پوری فیملی دریافت ہوئی۔

ان کے والد صفدر علی جعفری اور ان کی والدہ اُم کاشان سے میری پرخلوص قرابت داری قائم ہوگئی۔ کاشان کی امی میری بہن جیسی ہیں اور ان کے بچے میرے بھانجے ہیں۔ ان چاروں بھائیوں کی بہن کوئی نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا، جب قریباً ہر دوسرے اتوار یا جمعہ کو ان کے گھر جانا ہوتا تھا۔ بہت ہی خوش مزاج اور مہمان نواز خاندان تھا، بلکہ ہے اور اب تو سمجھیں کہ وہ میری بڑی بہن ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں۔

کاشان نے اپنی زندگی کے فیصلوں میں مجھ سے ہمیشہ مشورہ کیا، جو بات ان کے مرحوم والد نہیں مانا کرتے تھے۔ اس کے لیے باجی (کاشان کی امی) کہا کرتی تھیں۔ حنیف آئیں تو اُن سے کہلوانا...... تمہارے ابو ان کی بات نہیں ٹالتے۔ یوں کاشان نے فائن آرٹ میں ڈگری لی اور اب وہ یونی ورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ دوسرے ذیشان علی صفدر ہیں، ان کی شادی ہو چکی ہے اور وہ جاب کرتے ہیں۔ تیسرے دانش ہیں، جو س م دانش کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ انھیں ان کے ابا کی جگہ دفتر میں نوکری مل گئی ہے۔ صفدر بھائی بہت باکمال اکاؤنٹنٹ تھے، جب کہ تیسرے نمبر ان جلیس ہیں، جو ابھی پڑھ رہے ہیں اور سوشل ورک میں ان کی دل چسپی ادب سے بھی زیادہ ہے۔

اچھی کہانیوں کی تلاش میں میں نے ایک کہانی پڑھی "وہ کمرا" ...... یہ نعمان ریاض کی لکھی ہوئی تھی۔ ان کے بھی میں گھر پہنچ گیا۔ یہ ملیر ہالٹ میں رہا کرتے تھے۔ ملاقات پر معلوم ہوا کہ وہ میرزا ادیب کے نواسے بھی ہیں۔ نعمان نے جو بھی لکھا، میرے کہنے پر ہی لکھا۔ ایک ناول "آدھا آدمی" جو نوٹ بوٹ میں قسط وار شائع ہوا اور اس کے بعد وہ ہاتھ اور پھر جب میں چائلڈ اسٹار میں سلیم ناصر کے ساتھ تھا تو میں نے نعمان سے "حویلی کا بھیڑیا" لکھوائی۔ اس کے بعد جیسے میرا اور نعمان کا رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں بچوں سے نکل کر صرف بڑوں کی صحافت میں کام کرنے لگا۔ نعمان سے لکھوانے والا کوئی رہا نہیں تو انھوں نے لکھا بھی نہیں۔ آج کل وہ ریڈیو چینل ایف

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ایم 96 رن کرتے ہیں اور میسجز جو آپ موبائل پر اِدھر سے اُدھر بھیجتے ہیں۔ یہ بھی ان کی ہی کمپنی کا کام ہے۔ حال ہی میں نعمان ریاض نے ایک کتاب بھی لکھی ہے "خلیفۃ الرض" جو روحانیت کے حوالے سے ہے۔ اس کا موضوع "قرآن اور انسان" ہے۔ کتاب میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اسے قرآنی آیتوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ نعمان نے شمس الدین عظیمی صاحب کی شاگردی میں روحانیت کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ نعمان جتنا اچھا ادیب ہے اتنا ہی اچھا انسان ہے۔ نعمان کے ساتھ ان کے ایک دوست مشہدی بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ بھی ایسا خضب کا مخلص اور انسان دوست شخص تھا کہ امریکا جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آیا تھا اور شاید اب وہ ہمیشہ کے لیے امریکا جا چکا ہے۔

لکھنے کی دنیا میں مجھے سب سے پہلے جو دوست ملا، جو میرا سچ مچ ہمدم اور رفیق ہے اور جو میرا سب سے اچھا دوست رہا ہے، جس کی زندگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، جو بہت ہی باکمال انسان اور بے پناہ خوبیوں کی مالک ایک ایسی شخصیت ہے کہ اسے ہم سب دوست "انسان" کہا کرتے تھے، بقول ہمارے ایک دوست کہ "اس کی بات مت کرو وہ انسان نہیں ہے" یہ تھے رضا، جو اِن دنوں کوئی پندرہ سال سے بھی زیادہ مدت سے امریکا میں ہیں۔ بہت ہی کمال کے ڈاکٹر ہیں اور اس سے بھی اچھے انسان ہیں۔ عابد سے میں نے تہذیب وتمدن کے وہ سارے دفتر سیکھے، جنھیں سیکھنے کے لیے انسان برسوں سرگرداں رہے اور تب بھی طلب اور پیاس بجھ نہ سکی۔ عابد مجھے ٹوٹ بٹوٹ کی ایک میٹنگ ہی میں ملا تھا اور ہم دونوں اتنے زیادہ ہم مزاج تھے کہ ایک دوسرے کے دوست بننے میں ہمیں کچھ بھی وقت نہیں لگا۔ وہ میرا ایسا دوست ہے، جس کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دوستی کسی مذہب کسی مسلک اور کسی ایسی چیز کی محتاج نہیں ہوتی جس کے لیے باقی رشتے ہوا کرتے ہیں، چناں چہ ہم شیعہ سنی مسلمان دوستی کی بہترین مثال ہیں۔ آپ کو شاید یہ سن کر حیرانی ہو کہ میں عابد کے گھر میں اور وہ میرے گھر میں اس طرح شناخت ہی نہیں کیے جاتے کہ ہم کوئی الگ الگ عقیدے کے لوگ ہیں۔ میں جب کبھی ان کے گھر جاتا ہوں تو وہ مجھے اپنا ہی گھر لگتا ہے۔ میرے گھر سے بلند اگر وہاں کچھ ہے تو وہ ہے "علم" عابد کے گھر میں سب لوگ بہت پڑھے لکھے ہیں اور تھے۔۔۔ تھے مطلب، عابد کے والد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میری ان

سے بھی بہت دوستی تھی اور مجھے ان سے مل کر بے پناہ مسرت ہوتی رہی ہے۔ عابد تو ایک مدت سے امریکا میں ہے ہم اس کی غیر موجودگی میں متعدد بار گفتگو کے لیے جمع ہوئے اور بے شمار موضوعات پر طولانی گفتگوئیں ہم نے کیں۔ ان کی والدہ میرے لیے کس قدر محترم اور عظیم ہیں، اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔ عابد کا چھوٹا بھائی انظر بھی ایسا ہی عالم فاضل ہے جیسا کہ عابد تھا اور اب بھی ہے۔ اب اس پیرانہ سالی کی وجہ سے میرا عابد کے گھر اور ان سالانہ مسالموں میں شریک ہونا کم ہو چکا ہے، جن میں..... میں قریب پچیس سال تک شرکت کرتا رہا ہوں، لیکن عابد سے جب کبھی موبائل پر گفتگو ہوتی ہے تو ہم دونوں کو ہمیشہ لگتا ہے وقت کم پڑ جاتا ہے اور۔۔۔ ہم تشنہ رہ جاتے ہیں۔ عابد نے بچوں کی بہت سی کہانیاں لکھیں اور بڑوں اور بچوں کے لیے کچھ شاعری بھی کی۔ شاعری اس نے بھی یہ کہہ کر چھوڑ دی کہ لوگ اگلے وقتوں میں اور موجودہ وقت میں بھی۔ ہم سے اچھے شعر کہہ گئے ہیں اور کہہ رہے ہیں، اس لیے ایسی بات کیا کہنا جو مجھ سے اچھی کوئی اور کہہ سکتا ہے۔۔۔ کار عبث ہے۔ اس نے نثر بھی لکھنا تقریباً چھوڑ دی ہے۔ میں بہت کہتا ہوں، مگر وہ کہتا ہے۔۔۔ کبھی وقت ملا تو لکھوں گا۔ میں ہمیشہ سوچتا ہوں اگر عابد کو وقت ملا ہوتا اور وہ ڈاکٹر کے بجائے ادیب ہوتا تو دنیائے ادب ایک ایسے عظیم اور ناقابل فراموش ادیب کے فن سے مالا مال ہوتی، جس کا ثانی نہ ہوتا کوئی، لیکن اس نے بچوں کے لیے عابد رضا ارتقائی کے نام سے لکھا اور اہم بھی کئی کیے، جو سب کے سب پڑھنے سے تعلق رکھتے تھے۔

لکھنے والی لڑکیوں میں ہم سب سے زیادہ یاسمین حفیظ اور سلمیٰ کنول کو پڑھا کرتے تھے اور ان سے ملاقاتیں بھی رہیں، خاص طور سے یاسمین کے گھر میں اور اقبال ناز بہت زیادہ جایا کرتے تھے، کیوں جاتے تھے؟ اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ اس لڑکی کے سارے خاندان سے ہمیں اچھا لگا کرتا تھا۔ دیر تک بے تکان اور نجانے کہاں کہاں کی باتیں ہم کرتے۔ میری یاسمین سے اتنی ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی، جتنی اقبال ناز کی تھی، کیوں کہ یاسمین کا اردو ادب خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" پر آ کر ختم ہو جاتا تھا اور میرا وہاں سے شروع ہوتا تھا۔ ممکن ہے یاسمین نے بعد میں کچھ اور بھی آگے پڑھا ہو اور اب وہ آنگن سے آگے بڑھ چکی ہوں۔ پھر بھی یہ لڑکی میرے گھر آنے والی پہلی ادیبہ تھی اور مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح عزیز تھی اب بھی ہے۔ میری

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اماں مرحومہ سے اس کی خاص دوستی تھی اور یہ ہمیشہ ان کے بارے میں پوچھا کرتی تھی۔ اقبال ناز میرا دوست ان دنوں ڈی جے سائنس کالج میں اردو کا پروفیسر ہے۔ بہت ہی اچھا انسان اور شاعر ہے۔ اس نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں، جن میں ایک کہانی "آٹوگراف" مجھے آج تک یاد ہے۔ اقبال کے ساتھ میرا بہت سا اچھا اور برا وقت گزرا ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے مسائل اور دل چسپیوں میں ہمیشہ پر خلوص حصہ لیا۔ وہ ٹوٹ بٹوٹ میں میرے ساتھ ہی جاب کیا کرتا تھا۔ ہم ساتھ ہی جایا کرتے تھے اور ساتھ ہی واپس آیا کرتے تھے۔ اس کی شاعری آج بھی مزہ دیتی ہے۔ شاہین ادبی سوسائٹی نامی تنظیم میں ہم دونوں نے بہت سا وقت ساتھ گزارا۔۔۔ اور بے شمار تقریبات بھی منعقد کیں۔

اقبال کا ذکر آئے اور امتیاز ملک کا ذکر نہ ہو، یہ تو جیسے ممکن ہی نہیں ہے۔ امتیاز ایک بہت اچھا انسان تھا اور اقبال کا ہم مکتب بھی تھا، لیکن مجھ سے اس کی دوستی بچوں کی کہانیاں لکھنے کی وجہ سے ہی ہوئی تھی۔ پھر ہم دونوں کا اتنا زیادہ وقت ایک ساتھ گزرا کہ اس کا شمار بھی اب ممکن نہیں۔ امتیاز ان دنوں آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں ہے اور وہاں اس نے شادی کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ اسکائپ پر ہماری گفتگو ہوتی ہے مگر یہ۔۔۔ زیادہ تر۔۔۔ معین قریشی کے ساتھ ہوتی ہے۔ معین میرے ان دوستوں میں شمار ہوتا ہے، جنھیں میں اپنے دل میں بہت قریب محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرا ایسا دوست ہے کہ اگر وہ مجھ پر دنیا میں سب سے زیادہ اپنا حق جمائے تو میں کہوں گا وہ حق پر ہے، مگر معین قریشی اور امتیاز ملک چوں کہ بچوں کے حوالے سے میرے دوست نہیں تھے۔ ان سے میں نے ہی ایک ایک کہانی بچوں کے لیے لکھوائی تھی اور یہ اتنا زیادہ اچھا لکھا کرتے تھے کہ ان کی وہ دو کہانیاں ہی ٹوٹ بٹوٹ میں ایوارڈ کی مستحق کہلائیں، ورنہ یہ دونوں بڑوں کے بے مثال شاعر اور ادیب ہیں۔ معین کہیں زیادہ، جس کی شاعری آج بھی بے مثال ہے اور دل کو چھو جاتی ہے میں معین پر ہمیشہ رشک کرتا رہا ہوں۔ ان دنوں وہ ایڈورٹائزنگ کے شعبے کا بہت بڑا آدمی ہے اس کا اپنا ایک ادارہ ہے، جہاں سے ٹی وی اور پریس کے لیے اشتہارات بنائے جاتے ہیں اور معین انھیں لکھا کرتا ہے۔ وہ تشہیری شعبے کا باکمال کونسیپٹ رائٹر ہے۔ واٹس موبائل کے اشتہارات ان دنوں اسی کا ادارہ سی ایچ کیو بنا رہا ہے۔ اس نے اتنے زیادہ

اشتہارات لکھے اور بنائے ہیں کہ ان سب کا یہاں ذکر ممکن نہیں ہے۔ معین کی کہانی کانچ کی گڑیا بچوں کے لیے اس کی بہترین کہانی تھی، جو ٹوٹ بٹوٹ ایوارڈ کی مستحق قرار پائی تھی۔ انھی دوستوں میں ڈاکٹر ایس این ایم شہزاد کے گھر ہونے والی ادبی نشستیں اور وہاں موجود دوستوں کی یادوں سے بھی باب زندگی جیسے محراب در محراب۔۔۔ کوئی عکس متحرک۔۔۔ ساعتوں میں گونجتے کھنکتے لفظوں کے گھنگرو اور مناظر کی برسات جیسے رم جھم زندگی کا ساون۔۔۔ اور گیتوں کی چھما چھم۔

جانے کیا کیا گزری اور کیسے گزری عجیب داستاں ہے یہ۔۔۔

میری زندگی کا زیادہ حصہ بڑوں کے لیے لکھتے ہوئے گزرا ہے اور گزر رہا ہے، اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ میں کوئی بہت زیادہ طویل داستان یہاں رقم کر سکوں گا، کیوں کہ میں سمجھتا ہوں، بڑوں کے ادب و صحافت میں گزاری ہوئی زندگی سے آپ کی دلچسپی اتنی نہیں ہوگی، اس لیے اسے رہنے ہی دیتا ہوں۔

ایم اسلم خان..... میری زندگی اس انسان کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ اسلم کی اور میری دوستی کا اب تک یہ عالم ہے کہ اگر لوگ مجھ سے میری خیریت پوچھتے ہیں تو دوسرے ہی جملے میں وہ اسلم کے بارے میں بھی ضرور پوچھتے ہیں۔ وہ باقاعدہ ادیب نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں اور ایک کہانی "سائیکل" کے بارے میں تو مجیب ظفر انوار نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اسلم وہ کہانی مجھے دے دیں تو مجھ سے میری دوسب سے اچھی کہانیاں لے لیں، کیوں کہ "سائیکل" مجیب کی پسندیدہ کہانی ہے۔ اسلم کی ایک بچوں کی کتاب کو نیشنل بک فاؤنڈیشن سے انعام بھی مل چکا ہے۔ میری ایک کتاب "اللہ کے شیر بچوں کے لیے" کتاب کو دوسرا انعام اسی ادارے سے مل چکا ہے۔ یہ کتاب صوفیاء کرام کے ایسے واقعات پر مشتمل ہے، جو بچوں سے قریب ترین ہو سکتے ہیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن والے ہر سال کتابوں کو انعام دیا کرتے ہیں اور دوسرا اور پہلا انعام ایک یا دو سے زیادہ نہیں ہوتے جب کہ تیسرا انعام زیادہ میں ہوتا ہے اور میری کتاب کو دوسرا انعام بھی مل چکا ہے، مگر یہ کوئی ایسی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ میرے بہت سے دوستوں اور لکھنے والوں کو یہ انعام مل چکا ہے۔ یہاں میں ایسے واقعات اور باتیں یاد کر کے لکھ رہا ہوں جن کا تعلق بچوں سے بنتا ہو۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

بچپن سے مجھے فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا، لیکن میری تربیت جن کے ایسے دوستوں کے ساتھ ہوئی، جو طلباء سیاست میں متحرک تھے، جن میں اظہر عباس، امتیاز ملک، معین قریشی اور احتشام مجھ سے بہت زیادہ قریب رہے، اس لیے میرا ابتدائی زمانہ سیاسی مجالس اور مذاکروں اور ایسی محفلوں میں گزرا، جہاں انقلاب کی باتیں جیسے ہمارا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ اس سارے زمانے کی یادیں بھی بہت زیادہ اور ایسی طویل ہیں کہ انھیں لکھنے بیٹھوں تو ایسا معلوم ہونے لگے گا جیسے میں سیاسی، ذہنی، عملی زندگی گزار کے آیا ہوں اور آپ کو شاید اس سے اتنی دل چسپی نہ معلوم ہو۔ یوں سمجھئے کہ میں نے نوابزادہ نصر اللہ (مشہور اپوزیشن لیڈر) سے لے کر ایم کیو ایم کے عامر خان تک کے انٹرویوز کیے۔۔۔ اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی شادی کی تقریب کی کوریج بھی میں نے کی۔

بے نظیر بھٹو کے جلسوں میں شریک ہونے میں بلوچستان تک جا چکا ہوں۔ وہ بھی میری پسندیدہ لیڈر رہی تھیں۔ اب مجھے کوئی سیاسی لیڈر پسند نہیں ہے، لیکن اب بھی بے نظیر کو میں ایک اچھی سوجھ بوجھ رکھنے والی لیڈر مانتا ہوں، اسی لیے میں نے فوزیہ کے ساتھ ایک سیاسی نوعیت کا رسالہ دستک بھی نکالا تھا، جس میں کئی بار کام کر چکا ہوں۔

محمد نزاکت علی سے میری ملاقات تو بچوں کی کہانیاں اور بچوں کے جہان میں ہی ہوئی تھی۔ وہ یوسف پلازہ فیڈرل بی ایریا میں رہا کرتے تھے اور میرے پاس ٹوٹ بٹوٹ میں کہانیاں انھوں نے بھی لکھیں۔ پھر جب میں نے ان کے سیاسی رسالے کراچی آبزرور میں ملازمت کی تو کوئی پانچ چھ سال تک میں اس رسالے کا ایڈیٹر رہا۔ نزاکت سے میری بہت اچھی دوستی رہی۔ وہ اتنا شریف اور مخلص انسان ہے کہ کبھی شرافت اس پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اب یہ رسالہ نیٹ پر تو موجود ہے اور اسے اپ ڈیٹ بھی کیا جاتا ہے، مگر اس کی اشاعت معطل ہو چکی ہے۔

فلم کا ذکر آیا تو کچھ ادھورا سا رہا۔ فلمیں دیکھنے کا مجھے ہمیشہ سے بہت شوق رہا ہے۔ ہزاروں فلمیں دیکھیں۔ لیور والوں کے چار ریڈیو پروگرامز کوئی ڈیڑھ برس تک لکھے۔ میرے ریڈیو کے پروگرامز ثانیہ سعید، نائلہ جعفری، غزل سلام اور سونیا خان ریڈیو سے بولا کرتی تھیں۔ فلموں سے بے پناہ محبت اور شوق میں میں نے فصیح باری خان (قدوسی صاحب کی

بیوہ والے مشہور و معروف ڈراما نویس) کے ساتھ ایک رسالہ فلم ٹی نکالا تھا۔ فصیح کے ساتھ میری بہت اچھی اور قریبی دوستی رہی ہے۔ ہم دونوں آج بھی ایک دوسرے کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ احمد کامران بھی اس میگزین میں ہمارے ساتھ تھے۔ اب وہ بھی ٹی وی ڈرامے کے معروف ڈائریکٹر ہیں اور انھوں نے مجھ سے ٹی وی کے لیے پہلا ڈراما "سڑک کے اس پار" لکھوایا تھا۔ یہ جیو سے پیش ہوا تھا۔ بعد میں احمد کامران کے ساتھ میں نے بہت سے ڈرامے لکھے، جو پی ٹی وی سے زیادہ تر دکھائے گئے۔

علی کامدار میرے بہت اچھے دوستوں میں ہیں۔ ان کے ساتھ میں نے انڈس چینل سے چار ٹی وی ڈرامے لکھے اور یوں کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ میرے پسندیدہ ڈرامے وہ ہیں، جن کی ہدایات علی کامدار نے دی تھیں۔ ایک اولاد، دوسرا انفرت۔

اس کے علاوہ محمد اظہار کے ساتھ کئی ڈرامے لکھے۔ یہ پی ٹی وی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دنوں میرا ایک ڈراما سیریل بنا رہے ہیں۔ پی ٹی وی کی تسنیم اسلم بہت ہی اچھی انسان دوست اور باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ان کے ساتھ میں نے ایک سال تک میرے ندیم کے عنوان سے ایک پروگرام لکھا، جسے اداکار ندیم ہوسٹ کیا کرتے تھے۔ یہ بہت ہی خوب صورت دن تھے۔ بہت مزہ آیا اس کام میں۔ سچ پوچھیں تو میری شوبزنس کے شعبے میں گزاری ہوئی زندگی اب میری اصل پہچان ہے اور میں ان دنوں شوبزنس کی صحافت اور ڈراموں سے ہی پہچانا جاتا ہوں اور یہی میرے روزگار کا ذریعہ بھی ہے۔

اس شعبے میں عمران اسلم (جیو کے پریزیڈنٹ) میری زندگی میں ملنے والے دوستوں میں بہت ہی محترم اور ناقابلِ فراموش انسان ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ بہت محبت سے سلوک کیا اور مجھے بھی ان پر بہت مان ہے۔ نور الہدیٰ شاہ میری فیورٹ ہیں، انھیں میں بچپن سے پسند کرتا ہوں وہ ایک اچھی ڈراما نویس اور بہت ہی عظیم انسان ہیں...... اور بھی بہت نام اور بہت سے لوگ ہیں، ان کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں، مگر مجھے لگتا ہے، ان سب کا حق ان صفحات میں ادا نہیں ہو سکے گا، اس لیے واپس چلتا ہوں بچوں کی طرف۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہم سب کراچی کے بچوں کے رسالوں کے مدیران اسلام آباد پہنچے۔ وہاں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

سالانہ ورکشاپ کے علاوہ بچوں کے رسائل پر مبنی ایک تنظیم سازی بھی ہونا تھی یا یوں کہیں کہ تنظیم پہلے سے تھی اس کا الیکشن ہونا تھا۔ اس الیکشن میں ہم نے جو تیاری کی تھی اس کے مطابق ہم سب محبوب الٰہی مخمور کو صدر یا جنرل سیکریٹری وغیرہ کے اہم عہدے پر منتخب کرانا چاہتے تھے۔ بچوں کے رسائل چوں کہ پنجاب سے زیادہ بڑی تعداد میں نکلتے تھے تو ہمیشہ وہیں سے صدر وغیرہ منتخب ہوا کرتے تھے۔ چناں چہ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس بار ہم سندھ اور کراچی کو یہ عہدہ دلوائیں گے۔ اس معاملے میں ایک جنرل میٹنگ ہوئی۔ اس میں مجھے سندھ سے اور پنجاب سے اختر عباس کو تقریر کرنے کا موقع دیا گیا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے موقف کو بڑے ولولہ انگیز انداز میں ڈائس پر پیش کیا۔ اور توقع تھی کہ اس سیشن کے بعد میری اور اختر عباس کی پکی دشمنی ہو جائے گی، لیکن جو نتیجہ نکلا، اس میں الیکشن تو لاہور کے کسی مدیر نے جیتا، مگر مجھے یہ سیشن اس لیے یاد ہے کہ یہاں سے مجھے ایک بہت ہی پیارا دوست اختر عباس کی صورت میں نصیب ہوا اور اس سارے سیشن کو میں دعائیں دیتا ہوں، جس نے مجھے اختر عباس دیا، جو اس وقت پھول رسالے کے مدیر تھے۔ یہ بہت ہی اچھا اور پڑھا لکھا انسان ہمیشہ بلندیوں پر رہتا ہے ان دنوں بھی اردو ڈائجسٹ کا مدیر ہے اور مجھے بہت عزیز ہے۔ اختر عباس نے صرف بچوں کے لیے ہی نہیں بڑوں کے لیے بھی بہت باکمال کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی بیش تر کتابیں میری پڑھی ہوئی ہیں اور ہمیشہ میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا پہلے سے زیادہ معترف ہو جاتا ہوں۔

مجھے آج بھی اختر عباس کا ایک جملہ یاد ہے۔ ہم دونوں اسلام آباد کے ایک بازار میں ایک ریسٹورانٹ پر ملے۔ یہ غالباً بلیو ایریا وغیرہ تھا۔ اختر اپنے لاہور کے دوستوں کے ساتھ نشست افروز تھے اور میں کراچی اور حیدر آباد کے دوستوں کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ تب تک ہم دونوں وہ دھواں دھار تقریریں کر چکے تھے، جس کے بعد مجھ سے میرے کراچی اور سندھ کے دوست بہت خوش تھے کہ میں نے اختر عباس کو بہت اچھا جواب دیا، جب کہ اختر عباس کی شعلہ نوائی پر ان کے رفقاء بے پناہ مسرور تھے کہ انھوں نے حنیف سحر کا بھرکس نکال دیا تھا۔ ہم وہاں سے گزر رہے تھے تو اختر عباس نے ہمیں بیٹھنے اور چائے پینے کی دعوت دی ہم بیٹھ گئے۔

اس بیٹھک میں میری اور اختر عباس کی انفرادی گفتگو بھی ہوئی تو انھوں نے کہا۔ ''یار لوگوں

نے ایویں تمہارے بارے میں ''ہوا'' بنایا ہوا ہے کہ تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ تم تو بہت ہی معصوم اور معاملہ فہم اور دوستی کے لائق انسان ہو۔''

میری رائے اختر کے بارے میں اس سے بھی زیادہ حساس تھی۔ میں نے ان سے اپنے دل کے جذبات کہے نہیں، پر انھیں محسوس ضرور کیا کہ یہ انسان اختر عباس اس قدر انسان دوست اور کشادہ دل ہے کہ اسے دل میں اور سر پر بٹھانا چاہیے۔ بہت ہی دل چسپ اور غیر معمولی خوبیوں کا مالک یہ انسان..... میرا بہترین دوست ہے اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔

ہم بعد میں بھی لاہور میں ملے اور اختر نے جو میری تواضع اور مدارات کیں، انھیں بھولنا میرے بس میں نہیں ہے۔ سارے لاہور کی کوئی مشہور اور خوش ذائقہ چیز ایسی نہ تھی، جو انھوں نے مجھے کھلا نہ دی ہو۔۔۔ اور وہ بھی ایسی غضب کی دل نوازی اور فسوں خیزی سے کہ مجھے بتانا ہی نہیں چلا کب میرا پیٹ داغ مفارقت دے گیا، لیکن کسر تکلف میں منع کرتا تھا اور وہ پیش بہا تکلف سے اسے درگزر کردیا کرتے تھے۔ بس نہ پوچھیں وہ وقت اتنا زیادہ ناقابل فراموش ہے۔ اتنی باتیں اور دلآویز ساعتوں کی ایسی اَن مٹ سوغاتیں ہیں، جو زندگی کی یادوں میں چمکتی رہتی ہیں۔ اس کے بعد بھی کوئی دو بار مزید میں اختر عباس سے لاہور میں ملا۔ ہر بار ان کا رویہ ایسا ہی تھا۔ میں ان کے گھر بھی گیا تو وہاں ایک پرتکلف عشائیہ میرا منتظر تھا، لیکن اس تقریب میں شہر کے مختلف شعبوں، ادب و صحافت کے اور بھی کئی دوست شریک تھے۔ اُن سے مل کر بھی دل باغ باغ ہو گیا۔ اب بھی وہ مجھے لاہور آنے کی دعوت دیا کرتے ہیں اور میں ہمیشہ سوچتا ہوں کاش ایک بار اور جا سکوں۔۔۔۔!

ایسا ہی میرا ایک دوست چینیوٹ میں ہے۔۔۔۔ مدثر حسن قاسمی۔ یہ مشہور اداکار ہیں اور ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی بناتے ہیں۔ بہت ہی پیارا انسان اور ایسا مخلص دوست کہ اس کے بدلے میں دنیا ملے تو بندہ لینے سے انکاری ہو جائے۔ مدثر حسن۔۔۔ جعفر قاسمی صاحب جیسے بلند پایہ ادیب اور مفکر و صوفی منش قدآور انسان کے فرزند ہیں۔ مدثر کو اندھیرا جالا نامی ڈرامے سے سب ہی پہچانتے ہیں کہ وہ ان کا ناقابل فراموش ڈراما ہے۔

اب کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں لکھ کر اس تحریر کو سمیٹتا ہوں۔ میری شادی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

1996ء میں ہوئی۔ ماشاءاللہ میرے چار بچے ہیں، تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام ''زیرک'' ہے، جو میٹرک میں کمپیوٹر سائنس میں زیر تعلیم ہے۔ دوسرے کا نام حماد سارنگ ہے (جماعت ہشتم) اور تیسرے کا نام ایقان ہے (جماعت پنجم) سب سے چھوٹی بیٹی ہے اس کا نام حورامریم ہے'' (کلاس تھرڈ) ''مریم'' میری ماں کا بھی نام تھا۔ انسان اپنی بساط میں جتنی محبت اپنی ماں سے کرسکتا ہے وہ میں نے اپنی ماں سے کی۔ یوں سمجھیں میں اپنی ماں کے بغیر اس اتنی بڑی دنیا میں اکیلا ہوگیا، جب وہ مجھے چھوڑ کے گئیں۔ اُن کا غم میری زندگی کا سب سے بڑا غم ہے۔ والد کی وفات بھی میرے لیے کسی سانحہ سے کم نہیں تھی، لیکن میں اپنی ماں سے اتنا زیادہ قریب تھا کہ میرے باقی بھائی میری ماں کو اس طرح کا طعنہ بھی کبھی دے دیا کرتے تھے کہ ''تم تو صرف حنیف کی ماں ہو'' میری ماں نے اپنے سب ہی بچوں میں شاید مجھ سے سب سے زیادہ محبت کی۔

میری بیوی ایک بہت ہی نیک عورت ہے۔ وہ بھی رائٹر ہیں، مگر بہت ہی کم لکھتی ہیں انھوں نے ڈائجسٹوں میں کچھ کہانیاں لکھی ہیں، جن میں دوشیزہ، سچی کہانیاں، ناز نین اور کرن شامل ہیں۔ ہمارے بچوں سے وہ اتنی زیادہ منسلک ہیں کہ ان کے لیے لکھنا تو کیا کچھ بھی چھوڑ سکتی ہیں۔ مجھ سے بھی بہت محبت ہے انھیں اور میرے ہر اچھے برے وقت میں میرے ساتھ کھڑی رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔۔۔ جو کسی کے لیے بھی حیرت کا مقام ہوسکتا ہے۔

آخری انسان جس کے بغیر میری زندگی کی کوئی بھی تحریر کبھی مکمل نہیں ہوسکتی وہ میرا دوست عدیل رزاق ہے۔۔۔ ٹی وی ڈرامے میں اُبھرتا ہوا ایک نام۔۔۔ جن کے بہت سے انفرادی ڈرامے ہم نیٹ ورک سے دکھائے جاچکے ہیں۔ گزشتہ برس ایک ڈراما سیریل ''جیا نہ جائے'' کے عنوان سے دکھایا جاچکا ہے اور اب بھی وہ ہم ٹی وی کے لیے کئی ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ یوں کہوں گا اس انسان کے لیے میرے جذبات ایسے ہیں کہ الفاظ ان معنوں کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اب پھر میں محمود شام جیسے عظیم انسان کے ساتھ ایک میگزین میں شامل ہوں۔ ہر چند کہ ایسی باتیں بچوں کے لیے نکلنے والے کسی میگزین میں کہنے جیسی تو نہیں ہیں پر یوں سمجھیں کہ بعض لوگ ایسے ہوتے

ہیں جنھیں زندگی کبھی راس نہیں آتی اور ایسا لگتا ہے جیسے۔۔۔۔۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں!

محبوب الٰہی مخمور نے میری آپ بیتی پڑھ کر کہا کہ اس میں بچوں کے ادیبوں اور ادب کے حوالے سے کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے، اس لیے میں کچھ اور بھی لکھوں۔

میں نے دانستہ بہت سی باتیں لکھنے سے احتراز کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے بہت کچھ ایسا تلخ بھی ہے، جس کا لکھنا مجھے کچھ مناسب نہیں معلوم ہوا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں نے جو بھی زندگی لکھنے کے حوالے سے گزاری ہے، اس میں میرا رویہ تنقید ہی زیادہ رہا ہے اور تنقید کو پاکستان جیسے معاشرے میں کبھی پسند ہی نہیں کیا گیا۔ زیادہ تر لوگ تنقید کو ذاتیات پر حملہ سمجھتے ہیں اور لکھنے والے کے ہمیشہ کے لیے دشمن بن جاتے ہیں۔ یہ بات میری زندگی میں کئی تجربوں کی صورت مجھے حاصل ہوئی اور میں نے سوچا کہ ساری زندگی اتنی عرق ریزی سے چیزوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جب کوئی ان کی خامیوں اور غلطیوں کی طرف توجہ دلاتا ہے تو لوگ اور متعلقہ شعبے بجائے اس کے کہ اس کا شکریہ ادا کریں اور مزید بہتری کی طرف رجوع کریں وہ آستینیں چڑھا کر اپنے دفاع پر اُتر آتے ہیں اور جس قوم کا ہر فرد خود کو ہی عقل کل مانتا ہو اور کسی دوسرے کی رائے کی اس کی نظر میں کوئی حیثیت ہی نہ ہو اس قوم میں تنقید کا پیشہ اختیار کرنا دیوانگی ہے، کیوں کہ اس سارے عمل میں سب سے زیادہ نقصان تنقید کرنے والے کا ہی ہوتا ہے۔ لوگ اس سے دور دور رہتے ہیں۔ وہ کسی محفل میں چلا جائے تو اسے دیکھتے ہی ایسے چپ سادھ لیتے ہیں جیسے کسی دشمن ریاست کے جاسوس کو دیکھ کر احتیاط کی جاتی ہے۔ تو پھر کوئی بھی تنقید نگار یہ کارِ عبث کرے ہی کیوں۔۔۔؟ قصیدے اور لاف وگزاف اور تعریفوں کے خیالی پلوں پر چڑھنے اور چڑھانے میں کہیں زیادہ فائدہ بھی ہے اور یہ زیادہ آسان بھی ہے تو پھر کیوں نا یہی کیا جائے۔

ہر چند کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد بھی مجھ سے لوگوں کی جھوٹی تعریف نہیں ہوتی، میں لکھ ہی نہیں پاتا، البتہ جو بات میرے دل سے نکلتی ہے اور مجھے واقعی اپنے اندر سے تحریک ملتی ہے کہ میں کسی کام یا کسی فرد کی تعریف کروں تو وہ میں نے اس آپ بیتی میں کردی ہے۔ پھر جیسا کہ محبوب

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

الٰہی مخمور نے کہا ہے کہ میں اور لکھوں اور بچوں کے ادیبوں کے بارے میں لکھوں تو کچھ اور کوشش کیے لیتا ہوں شاید کچھ اور ایسا آپ کو دے سکوں جس کا پڑھنا آپ کے لیے سود مند ہو۔

ایک تو مجھے وہ واقعہ یاد آرہا ہے جب اسلام آباد کی ورک شاپ میں رسائل کی تنظیم کا الیکشن تھا اور ہم نے اس الیکشن کافی تیاری کی تھی ووٹ سے انتخاب ہونا تھا، لیکن مجھے کچھ لوگوں کے حوالے سے تحفظات تھے اور میں سمجھتا تھا کہ وہ عین وقت پر ایسا نہ ہو کہ محبوب الٰہی مخمور کو ووٹ نہ دیں۔ میں اس ٹرپ میں اسکول لائف کی طرف سے جا رہا تھا، جب کہ مسرور راؤ صاحب ٹوٹ بٹوٹ کی طرف سے جا رہے تھے۔ مجھے کسی نے کہا کہ نٹ کھٹ حیدر آباد کے وسیم احمد خان..... ہوسکتا ہے انتخاب کے وقت ہمارا ساتھ نہ دیں۔ یہ بات میں نے وسیم سے ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد کہی۔ مجھے وسیم کے جواب کی وجہ سے وہ بات یاد رہ گئی۔

وسیم نے کہا تھا "یار تم ہمارے لیڈر ہو اور تم کہو تو میں جہاز سے کود جاؤں؟"

میں نے کہا۔ "بس کافی ہے۔"

کہنے والے کو میں نے بتا دیا اور اسے اطمینان ہو گیا۔ اسی طرح انتخاب کے وقت مجھے کسی نے کہا کہ راؤ صاحب ٹوٹ بٹوٹ کے نمائندے۔۔۔ ہوسکتا ہے ہمیں ووٹ نہ دیں اور اس طرح ہم ہار سکتے ہیں۔ میں نے راؤ صاحب سے اس تحفظ کا اظہار کیا تو انھوں نے جو کہا۔ وہ بھی مجھے کبھی بھول نہیں سکا۔

وہ بولے "صرف یہی نہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں ووٹ دوں گا، بلکہ یہ بھی یاد رکھو تم راجپوت ہو اور میں بھی راجپوت ہوں۔ ہم جان ہار سکتے ہیں..... وعدہ نہیں ہارتے۔"

لہٰذا انھوں نے اپنی بات کو اس طرح ثابت کیا کہ اپنا ووٹ ہمارے سب ساتھیوں کو دکھا کر دیا، جس کا مطلب تھا اب ان پر ایک نقطے برابر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پھر بھی مجھے لگا کہ ہم الیکشن ہار جائیں گے۔ لہٰذا میں نے سب کو بتا دیا کہ جیسے ہی میں الیکشن کا بائیکاٹ کروں، سب میرے ساتھ اٹھ کر آجائیں۔ ہماری یہ حکمت عملی اس طرح سے کامیاب رہی کہ اس میٹنگ میں الیکشن نہیں ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ چھ مہینے کے لیے ایک کنوینر بنایا جائے گا، جو چھ مہینے میں آئین بنائے گا اور اس آئین کے مطابق انتخابات کرائے جائیں گے۔ یہ تجویز ہم نے بھی مان لی اور اب

ہماری کوشش تھی کہ کنوینر کا الیکشن ہم ہی جیتیں، اس کے لیے ہم نے محبوب الٰہی مخمور کا نام تجویز کیا اور ان کے مقابل کھڑے ہوئے شعیب مرزا۔

مجھے لگا کہ ہم کنوینر کا الیکشن بھی ہار جائیں گے، کیوں کہ عددی طور پر ہماری تعداد کم تھی، لیکن اس وقت مجھے محبوب الٰہی مخمور نے بتایا کہ شعیب مرزا ان کے بہت اچھے دوست ہیں اور انھوں نے محبوب سے وعدہ کیا ہے کہ وہ محبوب الٰہی مخمور کے حق میں دست بردار ہو جائیں گے، اس طرح ہم یہ الیکشن جیت جائیں گے۔ میں نے یہ بات مان لی الیکشن ہونے دیا۔ عین موقع پر شعیب مرزا نے دست برداری سے انکار کر دیا اور یوں ہم وہ الیکشن ہار گئے۔

محبوب الٰہی مخمور کو شعیب پر بہت غصہ آیا کہ اس نے انھیں دھوکا دیا تھا اور انھوں نے یہ بات تسلیم کی کہ میری بائیکاٹ والی حکمت عملی زیادہ ٹھیک تھی۔ (مجھے ہوسکتا ہے کچھ باتیں ٹھیک ٹھیک یاد نہ ہوں۔۔۔) خیر اس کے بعد ہم کراچی آگئے۔ چھ مہینے بعد الیکشن کراچی میں ہوا اور پنجاب سے اور ملک کے دیگر حصوں سے بچوں کے رسائل کے ایڈیٹرز کو کراچی لایا گیا اور یہاں ایک دن کے قیام میں کچھ اور باتوں کے علاوہ الیکشن کا ہونا بھی قرار پایا۔ ہم نے پھر یہ سوچ رکھا تھا کہ اپنی حکمت عملی سے ہم یہ الیکشن جیتیں گے اور اس بار پھر سب سے وفاداری کا اقرار لیا گیا۔ مجھے یہ یاد نہیں آرہا کہ ان انتخابات میں مجھے کس عہدے پر کھڑا کیا جا رہا تھا، لیکن یہ بات طے تھی کہ ہمارے سب ساتھی مجھے ہی منتخب کرانا چاہتے تھے یا پتا نہیں کسی اور کو، لیکن علی حسن ساجد پر ہم میں سے کوئی ایک بھی تیار نہیں تھا کہ انھیں کسی عہدے پر منتخب کرایا جائے، مگر جو ہوا..... وہ ملاحظہ کیجیے۔

حسب دستور ہم تعداد میں کم تھے اور انتخابات میں ہماری شکست یقینی تھی، لیکن ہم بضد تھے کہ اگر ایسا ہی رہا تو اس تنظیم کا صدر یا اہم عہدے دار کبھی بھی سندھ سے منتخب نہیں ہو سکے گا اور یہ عہدہ ہمیشہ پنجاب کے پاس رہے گا۔ یہاں صوبائی تعصب کا کوئی ہلکا سا شائبہ تک بھی موجود نہیں ہے، یہ محض کارکردگی کا مسئلہ تھا، ورنہ سندھ سے بھی ایسے لوگ منتخب کرائے جا رہے تھے جو پنجابی ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ صرف اور صرف کارکردگی کا ہی مسئلہ تھا اور تعصب کے بارے میں کوئی لہر نہ ہماری طرف موجود تھی نہ اُن کی طرف۔۔۔ الیکشن سے پہلے ایک عام اجلاس ہوا جس میں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

نامزدگیاں ہونا تھیں اور کافی بحث وتمحیص کے بعد افتخار کھوکھر جو شعبہ بچوں کا ادب کے انچارج تھے، ان کے ایک جذباتی ڈائیلاگ پر کہ پنجاب والے قربانی دینا جانتے ہیں، لہٰذا پنجاب والے سب الیکشن سے دست بردار ہو گئے اور سندھ سے افتخار کھوکھر صاحب نے علی حسن ساجد کو صدر کے لیے نامزد کر دیا۔ وہ مجھے کسی بھی صورت میں اس تنظیم کا صدر دیکھنا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا انھوں نے ایک ایسے شخص کو صدر بنایا، جو کسی بچوں کے رسالے کا ایڈیٹر اس وقت نہیں تھا بھلے ہی اس کا تعلق سندھ سے تھا اور وہ ہم میں سے تھا، مگر اس انتخاب پر ہم ناخوش تھے ہمیں لگتا تھا یہ وہ نہیں ہوا جو ہم چاہتے تھے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ بچوں کے رسائل کے پنجاب کے سارے ایڈیٹرز کھوکھر صاحب کے کہنے پر کیسے اور کیوں دستبردار ہو گئے۔ اس کا مطلب ہے تنظیم کبھی بھی آزادانہ کام نہیں کر سکی اور وہ کھوکھر صاحب کے کہنے پر۔۔۔یس اور نو۔۔۔کرتی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے یہ تنظیم کبھی کوئی اچھی پرفارمنس نہیں دے سکی اور بس ہمیشہ نام نہاد ہی رہی۔۔۔تنظیم کو کسی بھی ادارے کی محتاجی سے نکالنا چاہتا تھا تاکہ اس کا اپنا آزادانہ تشخص ہو اور یہ خود اپنی حیثیت میں کام کرے۔۔۔لیکن یہ بات بعض لوگوں کو منظور نہ تھی میرے ساتھی، البتہ میری بات سے نہ تھے صرف متفق تھے، بلکہ وہ سب بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔۔۔علی حسن میرا بھی اچھا دوست ہے۔ مجھے اس پر بہت مان ہے اور ہم ہمیشہ بہت اچھے دوستوں کی طرح رہے ہیں مگر مجھے اس انتخاب پر اعتراض تھا میں نے علی حسن سے کہا کہ وہ یہ عہدہ قبول نہ کریں۔۔۔اور انکار کر دیں۔۔۔لیکن انھوں نے میری بات نہیں مانی ایسا ہی میں نے حیدرآباد کے وسیم خان سے بھی کہا کہ وہ اپنا عہدہ چھوڑ دیں، مگر انھوں نے بھی میری بات نہیں مانی۔۔۔صرف محبوب الٰہی مخمور وہ واحد فرد تھا، جس نے میری بات پر فوری لبیک کہا۔۔۔حالاں کہ محبوب وسیم کے مقابلے میں زیادہ بڑے عہدے پر نامزد ہوا تھا۔ اس نے میری بات سن کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا استعفیٰ لکھ کر مجھے دے دیا کہ میں اسے کسی کو بھی دے سکتا ہوں۔۔۔یوں سمجھیے کہ محبوب وہ واحد باشعور انسان تھا جو جانتا تھا کہ حلیف سحر کے ہاتھوں میں تنظیم رہی تو ہم کچھ کر پائیں گے ورنہ ہماری کارکردگی اس سے بھی زیادہ خراب ہو گی جیسی اس سے پہلے والوں کی رہی ہے۔۔۔اور ایسا ہی ہوا بھی۔۔۔پورے دو سال اگر کوئی چھوٹا موٹا پروگرام ہوا بھی تو وہ میں نے ہی منعقد کرایا تاکہ علی

حسن ساجد پوری طرح ناکام نہ کہلائیں اور اسے تنظیم کی کارکردگی کا نام دے دیا، ورنہ یہ دور سابقہ ادوار کی طرح ہی غیر متحرک اور افسوس ناک ثابت ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا معاملہ تھا، صرف اتنا یاد ہے کہ ایک اور ایسا موقع آیا، جب پنجاب کے دوستوں میں ایکا نہ رہا اور وہ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔

ہم اسلام آباد پہنچے تو اس سال بھی الیکشن ہوتا تھا۔ وہ ہی مرزا شعیب، جو پہلے کے اعتماد کا خون کر چکے تھے۔ میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ اس بار وہ تنظیم کا الیکشن جیتنا چاہتے ہیں، جب کہ کھوکھر صاحب..... قاسم محمود کو صدر بنانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے جو سیاق و سباق مجھے بتایا تھا، اس کی رو سے مجھے شعیب مرزا۔۔۔قاسم محمود صاحب سے زیادہ موزوں معلوم ہوئے، حالاں کہ میں قاسم محمود صاحب کی نہ صرف عزت بہت کیا کرتا تھا، بلکہ جب وہ کراچی میں نیو کراچی علاقے سے "شاہ کار" کے زیر اہتمام کتابیں چھاپا کرتے تھے۔ تب سے میں ان سے ایک خاص محبت اور انسیت رکھتا تھا۔ ان کی سب کتابیں بھی بڑے شوق سے خرید کر پڑھا کرتا تھا اور میں ان کی خدمات کا دل سے قائل رہا ہوں، لیکن اس الیکشن میں مجھے مرزا شعیب ہی حق پر نظر آئے اور یوں میرے سب ساتھیوں نے میرے کہنے پر مرزا شعیب کو الیکشن جتوا دیا، لیکن قاسم محمود صاحب کو بھی صدر بنایا گیا۔ پتا نہیں یہ کس طرح ہوا، لیکن اب لاہور میں تنظیم کے دو صدر تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد قاسم محمود صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ اس بار تنظیم آپس کی ناچاقیوں اور اختلافات کی وجہ سے کوئی کام نہیں کر سکی، تاہم شعبہ بچوں کا ادب بین الاقوامی یونیورسٹی نے بچوں کے ادب اور رسائل کے لیے بہت کام کیا۔

محمد عادل منہاج۔۔۔بچوں کا ایک ادیب اور بے پناہ ذہین بچہ۔ یہ مجھے چائلڈ اسٹار کے زمانوں میں ملا تھا۔ میں نے اس کا انٹرویو بھی چائلڈ اسٹار میں شائع کیا تھا۔ بعد میں اس سے بہت سی ملاقاتیں رہیں، حتیٰ کہ میں اس کے گھر واقع نیو کراچی بھی گیا تھا، جہاں مجھے اس کے والد کی کہی ہوئی وہ بات آج بھی یاد ہے۔

انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ "بیٹا یہ عادل ہر وقت پڑھتا لکھتا رہتا ہے۔ کسی سے ملتا جلتا نہیں کہیں آتا جاتا بھی بہت کم ہے۔۔۔اسے اپنے ساتھ ذرا باہر لے جایا کرو اور اسے باہر نکلنے کی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

عادت ڈالو۔"

میں ان کی بات سن کے بہت حیران ہوا کہ لوگ تو اپنے۔۔۔۔ بچوں کو باہر جانے سے منع کرتے ہیں، مگر عادل اتنا پڑھا کو تھا کہ اس کے والد الٹا اسے گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح عادل میرے گھر آنے جانے لگا۔ یہ ایسا ہونہار اور لائق بچہ تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس کے دو ناول شائع ہو چکے تھے اور بورڈ کے امتحانات میں اس نے پوزیشن حاصل کی تھی شاید کئی بار۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ بڑے ہو کر اسے ایٹمی پلانٹ میں جاب ملی اور اب وہ ایک لائق سائنس داں ہے۔ سن کر بڑی مسرت ہوئی۔ میری اس سے طویل عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خدا کرے جہاں بھی ہو بہت اچھا ہو۔۔۔۔ اس کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے اس نے مجھے ایک بار سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ آپ کیسے ادیب ہیں، جو برائی آپ کے اپنے اندر ہے اس سے آپ لوگوں کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ ہر چند کہ میں نے اس پر لکھنے کے عمل کو اور عملی زندگی کو الگ الگ ثابت کرنے کی کافی کوشش کی تھی، مگر مجھے لگا اس پر میری دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔۔۔ اور وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا تھا۔ بہت جلد میں اس کی بات کو درست تسلیم کر چکا تھا، جو برائی آپ میں خود موجود ہو اس سے کسی دوسرے کو روکنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ وہ پوری طرح صحیح تھا اور میں غلط تھا۔

حیدرآباد کا ایک ادیب حفیظ الرحمٰن خان زادہ تھا۔ اس کی کہانیوں نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے چند ہی کہانیاں لکھیں، مگر وہ سب بہت اچھی اور نپے تلے انداز میں لکھی گئی تھیں۔ میری اس سے حیدرآباد میں اس کے گھر اور نوٹ بنوٹ ایوارڈ کی تقریب میں ملاقاتیں ہوئیں، کیوں کہ اس نے بھی نوٹ بنوٹ ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ بعد میں یہ لڑکا شطرنج کا بہت اچھا کھلاڑی بنا۔ غالباً سندھ کا چیمپئن بھی رہا ہے۔ ایک بار جب وہ شطرنج کے ٹورنامنٹ میں کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا تو میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کسی طرح رابطہ کر کے مجھ سے ملنا چاہا تھا۔ بہت ہی ذہین اور باکمال لڑکا تھا۔

نوٹ بنوٹ کا پہلا ایوارڈ یافتہ ادیب ظفر رفیق صدیقی بھی بہت ذہین طالب علم تھا۔ اس نے بھی بورڈ کے امتحانات میں پوزیشن حاصل کی تھی اور کہانیاں بھی بہت ہی اچھی اور دل چسپ لکھا

کرتا تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ بعد میں وہ مجھے کراچی یونی ورسٹی میں ملا تھا، جہاں سے وہ ماسٹرس کر رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ حکومت کے کسی بہت اہم ادارے میں کوئی بیوروکریٹ وغیرہ بن چکا ہے۔

میرے قریب ترین دوستوں میں مصطفیٰ چانڈیو بھی رہے ہیں۔ وہ بہت اچھا لکھا کرتا تھا اور میں اس کی کہانیوں سے کافی متاثر تھا۔ پھر ہماری دوستی ہو گئی۔ مصطفیٰ ہاشمی کو میں نے جو کچھ دیا، خلوص نیت سے دیا۔ اس نے بھی ایسا ہی سلوک کیا میرے ساتھ کیا۔ ہم بہت عرصے تک ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ مختلف مجالس اور اپنے اپنے شعبوں میں۔ یہ دوستی ایسی رہی ہے کہ اگر میں کہیں جا رہا ہوں تو مصطفیٰ ہاشمی اس کے باوجود جانے پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ جانا نہ چاہتا ہو۔ بہت مخلص اور اچھا انسان ہے۔

محبوب الٰہی مخمور کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ دوستوں کا دوست اور غم ٹھونک کے کھڑے ہونے والوں میں سے ہے۔ کسی موقع پر اگر مجھے کسی پر اعتبار کرنے کی ضرورت بھی پڑی تو محبوب الٰہی کی ضمانت میرے لیے کسی ایمان کی طرح ہوتی تھی۔ اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کی ایسی زبردست خوبی محبوب الٰہی میں پائی جاتی ہے کہ میں نے اسی سے سیکھا کہ ہم ہمیشہ صحیح نہیں ہوتے۔ آج بھی جس بات کو محبوب الٰہی ٹھیک کہے سمجھو..... مجھے اس بات پر سو فیصد یقین ہوتا ہے۔ اس کا دل بہت وسیع ہے اور اس کا شعور بھی میرے لیے حیران کن رہا ہے۔ جہاں کوئی بھی میرے ساتھ نہیں ہوتا تھا وہ وہاں بھی میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہوتا ہے اور میں اس کی اس خوبی کو آج تک سمجھ نہیں سکا۔ جو بندے سمجھ نہ آئیں وہ اللہ کے پراسرار بندے ہوتے ہیں اور ایسے انسانوں کو زمانہ کبھی بھول نہیں سکتا۔ جیسے الیکشن کے موقع پر جب سب سے مستعفی ہونے کو کہا تو وہ اکیلا تھا، جس نے بنا کوئی لمحہ ضائع کیے اپنا استعفیٰ میرے حوالے کر دیا تھا۔ میں آج تک اس کی اس جرات کو بھول نہیں سکا، حالاں کہ ہم سب میں اس کی پوزیشن، حجم اور بچوں کے رسائل کے حوالے سے ہمیشہ زیادہ مضبوط اور مستحکم رہی ہے۔ وہ ہمیشہ انسانوں کی خوبیوں کی قدر کرتا ہے اور یہ خوبی اس نے اپنے والد الٰہی بخش چشتی تونسوی سے سیکھی ہے کہ کس طرح انسانوں کے کام آنے کے لیے اپنے مفاد کی پروا نہیں کرتے۔ وہ ہی ہوتے ہیں بڑے اور عظیم لوگ۔۔۔!

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میں یہ کہنا چاہوں گا جس طرح ہم من حیث القوم اپنے مستقبل کی پروا نہیں کرتے۔ اسی طرح پاکستان میں بچوں کے ادب کی کوئی پروا کبھی کسی نے نہیں کی۔ بچوں کے لیے لکھنا ایک جہاد ہے، جس میں سب کچھ قربان ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو جان بھی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس شعبے کے شہیدوں کو شہید کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ اس کے باوجود اگر کچھ محبوب الٰہی جیسے لوگ اس کام کو کیے جا رہے ہیں تو سمجھیں کہ دیوانوں کے سر میں سودا سمایا ہوتا ہے۔ یقین جانیے..... دنیا کو جینا فرزانوں سے زیادہ دیوانوں نے ہی سکھایا ہے، ورنہ سچ کے لیے زہر کا پیالا پینا فی زمانہ عقلمندی نہیں بے وقوفی ہے۔۔۔ اسی لیے میں اکثر سوچتا ہوں یہ دیوانے نہ ہوتے تو سچ کہاں ہوتا..... کہاں۔۔۔۔؟؟؟

آپ بیتی مزید لکھ کر دے دی۔ تب بھی محبوب الٰہی کا یہ اصرار باقی رہا کہ ابھی اور لکھوں۔ اس عرصے میں مجھے ڈاک سے محبوب کے بھیجے ہوئے کچھ میگزین ملے۔ یہ انوکھی کہانیاں کے پانچ شمارے تھے اور ایک خوف ناک کہانیوں کا مجموعہ تھا۔ ان پانچ شماروں میں جن دو کہانیوں کی آپ بیتی چھپی ہوئی ہے۔ ان میں محبوب الٰہی مخمور، خلیل جبار، پیر نوید شاہ ہاشمی اور یاسمین حفیظ شامل ہیں۔ میں نے ابھی صرف یاسمین حفیظ کی آپ بیتی پڑھی ہے۔ اس میں اور باتوں کے بارے میں کچھ مجھے نہیں کہنا۔ سب کچھ بہت اچھا ہے۔ بس ایک بات کے بارے میں یاسمین کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ الحمرا اکیڈمی کے زیر اہتمام گورنر سندھ نے جو ایوارڈز دیے۔ اس سلسلے میں ہونے والے اجلاس میں ادیبوں کے جو نام مانگے گئے تھے، اُن میں یاسمین نے میرا نام لکھا۔ اس محبت خلوص اور دوستی کے لیے یاسمین کا ڈھیروں ڈھیر شکریہ۔۔

باقی دوستوں کو میں بتاؤں کہ اس ایوارڈ میں..... میں نے حصہ ہی نہیں لیا تھا، حالاں کہ مجھے اس ایوارڈ میں شامل کرنے کے لیے علی حسن ساجد نے..... جو مذکورہ اکیڈمی کے روح رواں ہیں، بڑی محنت کی۔ وہ مجھے قائل کرنے کے لیے کئی کئی گھنٹے مجھ سے فون پر بات کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ ایسے کئی موقع آئے جب انھیں فون پر بات کرتے ہوئے رات کے دو بھی بج جایا کرتے تھے اور میں ان سے کہا کرتا تھا۔ اب سو جاؤ۔۔۔ تم مجھے قائل نہیں کر سکو گے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب پی ٹی سی ایل کے زمینی فون کی ایک کال کا دورانیہ دو گھنٹے بھی ہو تو وہ پانچ روپے کی ایک ہی کال شمار ہوا کرتی تھی۔ علی حسن مجھے قائل نہیں کر سکے۔ مجھے اس قسم کے پیغامات

بھی ملے کہ مجھے گورنر کے ملٹری سیکریٹری سے ملاقات کرا کے یہ ضمانت دلوائی جا سکتی ہے کہ مجھے یہ ایوارڈ لازمی دیا جائے گا، اس کے باوجود میں نے یہ ایوارڈ لینے سے انکار کیا اور اپنا بایوڈیٹا اس مقابلے میں اس کے باوجود شامل کرنے کو نہیں بھیجا کہ میرے علم میں یہ بات بھی لائی گئی کہ سندھ بھر سے کوئی قابل ذکر بچوں کا ادیب ایسا نہیں ہے، جو اس مقابلے میں شامل نہ رہا ہو اور اس نے اپنا بایوڈیٹا نہ بھیجا ہو۔ جب علی حسن مجھے یہ بات بتا رہے تھے تو میں نے ان سے کہا ایک تو ایسا ہے، جس نے تمھیں بایوڈیٹا نہیں دیا اور وہ حنیف سحر ہے۔

مجھے زندگی میں بہت ایوارڈ اور اعزازات ملے ہیں، مگر ان سب کا تذکرہ میں یہاں کرنا مناسب نہیں سمجھتا، کیوں کہ وہ زیادہ تر بڑوں کے حوالے سے ہیں۔ بچوں کے حوالے سے ایک بار ڈان گروپ کے اخبار حریت نے کہانی مقابلہ کرایا تھا تو اس میں مجھے دوم انعام دیا گیا تھا۔ اسی طرح ٹوٹ بٹوٹ ایوارڈ جو میرے ہی دور میں شروع ہوا اس کے بارے میں..... میں نے سنا ہے کہ میرے بعد آنے والے بعض ایڈیٹرز کو یہ ایوارڈ اس وقت ملا، جب وہ خود ٹوٹ بٹوٹ کے ایڈیٹر تھے۔ میں نے ایسی کوئی کوشش کبھی نہیں کی۔ مجھے اس کے علاوہ جو بھی ایوارڈ یا انعامات ملے ہیں، ان میں سے بیش تر مجھے یاد نہیں ہیں۔ یہ سب باتیں بھی میں محبوب الٰہی کے کہنے پر یاد کر کے کئی نشستوں میں لکھ رہا ہوں۔

میں ہونہار کے علاوہ کتنی ہی تنظیموں کا صدر اور جنرل سیکریٹری رہا ہوں۔ ایک بار شاہین ادبی سوسائٹی نے انعامات اور اعزازت لکھنے والوں اور طالب علموں کو دیے۔ وہ تقریب کراچی آرٹس کونسل میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے مہمان خصوصی اس وقت کے سینیٹر اور وزیر جاوید جبار تھے اور صدارت صوبائی وزیر حافظ تقی مرحوم نے انجام دی تھی۔ اس وقت میں اس تنظیم کا سیکریٹری جنرل تھا۔ یوں سمجھیے..... مجھے اتنے اعزازات نہیں ملے جتنے مختلف حوالوں سے میں نے خود تقسیم کیے اور کروائے ہیں۔

آفتاب عالم قریشی حیدر آباد کے بچوں کے ادیب تھے۔ انھوں نے بھی ٹوٹ بٹوٹ میں کئی اچھی کہانیاں لکھیں اور مجھے لگتا ہے، انھیں ٹوٹ بٹوٹ کا ایوارڈ بھی ملا، جیسے یاسمین حفیظ کو بھی یہ ایوارڈ مل چکا ہے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

عبدالعزیز مرحوم کو بھی میں نے ہی متعارف کرایا تھا۔ یہ مصطفیٰ ہاشمی کے ساتھ کالج میں پڑھا کرتے تھے اور مصطفیٰ ہاشمی ہی انھیں اپنے ساتھ میرے پاس لائے تھے۔ پھر جیسے ان سے میری دوستی بہت اچھی رہی۔ انھوں نے ٹوٹ بٹوٹ میں بہت لکھا۔ بعد میں انھوں نے اور میں نے بچوں اور بڑوں کی بہت سی ادبی نشستیں منعقد کیں اور ان ادبی نشستوں میں بہت سے ادیبوں نے بہت اچھی اچھی کہانیاں پڑھیں۔ بڑی اچھی روایتیں تھیں، جو اب زمانے کے چلن میں کہیں معدوم ہو گئیں۔ ان ادبی نشستوں میں کاشان فیملی نے بھی بہت حصہ لیا اور ان کے گھر بھی کئی ادبی نشستیں بڑی بارونق اور دلچسپ رہیں۔ سب ہی بچوں کے لکھنے والے ان نشستوں میں بھی شریک رہے ہیں اور بڑی طولانی گفتگو اور بحثیں یہاں جاری ہوئیں۔

ان وقتوں میں جو بات مجھے سب سے زیادہ دل چسپ معلوم ہوتی تھی اور اب بھی میں ان باتوں کو سوچ کر ہنس دیتا ہوں، وہ یہ کہ ان میں سے بیش تر ادیب مجھے کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے میری حیثیت کسی بے کار آدمی کی سی تھی، لیکن مجھے ان کی باتیں سن کر بڑا لطف آیا کرتا تھا۔ میں ہوں تو اب بھی کچھ نہیں۔ آدمی ہے ہی کیا..... پانی کا بلبلہ.....

مگر اب بہت سے ادیب دوست میری عزت کرتے ہیں، پتا نہیں کیوں۔ میں ان سب کا احسان مند ہوں۔ اس زمانے میں کسی شریف آدمی کی دستار سلامت ہے تو اس سے بڑا خوش نصیب کوئی نہیں ہے۔ میں کم سے کم اس معاملے میں شاید خوش قسمت ہوں یا جانے یہ بھی میری خوش فہمی ہی نہ ہو۔ ویسے میں خوش فہم انسان ہوں تو نہیں، کیوں کہ جتنے خواب میں نے دیکھے سب صحرا کی دھول ثابت ہوئے، اسی لیے سب انسانوں اور خاص طور سے دوستوں کے خوابوں کے لیے دعا کرتا ہوں کہ وہ سب کے سب پورے ہوں اور سب آسمان پر ستاروں کی طرح چمکتے رہیں، صالحہ صدیقی بھی ایک اچھی لکھنے والی تھیں۔ ان کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ اب بھی اپنے پرانے ساتھیوں کو یاد رکھتی ہیں، بڑے خلوص سے پیش آتی ہیں۔ گذشتہ دنوں میں نے اور یاسمین حفیظ نے اُن کے گھر لنچ کیا اور بڑی خوش ذائقہ بریانی اڑائی۔

محبوب الٰہی کی میری نظر میں بڑی قدر ہے۔ کبھی زندگی نے موقع دیا تو اس شخص کے بارے میں اس کا شخصی کا خاکہ لکھوں گا، اس لیے کہ بچوں کے رسائل نکالنے والوں میں یہ واحد انسان ہے

جس نے اپنی جوانی اس شعبے کو دی ہے۔۔۔۔۔ انوکھی کہانیاں۔۔۔ واحد آزاد اور اپنے خود کے وسائل پر نکلنے والا رسالہ ہے، جو عرصہ دراز سے نا صرف نکل رہا ہے، بلکہ اس مستقل مزاجی سے نکل رہا ہے کہ اس میں کبھی تعطل نہیں آیا اور یہ محبوب کی لگن اور سچائی کا بہت بڑا ثبوت ہے، ورنہ مجھ سمیت سب ہی اس راہ میں پچاڑیں کھا کھا کے گرے اور سنبھل نہ سکے یا پھر ایسے رسائل قائم و دائم ہیں، جن کے پیچھے یا تو کوئی مضبوط ادارہ ہے یا پھر کوئی تنظیم ان کی مالی معاونت کرتی ہے، ورنہ اپنی مدد آپ پر نکلنے والا ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے، جو محبوب الٰہی اور انوکھی کہانیاں کی ہمسری کر سکتا ہو۔ یہ محبوب کا بہت بڑا کام ہے، جس کی قدر کرنی چاہیے۔ یہ محبوب الٰہی جیسے انسانوں کے لیے کہا گیا ہے شاید۔۔۔۔۔

ہم وہ دیپک ہیں جو آندھی میں جلا کرتے ہیں
ہم وہ غنچے ہیں جو بجلی پر ہنسا کرتے ہیں
آج ہر موڑ پہ لکھیں گے کہانی اپنی
اپنی دھرتی میں سمو دیں گے جوانی اپنی

بچوں کے ادب کی دھرتی میں محبوب الٰہی نے واقعی اپنی جوانی سمو دی ہے۔ میں نے زیست کے بڑے گرم سرد جھیلے اور کم سے کم دو بار لکھنے سے توبہ بھی کی۔ ایک بار کا یاد ہے، جب مظہر یوسف زئی مرحوم نے مجھ سے کہا اگر تم اپنا فیصلہ واپس لے لو تو میں تمھیں ریو الونگ ریسٹورانٹ میں چائے پلاؤں گا اور جو تم کھاؤ گے کھلاؤں گا۔ یوں میں پھر سے لکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ ان کی بات میں نے اسی معمولی سے اے ون ریسٹورانٹ میں چائے پی کے مان لی تھی۔ بڑے دل چسپ اور شان دار آدمی تھے اور اختصار تو ان کی سب کہانیوں اور کسی قدر گفتگو کا بھی حصہ رہا کرتا تھا۔

ایک بار وہ میرے ساتھ اسلام آباد کے ورک شاپ میں شریک ہوئے۔ ہمیشہ دو افراد کو رائے دینے کے لیے منتخب کیا جاتا تھا۔ مجھے زیادہ تر موقع دیا گیا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ لاہور کے صاحب الرائے نے اپنے جوش خطابت کے دریا بہا دیے اور جب کراچی سے مجھ سے رائے دینے کو کہا گیا تو میں نے استاد مظہر صاحب کا نام تجویز کر دیا کہ وہ نہ صرف مجھ سے بڑے تھے، بلکہ زیادہ بارعب تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے صرف ایک جملے کی رائے دی۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

وہ جملہ یہ تھا۔ ''میں نے اس عمر میں بھی اس ورکشاپ سے بہت کچھ سیکھا۔''

میرے ساتھ آئے ہوئے سندھ اور کراچی کے ساتھیوں پر تو جیسے صف ماتم طاری ہوگئی اور سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ لاہور والے نے قریب بیس منٹ تک تقریر کی اور بہت سے مسائل کی نشان دہی کرنے کے علاوہ اور ڈھیروں تعریفیں بھی کیں اور ہم صرف ایک جملہ ادا کرنے کے لائق تھے۔ دوستوں سے برداشت نہیں ہوا اور انھوں نے صدر مجلس سے (جو سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس یا چیف جسٹس خلیل الرحمٰن تھے) درخواست کی کہ ہمارے اصل نمائندے حنیف سحر ہیں انھیں..... موقع دیا جائے۔ درخواست منظور ہوئی اور میں نے کوئی چالیس پینتالیس منٹ تک تقریر کی۔ بعد میں اسی تقریر کا کئی بار حوالہ صدر مجلس نے اپنی تقریر میں دیا۔ کراچی اور سندھ کے ساتھیوں کے چہروں پر جیسے بہار کھل گئی۔

اسی طرح کے جانے کتنے واقعات ہیں جو مجھے یاد نہیں آرہے۔ اب میں اس آپ بیتی کا اختتام کرتا ہوں..... اس حدیث صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ.....

''دنیا میں وہ تین آدمی قابل رحم ہیں، جن میں سے ایک وہ امیر آدمی، جس کی دولت چھن گئی ہو اور دوسرا وہ نیک آدمی، جس کی نیک نامی ایک دن خاک میں مل جائے..... اور تیسرا وہ دانش ور، جو جاہلوں میں گھرا ہوا ہو۔''

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

صاحب طرز ادیب، خوش گفتار و خوش مزاج۔ جوانی میں ہی بزرگی کا لبادہ اوڑھنے والے عجب لکھاری، خطیب، صاحب کتاب۔ سادہ اور سلیس انداز بیاں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں تخلیق کرنے والے سادہ دل ادیب کی آپ بیتی۔

عرصہ دراز سے [illegible] بچوں کی [illegible] میں مصروف عمل [illegible] سے منسلک کہانی کار کی اپنی کہانی۔

میں 24 اگست کے دن پیدا ہوا۔ بدھ کا روز تھا، لیکن بدھو نہ بن سکا۔ دنیا والوں نے تو بنانے کی بہت کوشش کی، لیکن اوپر سے بنا کر ہی آیا تھا۔ کیا کمی بیشی کرتے؟ میں نے دوستیاں بھی اسی اصول پر کیں کہ اگر دوست میں کوئی کمی بیشی ہو تو کوئی کتر بیونت نہیں کروں گا۔ بھلا مجھے کیا اختیار قدرت کی کاریگری میں مداخلت کا؟ یہی بات تو کہنی ہے دوستو کہ آپ بیتی لکھنے کا بہت عرصے سے سوچ رہا تھا۔ محبوب الٰہی مخمور، صفدر رضا رضوی، نوشاد عادل اور غلام محی الدین ترک جیسے مخلص افراد کو مہینوں بلکہ سال سے ٹال رہا تھا، لیکن پھر اچانک نوشاد عادل پر پیار آ گیا اور کمپیوٹر پر جھک گیا۔

ابتدائی حالات زندگی:

بتایا تو ہے کہ کراچی میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم لیاقت آباد (اس وقت کے لالوکھیت) کے محلہ اسکول میں حاصل کی۔ اس استانی کے ہاتھ چومنے کو جی کرتا ہے کہ جس نے دھوکے سے ہمیں کچی پکی میں فیل کر دیا۔ بس ہم نے رونا شروع کیا، اس لیے نہیں کہ فیل ہو گئے۔ ہمیں پتا ہی نہیں تھا اس وقت فیل پاس کا۔ والدہ صاحبہ نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ والد صاحب نے بھی والدہ صاحبہ سے چھپ کر چار چھ کرارے کرارے نوٹ دیے (آپ کیا سمجھے کرارے کرارے کرنسی نوٹ ہی ہوں گے) ہاہاہا...... میں ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ میرے اندر جان لیجیے کہ کوئی شوخ و چنچل بچہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

چھپا جیتا ہے۔ ابھی تو بچوں کے لیے پانچ ہزار سے زیادہ کہانیاں 'نظمیں' ڈرامے' خاکے' غزلیں' افسانے' انشائیے' انٹرویو' اللہ جانے کیا کیا لکھ دیا۔ پاکستان بھر کے بچوں کے اخباری صفحات اور رسائل کو بھر دیا مگر اب پینتالیس سال بعد بہت مزا آتا ہے، جب دنیا بھر سے بچے مجھے پہچان جاتے ہیں۔ اساتذہ کرام خوشی خوشی بتاتے ہیں کہ وہ بچپن میں میری کہانیاں پڑھا کرتے تھے۔ بہت خوشی ہوتی ہے۔

ہاں تو سنو! استانی صاحبہ نے فیل کر دیا (میں نے زندگی بھر یہ قبول نہ کیا کہ میں خود فیل ہوا تھا۔ دیگر بچوں کی طرح یہی کہتا رہا کہ ہائے مس نے 'مرنے فیل کر دیا' ہاہا)۔ والد صاحب غصہ اُتارنے کے بعد بھی پہلی میں فیل ہونے کے اسباب پر غور فرمانے لگے۔ اچانک تایا جان دلاور فگار (معروف شاعر دلاور حسین حمیدی) ہمارے گھر آ گئے۔ میرے پھوپھی زاد شارق جلیسی (میرے پھوپھا جناب امیر حسین جلیسی کے صاحب زادے) ایک اعلیٰ انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھا کرتے تھے' چناں چہ دلاور تایا نے فرمایا: "دیکھو افضل کا لڑکا شارق جو جیب ہی کا ہم عمر ہے' کیسے شان دار اسکول میں پڑھتا ہے، جس کی پڑھائی اچھی ہے بھائی اسکول تو وہی شان دار ہے جس کی پڑھائی اچھی ہو' بھلا عمارتوں سے بھی اسکول اچھے ہوئے ہیں!"

میں نے دلاور فگار صاحب کی یہ بات پلّے سے باندھ لی۔ پھر والد صاحب انوار حسین حمیدی کو جلال آ گیا۔ والدہ صاحبہ فاطمہ اختر نصیری سے کچھ مشورہ کیا اور مزید بچت کا منصوبہ خاک میں ملاتے ہوئے مجھے "صدر گرامر اسکول" میں داخل کرا دیا۔ ساتھ ساتھ ایک ماسٹر صاحب گھر پر تشریف لانے لگے، جو مجھے ہوم ورک میں بہت مدد دیا کرتے تھے۔ دوپہر کا وقت ہوتا۔ ماسٹر صاحب کمرے کی ٹھنڈک میں سو جاتے۔ میں آرام سے اپنا کام کر لیتا۔ وہ جاگ کر تمام کام کاٹ دیتے کہ مجھے جگایا کیوں نہیں؟ دوبارہ کرو۔ دوبارہ تمام کام کر لیتا۔ اس طرح دو بار میں ہی پورا سبق یاد ہو جاتا۔

اس وقت کے اساتذہ کرام کے پاؤں بھی دھو کر پیئوں تو اُن کے احسانات ادا نہیں کر سکتا۔ سزائیں بھی سکھا دیا کرتے تھے۔ دین بھی سکھایا' دنیا بھی اور دنیا کے بارے میں بھی۔

میرا ایک بھائی نوید ظفر اور ایک بہن بشریٰ ظفر۔ ظفر حسین' دراصل ہمارے دادا کا نام تھا جو

itsurdu.blogspot.com

ہمارے بڑے دادا شاکر حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ ماسٹر شاکر حسین انڈیا میں ایک علاقہ "بدایوں" (یوپی انڈیا) کے واحد اسکول کو یا کالج اسلامیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ یوں صدیوں سے علم و ادب ہمارے خاندان میں موجود تھا۔ دوستو میرے خاندان میں ساری بڑی بڑی ادبی ہستیاں موجود' کچھ ہمارے بزرگ' کچھ ہم عمر اور کچھ میرے بعد۔ سب کے سب قابل۔ ان قابل ترین لوگوں میں غضب اللہ کا میں فیل ہو گیا۔ نہیں نہیں نئے اسکول میں ہر گز نہیں پرانے کی بات کرتا ہوں۔ فیل ہونے سے اللہ بچائے! نئے اسکول میں والد صاحب نے مزید "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے" کے فارمولے پر انتہائی سخت ترمیم کے ساتھ عمل فرمایا اور میری سالانہ امتحانات میں پہلی پوزیشن آ گئی' ہاں ہاں پہلی پوزیشن آ گئی۔ اب تم بڑے خوش۔ پھر تو جیسے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال ہو گیا۔ پھر کبھی سیکنڈ نہ آیا فرسٹ اول۔ ایم اے تک اول پوزیشن لی پی ایچ ڈی فرسٹ (پینسٹھ فیصد نشانات کے ساتھ)۔

محنت کی عادت پڑ گئی۔ لکھنے میں مزا آنے لگا۔ 1961ء میں بچوں کی ایک کہانی لکھی "بادشاہ ٹھیک ہو گیا" اور لاہور کے بچوں کے ایک مقبول پرچے کو بھیج دی...... نام نہیں بتاؤں گا۔ کہانی ایڈیٹر صاحب کے نوٹ کے ساتھ واپس آ گئی کہ ہم بچوں کی کہانیاں نہیں چھاپتے۔ صفحہ کے ایک جانب لکھا کرو میاں! اب کیا کریں؟ لکھنے کا شوق جنون بن گیا۔ عزت کا سوال تھا۔ سات سالہ عزت کا معاملہ تھا۔ اب کیا کیجیے؟ دھڑ سے لاہور کے دوسرے پرچے "شبستان" کو بھیج دی۔ وہاں چار ماہ بعد تصویروں کے ساتھ چھپ گئی۔ واہ جی واہ! مزا آ گیا۔ پورے خاندان میں رسالہ تقسیم کیا گیا۔ اس وقت فوٹو اسٹیٹ مشینیں تو تھیں نہیں۔ نہ فیس بک اور سوشل میڈیا کی سہولیات۔ بس کتاب اور قلم۔ کچھ رشتہ داروں نے خاص کر اردو ادب کی معروف ترین شخصیات جو میرے خاندان ہی کی تھیں۔ انہوں نے میری بہت ہمت افزائی کی۔ اب دل جما۔ خوب لکھا۔

دس سال بعد جب جم کر لکھ رہا تھا اللہ کے حکم سے بچوں کے رسالوں پر حکومت کر رہا تھا تو اسی بچوں کے رسالے کے بزرگ ایڈیٹر کا خط آیا کہ ہمارے پرچے کے لیے کہانی لکھ دیں خوب واہ! انہیں پیار بھرا اسلام لکھا اور ایک مزے دار کہانی لکھ دی اور وہ پانچ تصاویر کے ساتھ خوب صورت تتلیوں اور گھوڑوں کے بارڈرز میں میری کہانی چھپ گئی۔ یوں ہمارے گھر "بچوں کی دنیا"

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کے ساتھ نونہال، تعلیم و تربیت، غنچہ، کھلونا، بچوں کا باغ، بچوں کی باجی، جگنو، ہونہار پاکستان اور اس وقت کے تمام بچوں کے رسالے آتے تھے۔ بچے بڑوں کے رسالوں کو ہاتھ نہ لگاتے، اپنے مزے دار رسالے پڑھا کرتے۔

پاکستان یا ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا بچوں کا رسالہ ہو جس میں ہم نے نہ لکھا ہو۔ ہمارا رسالہ، بچوں کا رسالہ، انوکھی کہانیاں، ٹوٹ بٹوٹ، تتلی، چاند ستارے، ساتھی، بزم قرآن، بھائی جان، ٹوٹ بٹوٹ، بزم منزل، بچوں کا پرستان، گوگو...... دیکھو مجھے سب کے نام بھی یاد نہیں آ رہے اس وقت جسے بھول جاؤں وہ مجھے معاف کر دینا اسی ڈر سے آپ بیتی نہیں لکھ رہا تھا مگر نوشاد عادل سے وعدہ کر لیا تھا۔

90 کی دہائی میں حیدر آباد (سندھ) سے ایک نوجوان بچوں کے لیے بہت اچھی کہانیاں لکھ رہا تھا۔ ہنس مکھ، مزے دار، قہقہہ بار کہانیاں۔ یہ تھے نوشاد عادل۔ میں نے اپنے دوست ابن آس سے کہا تھا کہ مجھے ہر حال میں نوشاد عادل سے ملا دو...... ذرا یہ کالونی لکھنے پر ان کے کان کھینچوں گا کہ خود تو اتنے بڑے ہو گئے ہیں اور ان کے کان ابھی تک چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ہاہاہا...... ابن آس کب میری سنتے ہیں؟ اس وقت پروفیسر بھی نہیں تھا۔ واٹر پمپ کے ایک اسکول محمدی پبلک اسکول میں پڑھاتا تھا۔ 1450 روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ ایسے میں شادی بھی ہو گئی تھی۔

زین میاں دنیا میں تشریف لانے کو تھے۔ ابن آس اُمت اخبار میں کام کر رہے تھے اُن دنوں۔ ڈاکٹر محمد محسن صاحب کی بدولت میری اُن سے اخبار کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ میں نے بھی اخبار پارٹ ٹائم ملازمت کرنا چاہی تو ڈاکٹر محسن صاحب کے بچپن کے دوست اور اخبار کے ایڈیٹر جناب معین کمالی نے انکار کر دیا کہ اس وقت تو کوئی جگہ نہیں۔ اس وقت میں پرائیویٹ بی۔ اے کر رہا تھا (کیوں کہ اس وقت جامعہ کراچی کے اصولوں کے مطابق سائنس سے براہ راست ایم اے اردو کر سکتے تھے، پہلے اس مضمون میں بی اے کرنا پڑتا تھا جس میں ایم۔ اے کرنا ہو) تو بی اے کر لیا۔ اوّل پوزیشن لی۔ اردو سے ہمیشہ عشق۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی میں بھی اردو۔ اردو...... اپنی زبان اردو، قومی زبان اردو، ہم سب کا مان ہے تو پیاری زبان اردو تو پاکستان کا اعزاز ہے، سرمایہ ہے، تو نے ہم سب کو اک مرکز پہ آن ملایا ہے، سچ تو یہ ہے تو نے ہم سب کا مان بڑھایا ہے۔ تیرے ساتھ دعائیں سب کی جہاں بھی جائے تو اپنی زبان اردو...... میں بچپن میں سہیل رانا صاحب کے ٹی وی پروگرام میں بھی شریک ہوتا اسی لیے آواز ابھی تک اچھی ہے (کھانسی) ہاہا۔ کچھ بے سُرا ہو جاتا ہوں بس۔ ہاں تو کیا بتا رہا تھا۔ بھائی بات یہ ہے کہ اگر سچ مچ کی آپ بیتی لکھوں تو ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ تھے منے انوکھی کہانیاں کے صفحات کہاں سے بڑھا دو؟ اللہ تعالیٰ ہی مالک ہے، وہ اپنا فضل و کرم کر دے۔ نوشاد عادل کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایک رات ابن آس (محمد اختر) آئے، فلیٹ کا دروازہ بجایا۔ رات گئے ابن آس ایک مہمان کے ساتھ۔ اُف بیگم صاحبہ کو جگایا، اٹھو اٹھو ابن آس آئے ہیں، مبارک ہو مہمان لائے ہیں۔ غریب رات بارہ بجے اٹھ بیٹھی۔ چائے پانی۔ یہ کون ہیں؟ میں نے نوشاد کی جانب اشارہ کیا۔

"بچوں کے ایک نئے رائٹر ہیں، چنگاری نام ہے، ان کا سلیم چنگاری۔" ابن آس نے سوٹا لگایا (سگریٹ کا کش لیا)

"اچھا خوشی ہوئی مل کر۔" میں نے کہا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ پرانی بات ہے۔ 2002ء کا ذکر ہے۔ سب کچھ یاد نہیں ہے۔ دو مہینے بعد ابن آس آئے۔ ہاتھ میں بچوں کا اس وقت کا مقبول پرچہ جو حیدر آباد (سندھ) سے نکلتا تھا، انوکھی کہانیاں لیے۔

"عجیب بیلو!" وہ بولے اور ایک ورق کھول کر میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ ارے میں تو چکرا گیا۔ نوشاد عادل کی تحریر اور عنوان تھا، بچوں کے مقبول ادیب مجیب ظفر انوار حمیدی کی ابھرتے ہوئے رائٹر سلیم چنگاری سے ملاقات!

ہائے اللہ...... میرے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ابن آس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "ارے کم بخت۔ ارے کیوں چھپایا کہ یہ نوشاد عادل ہیں۔"

وہاں ایک ہی ہنسی ہاہاہا...... اف اللہ سخت غصہ آیا۔ جلد ہی یہ تحریر ادبی حلقوں کا یک غلغلہ بن گئی۔ مجیب ظفر انوار نوشاد عادل کو نہیں پہچانے، نہیں پہچانے، اوہو! کیا ہو گیا یہ؟

اب کیا کیا جائے؟ ادھر نوشاد کی شرارتیں اپنے عروج پر۔ اسی وقت مجھے جھلکو پروفیسر کا خطاب دیا گیا۔ نیا نیا پاکستان اسٹیل کیڈٹ کالج میں آیا تھا۔ مہینہ بھر ہوا ہوگا۔

کرنا خدا کا دیکھئے کہ جب نوشاد عادل مجھ سے "سلیم چنگاری" بن کر ملے تو ابن آس نے

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

مجھے اصل واقعہ سے لاعلم رکھا تو اگلے ہی ہفتہ ماہنامہ "ساتھی" کی رائٹرز ایوارڈ تقریب تھی۔ اس میں ناظم تقریب نے ایوارڈ لینے کے لیے نوشاد عادل کا نام پکارا تو بہت دیر تک تو کوئی بھی اٹھ کر نہ آیا۔ جب کئی بار نام پکارا گیا تو عقبی نشستوں سے ایک دبلا پتلا لڑکا اٹھا اور اسٹیج کی جانب بڑھا۔

"ارے...... یہ لڑکا کہاں جا رہا ہے؟ نوشاد عادل کو بلاؤ!"

میرے اچانک چیخنے پر ساتھ بیٹھے بچوں کے معروف شاعر جناب ضیاء احمد ضیا بولے: "کیا ہو گیا حمیدی صاحب...... یہ نوشاد عادل تو ہیں!"

"ہائیں!" پورا ہال گھوم گیا۔ اللہ میرا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا ہے شاید۔ اُف وہ یہ ہے نوشاد تو...... وہ وہ کون تھا جو رات کو ابن آس کے ساتھ آیا تھا (واضح رہے اس وقت تک نٹ کھٹ نہیں چھپا تھا سلیم چنگاری والا!" خیر اس کہانی کو مزید آگے لے کر جانا تھا ابن آس اپنی کھی کھی کو ہاہا میرا چہرہ دیکھ کر ضیاء صاحب کچھ خاموش ہو گئے اور وہ لڑکا نوشاد کا ایوارڈ لے کر چلا گیا۔ میں سوچوں میں غرق گھر آیا۔ اس وقت انٹرنیٹ کی وبا بھی نہیں تھی کہ نیٹ پر دیکھ لیتا نوشاد عادل کی تصویر۔

پھر جب "نٹ کھٹ" میں یہ ماجرا چھپا تو میں اور جناب تنویر پھول صاحب کئی گھنٹے ہنستے رہے۔ شاید اس واقعہ کے بعد تین یا چار روز تک میں نوشاد سے سخت ناراض رہا، لیکن ناراض رہ کر مجھے کون سا تیر مار لینا تھا۔ بات پرانی ہو سال نے اپنے غبار جما دیا۔ نوشاد واقعی اچھا لکھتا ہے۔ وہ مار کیٹنگ کا بندہ ہے اور پروفیشنل ازم کی نگاہ سے ڈائجسٹوں کے صفحات کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ نوشاد عادل کی وہ کہانیاں جو ہمدرد نونہال میں شائع ہوئیں...... وہ مجھے زیادہ پسند آئیں۔ بچوں کی ذہنی سطح کو "اپروچ" کر کے ان کی پسند و ناپسند کے بروقت فیصلے کرنا بچوں کے لکھاری کا خاص وصف ہے۔

پتا نہیں جب بھی کوئی آپ بیتی لکھتا ہے تو قارئین بھی بچے بن جاتے ہیں اور بچے تو پھر بچے ہیں جس وہ لکھنے والے کے بچپن کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بڑے ہو جانے کے بعد لوگ ہاگ اپنے بچپن سے شرماتے لجاتے ہیں، لیکن ہم تو "بچپن میں بچپن" کے قائل ہیں۔ ہاہا...... یعنی میں اگر پچپن برس کا ہوں تو مجھے اپنا بچپن یاد کرنے میں دوسروں کی نسبت زیادہ مزا آئے گا، کیوں کہ بڑھاپے کی منزلوں کو پہنچے انسان کو اپنا بچپن دنیا کا سب سے حسین بچپن لگتا ہے۔

بتا چکا ہوں کہ 24 اگست میرا یوم پیدائش ہے۔ ستارہ "سنبلہ" اور "اسد" کے درمیان کوئی ہوگا۔ بچپن کبھی کا حسین ہوتا ہے۔ اردو کے شاعر محسن بھوپالی صاحب کا یہ شعر میں پڑھا تھا۔ سن لیجیے بلکہ یاد کر لیجیے کہ اچھے اشعار یاد کرنا چاہئیں۔ اس سے گفتگو حسین ہو جاتی ہے۔

جب بھی بچ بولتے بچوں پہ نظر پڑتی ہے
یاد آ جاتا ہے بے ساختہ بچپن اپنا

میرا بچپن شان دار، کتابوں رسالوں کا رسیا، چاٹ چھولے، جھولے، پکنک پر جی رہا سب شرارتیں پسند۔ گرمیوں کی چھٹیاں کیا ہوتیں، پورا خاندان جڑ جاتا۔ سب کزن ایک ساتھ رہا کرتے، کھاتے پیتے۔ مزے کرتے، تین ماہ تعطیلات ہوا کرتی تھیں پہلے۔ درمیان میں موسم برسات بھی گزرتا۔ جب اسکول جاتے تو یہ دیکھ کر طبیعت مچل مچل جاتی اسکول کے کھیل کے گراؤنڈ زیرہ بھی تازہ لہلہاتی گھاس بھرے ہوتے۔ یہ جو میں نے گھاس کے میدانوں کی تعریف کی تو کوئی سبزی خور جانور کیا رکھیے گا، گائے، بکری، ہرنا ایک طرف جو مجھے وہ سبزے کے میدان لبھاتے۔ قلابازیاں لگاتا، دوڑتا، بھاگتا۔ آج بھی میرے ماہر قلب نے مجھے وشام پیدل چلنے کا مشورہ "مفت" میں عنایت فرمایا ہے تو گھر سے نزدیک پارک "راشد لطیف اکادمی" چلا جاتا ہوں۔ واللہ کیا نعمت ہے یہ پارک، اہ واہ۔ تر و تازہ باغات، سبزہ، بارش، سردی یہ سب مجھے بچپن سے پسند رہے۔ مونگ کی دال، ڈوہ دال جو حلوائی کے ہاں ملتی ہے۔ آ ہاہا! ایک ایک کلو دال کھا جاتا "نونہال" تعلیم و تربیت پڑھتا جاتا۔ نہاری، پائے، حلیم (ولیم) وغیرہ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ابو نے نہ کھلائی ہو۔ چھوٹی بہن نثر اختر کھانے میں ست اور سب چھوٹا بھائی نوید ظفر (جو مجھ سے اٹھارہ سال چھوٹا ہے) کھانے پینے میں چست، ماشاء اللہ۔ نوید ظفر کو "راجا" کہا کرتے، کیوں کہ ان دنوں پی ٹی وی پر جناب معین اختر کا ایک ڈراما لگا کرتے تھے، جس میں ان کا کردار "راجا پہلوان" کا تھا۔ راجا چار سال کے تھے، انہوں نے شام کو ٹی وی دیکھ کر اچانک احکامات جاری کر دیے کہ مجھے آج سے "راجا" کہا جائے۔ بس راجا ہو گئے، نہ راج پاٹ، نہ سلطنت، نہ پایۂ تخت، بے تاج و تخت "راجا"۔ اب ان کے دونوں بچوں "محمد حسن نوید" (چھ سال) اور محمد سعد سفیان (تین سال) کو میں اپنے پوتے کہتا، لکھتا اور بتاتا ہوں۔ ہاہا، حالاں کہ حسن اور سعد میرے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

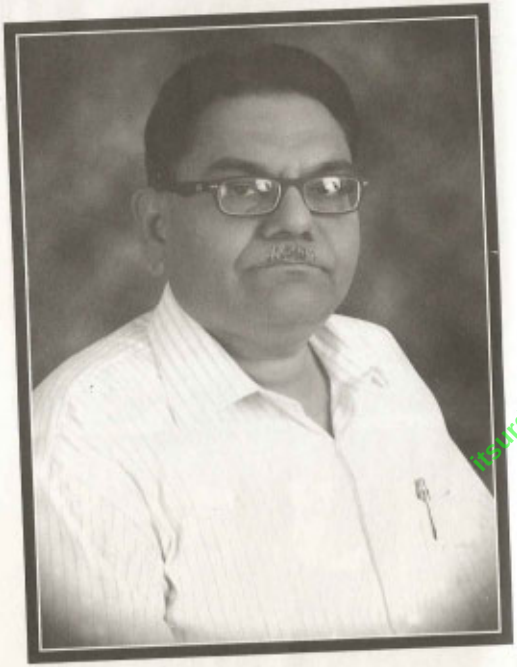

مجیب ظفر انوار حمیدی

''دادا'' ہیں! دادا گیری سے باز...... آتے لیکن پڑھائی کے معاملہ میں وہ بھی جانتے ہیں کہ ''ابا ٹانگیں توڑ دیں گے سعد! جلدی جلدی سبق یاد کرو!'' حسن اور سعد مجھے کس قدر عزیز ہیں! الفاظ میں اس کا اظہار یہ ممکن نہیں۔ یوں جان لیجئے کہ ماہ نامہ ''تعلیم وتربیت'' لاہور کے چار ایڈیٹرز حضرات کے دور میں محض ''حسن اور سعد'' پر سیکڑوں کہانیاں لکھ دیں۔ ان میں جناب محمد جاوید اقبال امتیازی اور نذیر انبالوی صاحب کو خود بھی حسن اور سعد کی کہانیوں میں مزا آتا فرمائش کر کے لکھواتے۔

میں نے اپنی بہترین کہانیاں محض مروت میں لکھیں۔ مسعود احمد برکاتی صاحب کی مروت میں ''نونہال'' میں اختر عباس کی مروت میں ''پھول'' میں یہاں علی جاوید اقبال امتیازی حامد مشہود نذیر انبالوی کی مروت میں ''تعلیم وتربیت'' میں ''ساتھی'' کے مدیران کی تبدیلی کا ایک زمانے میں یہ حال ہو گیا تھا کہ خط ایک مدیر کو لکھتا' ملتا دوسرے کو اور پڑھتا تیسرا' جواب چوتھا ایڈیٹر دیا کرتا' پوسٹ پانچواں مدیر کرتا۔ ہاہاہا...... (بھئی اب تو ہنسنے دو بچوں) ہاہاہا...... میں اگر تمام باتیں یاد کروں تو آپ بیتی کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں گی۔ کیا ہے کہ رولنگ نے ''ہیری پورٹر'' لکھ کر کمایا جو میں لاکھوں میں کھیل جاؤں گا' مگر میرے بچوں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے' وہ جس حال میں رکھے خوش رہو۔ رب کا شکر ادا کر بھائی' جس نے ہماری گائے بنائی۔ بس گائے میں ایک بات بری ہے کہ بقر عید کے پہلے روز قربان ہو جاتی ہے۔ اپنے رب کی خوشی کی خاطر اپنی جان تک دے دیتی ہے۔

میرے بچو! میرے راج دلارو! یہی تو جینا ہے کہ دوسروں کے لیے جیو...... اُن کی خوشیوں کا ہر دم خیال رکھو۔ انسان کی عزت کرو' چھوٹا برا کوئی نہیں' کالا گورا کوئی نہیں' امیر غریب کچھ نہیں' سب انسان ہیں۔

اتنے قابل لوگوں کے نام لکھنے کے لیے بھی جگر چاہیے۔ کیسے لکھوں اور کہاں تک لکھوں؟ پرائمری سر قمر' مس غوری' مس کوثر' سیکنڈری سر منظور' میڈم سرور' سر آفتاب' کالج' سر مبین حسنی' سر وقار گل' سر امین فاروق' میڈم عارفہ بخاری' سر ابوالخیر' سر ابو اللیث صدیقی' سر روحی شنکر' سر فرمان فتح پوری' سر مشفق خواجہ' سر ہارون رشید' بھی۔

بہت سارے نام ذہن میں ہیں' یاد نہیں کر پا رہا ہوں اور دل چاہ رہا ہے کہ جلدی جلدی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

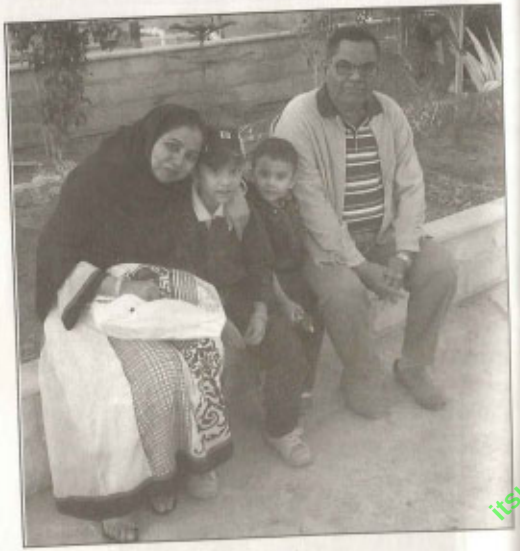

مجیب ظفر اپنی بیگم ناہید مجیب اور بچوں کے ہمراہ

مجیب ظفر انور حمیدی نقاش کاظمی
اور اظہر رضوی کے ساتھ

[illegible]

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

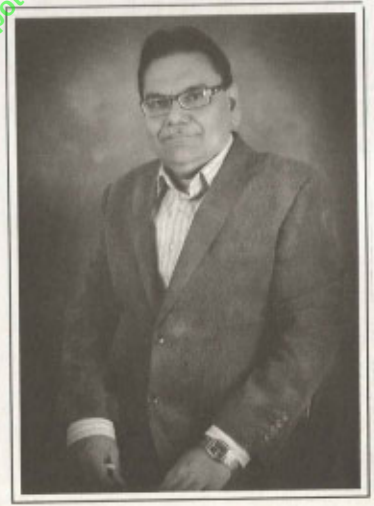

نکلوں۔ سر زاہد! میڈم وہ فزکس والی میڈم کیا نام تھا ان کا؟ وہ وارے حد ہوگئی...... زبیر سے پوچھ کر آتا ہوں۔ میرا اختر کا دوست ہے وہ آج کل محکمہ موسمیات کا ڈائریکٹر ہے کراچی میں۔ ہاں! میڈم دردانہ طبیعیات (فزکس) کی نہایت قابل پروفیسر صاحبہ تھیں۔ میرے تمام اساتذہ کرام میرا سرمایہ افتخار ہیں۔ میرے لائق فائق شاگرد بھی! وہ بات نہیں کہ ایک پروفیسر صاحب کو ایک ہوائی جہاز میں بٹھایا گیا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ جہاز آپ کے شاگردوں نے بنایا ہے، لیکن ...... اچانک جہاز میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ لوگ ڈر کے مارے اتر گئے، البتہ پروفیسر صاحب بیٹھے رہے۔ پوچھا گیا تو فرمایا: "اگر یہ واقعی میرے شاگردوں نے بنایا ہے تو اُڑنا تو کجا اسٹارٹ بھی نہ ہوگا! ہاہاہا ہاہاہا" لیکن میرے شاگردوں کا ایسا معاملہ نہیں۔ وہ چاہے "محمدی پبلک اسکول" یا "آغا خان ہائر سیکنڈری کالج" اور وہ "پاکستان اسٹیل کیڈٹ کالج" ہو یا "تابانی گروپ اوف ایجوکیشن" میرے شاگردوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ پوزیشن حاصل کیں، اسناد انعامات لیے۔ آج پوری دنیا میں...... الحمدللہ میرے شاگرد زندگی کے ہر شعبہ میں موجود اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اللہ اُن سب کو خوش رکھے۔ وہ جہاں بھی رہیں "کنول" کے پھول کی طرح رہیں۔

آدمی کو چاہیے دنیا میں رہنا اس طرح
جس طرح تالاب کے پانی میں رہتا ہے کنول

اب سب بچوں کے نام مجھے زندگی بھر یاد نہیں آ سکتے، تاہم صورت دیکھ لوں تو پہچان لوں۔ صائمہ اعجاز، صہیبہ چغتائی، اس کی دو بہنیں، نام یاد نہیں آ رہا، مہک عباس، فاروق، دانش، عمیرہ احمد، عاصم جہانگیر، مرتضیٰ رضا، مصطفیٰ کمال، بے شمار بچے ہیں، نام یاد نہیں آ رہے ہیں، اشعر عالم، عثمان ایک نیشنل کالج کراچی میں بھی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، کیا نام ہے ان کا؟ محمدی اسکول میں تھے وہ، میرے شاگرد ہیں، ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ نام خدارا رہنے دیجیے، جس کا نہیں آئے گا ملال ہوگا، ناحق!

اچھا دوست خدا کی نعمت، بے شمار دوست ملے، ڈھونڈے کمائے، ندیم بیگ، وقار زبیر صدیقی، اور آفاق اختر عباس، تمثیل، مشکور، عارف بھائی، ناصر بھائی، بہت سارے۔

الحسن اکیڈمی کے زیر اہتمام مجیب ظفر کی کتاب 'خون آلود خنجر' کی تقریب اجراء کے موقع پر مصنف اپنی کتاب حنیف ایس کالیا اور مسعود برکاتی کو پیش کر رہے ہیں۔ اس موقع پر حسن عابدی، علی حسن ساجد اور سید اظہر علی بھی موجود ہیں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

بڑے احسانات ہیں مجھ پر حضرت مسعود احمد برکاتی' محترم ڈاکٹر اسد اریب' محترم ڈاکٹر محمد محسن کے۔ ان حضرات کی صحبت میں کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ سید عبدالعزیز عزمی' محترمہ شمع زیدی' جناب حنیف سحر' ایم اسلم خان' فرحت حسین فرحت' پروفیسر محمد ظریف خان' افق دہلوی' اشتیاق احمد' محمود شام' اختر سعیدی' محبوب الٰہی مخمور' سعید سعیدی' الطاف پاریکھ' جدون ادیب' محترم عنبر چغتائی' محترم کھتر عصمت علی پٹیل' آصف مالک' مصطفیٰ چاند' یاسمین حفیظ' علی حسن ساجد' امان اللہ نیر شوکت' سید امتیاز عارف' سید محمد جاوید امتیازی' ڈاکٹر رضوان ثاقب' پروفیسر سلیم مغل' ارشد حسین (واٹر پمپ کے سابقہ ارشد بک ڈپو والے) پروفیسر طاہر مسعود' محمد حسن عسکری' محمد اکرام خان' زیبا برقی' نشاط آپا' محترم حسن عابدی' بڑے پرانے قدردان ہیں۔ پروفیسر شاہد اقبال' نورالدین سورانی' فصیح باری خان (ان سے قدوسی صاحب کی بیوہ لکھنے کے بعد شناسائی ہوئی)۔ پروفیسر رفیق احمد نقش' پروفیسر نقاش کاظمی' پروفیسر سحر انصاری' کمال احمد رضوی' [illegible] اظفر رضوی' رضیہ فصیح احمد' زیبا بختیار' زیبا شہناز' معین اختر' انور مقصود (خاندان ہی کے ہیں) فاطمہ ثریا بجیا (بدایوں) محترم الحاج شمیم الدین (بدایوں) ڈاکٹر ابولیث صدیقی (بدایوں) پروفیسر عظمت علی خان' پروفیسر نعیم علی خان گوہر' محترمہ آمنہ عالم' وغیرہ بھی ملاقاتیوں' دوست واحباب میں شامل رہے۔

دوست کیا ہے؟ اختر عباس ہمیشہ ایک ہی بات کہتا ہے کہ یہ کیا کہ مرنے کے بعد سو دو سو نام لکھ دیے کہ فلاں دوست تھا' وہ دوست' یہ دوست! ابھی جو زندگی میں آپ کا پیارا لگے' جو آگے بڑھ کر آپ کو گلے سے لگائے' بس وہی دوست ہے' وحید مراد کی طرح ایک جملہ جو اس کا تکیہ کلام ہو گیا اُس لیجنڈ کا کہ "ہاں اچھا تھا بے چارہ!" ایسا کیوں نہیں؟ مرنے کے بعد دوستی کیا؟ زندگی میں جو آپ کے قریب ہو' ساتھ ہو' چاہے وہ آغا خان کالج کے جناب آلِ مرتضیٰ صاحب ہو یا کیڈٹ کالج کے کیپٹن ظہیر الدین ملک صاحب ہوں۔ مرزا اظفر بیگ ہوں' یا ہمدرد سے محبوب احمد خان' شہزاد منظر صاحب مجھے ہمدرد میں ملے۔ احمد ہمدانی صاحب ہمدرد میں ملے۔

حکیم محمد سعید شہید کی کیا بات؟ محترم مسعود برکاتی صاحب نے ان سے میری ملاقاتیں کروائیں۔ اُن کی سالگرہ 9 جنوری پر کیک لے کر جاتا تھا' ٹیوشن پڑھا پڑھا کر پیسے جمع کرتا اور

کیک پھول لے کر جاتا' بہت شرماتے۔ آٹوگراف اتنے میرے پاس اور خطوط کہ کتاب بن جائے۔ مرزا ادیب' حکیم سعید' ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر' محمد عمر احمد خان' منیر احمد راشد' کمال احمد رضوی' ڈاکٹر محمد الیاس' انوار الحق سومرو' (میرا دوست جو اردو یونیورسٹی کا رجسٹرار بھی ہوا آج کل دہلی یونیورسٹی انڈیا کا رجسٹرار ہے) بہت سارے مشہور لوگوں کے میرے پاس خطوط ہیں۔ فائلیں محفوظ ہیں۔ اختر عباس کے خطوط کی دو جلدیں بلا حواشی تھیں "اختریات" اور "اختر شماری" انتہائی دلچسپ اور مزے دار خطوط۔

ابن صفی صاحب میرے ملاقاتیوں میں شامل رہے۔ ابن انشاء' مظہر یوسف زئی' بڑے نفیس اور نستعلیق بزرگ تھے۔ مظہر صاحب' اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے آمین! جناب شان الحق حقی' ابن صفی کے بھتیجے راشد اشرف' احمد صفی یہ بھی سوشل میڈیا کے ذریعہ دوست بنے۔ امین بھایانی' محمد فاروق دانش سے پہلے واقفیت تھی۔ تعلیم و تربیت کی ایک مدیرہ تھیں۔ سیما علی' ان کا کوئی بھائی کراچی میں میڈیکل کالج میں پڑھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کہتیں کہ آپ اس کی خیریت مجھے فون پر بتاتے رہا کریں۔ فون لاہور کرنا ایسا آسان نہ تھا اُن دنوں۔ اختر عباس کو فون کرتا رہتا۔ بوتھ لگ گئے تھے۔ سو روپے کے کارڈ والے۔ وہاں سے لاہور گھما دیا کرتا۔

ایک مرتبہ ایک بچے کو پڑھانے گیا تو "پھول" میں کہانی نہیں چھپی تھی۔ اس کے پی ٹی سی ایل سے جو اتفاق سے کھٹ سے لاہور لگ گیا۔ اختر عباس سے باتیں شروع' وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔ افوہ...... آدھا گھنٹہ ہو گیا' بھاگم بھاگ گھر آیا اور ٹیوشن چھوڑ دی۔ 1987ء کا زمانہ تھا۔ لاہور کا فون انتہائی مہنگا' ایماندار افسر تھے' بمعہ مل والد صاحب سے آکر ملے کہ ہم نے ٹریس کیا تو سر مجیب نے لاہور کال کی تھی۔ اس نمبر پر...... والد صاحب نے تو "سر مجیب" کی ایسی کی تیسی کر دی۔ بل بھر دیا۔ پھر اس طرح کی دانستہ چوری چکاریوں سے توبہ کر لی۔ کتابوں کی چوری کا چسکا پڑا تو واٹر پمپ کا "ارشد بک سینٹر" یو کے اسکوز' بلاک ایم' خالی کر دیا۔ کتاب لے جاتا' نونہال کے معلومات عامہ کے جوابات دیتا اور واپس نہ کرتا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ کھلم کھلا اقرار کر رہا ہوں' کچھ رقم دے چکا' جو دنیا میں نہیں رہے اور ان کی کتابیں میں نے پڑھ کر لیں واللہ مجھے معاف کر دیں' توبہ الٰہی توبہ! چوری کیا قبیح فعل' بچپن میں تو ایک "ایڈونچر" سمجھا جاتا ہے۔

itsurdu.blogspot.com

دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ان باتوں کے بتانے کا، لیکن لکھ گیا۔ اب حذف نہیں کروں گا۔

کتابوں کی جتنی مدد ڈاکٹر محمد محسن صاحب نے کی' کسی اور نے نہ کی ہوگی میری کہانیاں کلینک اوقات کے بعد انتہائی ذوق و شوق سے پڑھا کرتے۔ اصلاح کیا کرتے۔ میں ان کی ''بزم سائنسی ادب'' میں بھی لے کر گیا۔ وہاں بہت دوست بنے۔ احمد حاطب صدیقی صاحب سے جسارت اخبار کے ذریعہ شناسائی ہوئی۔ بچوں کے لیے بھی لکھتے تھے پہلے۔

بس وقت گزر گیا۔ میرا ایک شاگرد تھا محمد اشتیاق اس کا جوانی میں انتقال ہوگیا۔ اللہ اس کے درجات بلند کرے۔ میں نے ٹیوشنوں اور اسکول کی ماسٹری سے بہت کمایا۔ رج کے ''جاوید نہاری'' ، ''ماموں کباب' برنس روڈ حلیم' ممن آباد حلیم'' واٹر پمپ کے گول گپے' ہر چیز کھائی۔ دیکھیے...... میں دوستوں میں آغاخان کالج کے منور عباس' رفیع الحق' عاصم' معراج سر'' میڈم طلعت افتخار' شبانہ عبدالسلام' عبدالعزیز بھائی' مس ناہید ملک' اسد سر' مس لیلیٰ فرخ کے نام تو بھول ہی گیا تھا۔

کیڈٹ کالج میں اردو کے لیکچرر افضل سر اور اسلامیات کے محمد عثمان نفرٗس کے آصف پاشا صدیقی صاحب' اردو ہی کے اسسٹنٹ پروفیسر' پروفیسر سخی احمد ہاشمی کے صاحب زادے زبیر احمد ہاشمی اور دیگر اچھے لوگ تھے۔ مدت سے ملاقات نہیں، لیکن جو ایک مرتبہ خانہ دل میں آ بسے...... اس کا نکلنا کچھ ایسا سہل نہیں۔

اپنی عادتوں کے بارے میں بتاؤں۔ شوقیہ جھوٹا' گپی' چغل خور' بلا کا شرمیلا' کام چور' سست' آرام طلب' بدحرام' کھانے پینے کا انتہائی شوقین۔ سسرال نہ جانے کا عادی۔ بے چاری بیوی کو شروع شروع میں میرے والد صاحب اس کے مائیکے لے کر آتے جاتے رہے۔ میں اسکول یا کالج سے آ کر سو یا رہتا۔ سوتا رہتا یا کہانیاں لکھتا' شام کو ٹیوشن۔ کھاتا پیتا' میرے سالوں نے شروع شروع میں تو مروت سے کام لیا۔ علاؤ الدین بھائی' انور کمال بھائی میری بیوی کو گھر چھوڑ جاتے' لیکن کب تک؟ قمر بھابھی بے چاری میرا کھانا تک بھجوا دیتیں کہ مجیب بھائی آتے نہیں۔ ادھر مجیب بھائی کے وہی چھن کہ سسرال کے نام سے ڈریں۔ اللہ جانے کیوں؟ ملنے جلنے کے چور۔ سنبلا ایسے آدم خلے تو نہیں ہوتے۔ اللہ میری باہمت اور باحوصلہ بیوی کا سلامت رکھے

کہ غریب نے بڑا سمجھوتا کیا میرے ساتھ۔ میرے خاندان کی زہرہ نگاہ نے جو نظم کہی ہے:

''ملائم زم سمجھوتے کی چادر چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے' کہیں بھی جھوٹ کا تانا نہیں ہے؟''

مجھے لگتا ہے کہ میری بیوی کے لیے کہی ہے۔ جتنا جتنا قبر سے نزدیک ہو رہا ہوں' والدین کے ساتھ بیوی کی قدر و منزلت بھی پتا چلتی جاتی ہے۔ زندگی یوں ہی گزر رہی ہے۔

یوں زندگی کی راہ میں چلنا پڑا ہمیں
لغزش ہوئی کسی سے سنبھلنا پڑا ہمیں
(اظہر حسین صدیقی)

نہ ہی مجھ میں میرے موتی جڑے تھے اور نہ ناہید میں۔ پڑھی لکھی تھیں' قبول صورت' خوب سیرت' انتہائی خوب سیرت' ہمدرد' اسم با مسمیٰ' ناہید' شادی کو ربع صدی بیتی۔ ناہید کو چڑ ہے میرے جھوٹ بولنے کی عادت سے' حالاں کہ بارہا سمجھانے کی کوشش کی'' بیگم صیب...... دروغ مصلحت آمیز' بہتر یہ از راستی فتنہ انگیز' لیکن فرماتی ہیں آپ مجبور ہیں' شوقیہ جھوٹ بولتے ہے' آپ کو اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا گناہ کماتے ہیں آپ عشاء کی نماز اکثر قضا کرتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود بکثرت دوائیاں کھاتے ہیں آپ بے تحاشا پانی پی کر خالی بوتلیں پینے کے لیے رکھ دیتے ہیں کہ اسکول سے آتے ہیں۔ ماسی نمٹاؤں گی' کھانا بناؤں گی اور پانی ابال ابال کر بوتلیں بھرتی رہوں گی۔

ربع صدی کے بعد ''ناہید مجیب'' کا اس قدر محتاج ہو چکا ہوں کہ اپنے پیروں کی انگلیوں کے ناخن تک تراش سکتا' بالوں کو خضاب نہیں کر سکتا' پارلر جانا پڑے تو ہزار بارہ سو ڑپے ڈھیلے کرنا پڑتا ہیں۔ ''بیگم پارلر'' فری ہے۔ شادی کے بعد سیدہ ناہید نرگس صاحبہ نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور میری اس قدر خدمت کی کہ مجھے ''دوسری شادی'' جیسے الفاظ ہی سے نفرت ہوگئی۔ ناہید گھر میں نہیں ہوتیں تو بولایا پھرتا ہوں۔ اُس صبح آملیٹ کا جلنا...... چائے کا پورے کچن میں بہنا' برتنوں کا انبار' کسی عالمی خبریں پورے محلہ میں نشر ہو چکی ہوتی ہیں۔ پڑوسی خواتین اپنے بچوں کو بھجوا بھجوا کر تسلیاں بھی بھجواتی ہیں کہ سر جی اگر میڈم نہیں ہیں تو ہمیں بتا دیجیے اگر کوئی کام ہو' ان شکریہ ادا کرنا ہے، کیوں کہ آملیٹ' سلائس اور شامی کباب کے انتہائی کباب ہو جانے کی ناگوار بو پورے

itsurdu.blogspot.com

محلہ میں برے کردار کی لذت کی طرح آناً فاناً پھیل جاتی ہے۔ کپڑوں کا ڈھیر تو ماسی ثمثاق رہتی ہے۔ بیگم صاحبہ انتہائی مجبوری کے عالم میں میکہ قیام فرماتی ہیں اور انہیں توی امید ہوتی ہے کہ گھر واپسی پر سوائے شوہر نامدار کے ہر چیز تبدیل ہو چکی ہوگی۔ بس آپ میرے معمولات کو زیر بحث نہ لائیں۔ میکے چلنے کی فرمائش نہ کریں۔ میرے دوستوں کے کھلانے پلانے کو لتاڑنا نہ کہیں مجھ پر ''بیٹھکی'' بھتیں اور الزامات نہ لگائیں مجھ پر بغیر فرمائش کے تبصرے نہ فرمائیں تو اللہ تمام شوہروں کو ناہید جیسی بیوی دے۔

پروفیسر شاہد اقبال فرماگئے ہیں کہ ''عجیب بیوی ہمیشہ اچھی لگتی ہے لیکن کیا کیجیے کہ دوسرے کی! وہ تو آخری حد کو بھی کراس کرنے چکر میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ''بیوی بس گونگی ہو بھائی باقی سب خیر ہے!'' اس پر پروفیسر مجیب ظفر انوار ہوگا!''

ناہید بس ''ناہید'' اللہ ان کو سدا سہاگن اور سلامت رکھے۔ پرنسپل ہونے والی ہیں اب میں سوچتا ہوں سزا میں کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک نہ لگانا پڑے۔ منیر نیازی کا کیا کروں۔

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

ناہید بی بی کے لیے کہاں تک بدلوں اپنے کو؟ وہی آخری سمجھوتہ کرلیں کہ ''جیسا ہے جہاں ہے کی بنیاد پر ادے کر دیں۔!'' تبدیلی ممکن انقلاب سکتا۔ روپئے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

زین مریم سے زیادہ عزیز مجھے حسن اور سعد ہیں۔ اللہ سب کو سلامت تا قیامت رکھے' آمین!

کتنی کہانیاں لکھی ہوں گی؟ بچوں کی پانچ ہزار تحریریں ہوں گی ہر قماش کی۔ اللہ کہاں کس پبلشر نے کیا چھاپ دیا۔ نہ رائلٹی دی نہ کتاب۔ جو پلے سے چھپوائیں وہ دوستوں میں تقسیم کر دیں۔ کوئی ریکارڈ نہیں۔

کس سے عاجز ہوں—— جھوٹے' خوشامد' چاپلوس' بناوٹی' دوغلے' منافق' مذہب سے بے گانہ' دوسرے کی شرافت کو اس کی بزدلی سمجھنے والوں سے' بیگانگی' لوڈ شیڈنگ' قتل و غارت گری سے تمام

سیاسی تنظیموں سے' کنڈ ذہن شاگردوں سے جو ختمی ہو چکے ہوں۔ معاشرتی ناہمواریوں سے۔ پستول سے جو دنیا کی سب سے خطرناک ایجاد ہے۔ بینکوں کے کریڈٹ کارڈز سے پلاسٹک منی کے قہر سے۔ اُف میرے اللہ!

کس سے خوش ہوں...... ؟ سب سے' کمپیوٹر سے' سوشل میڈیا سے' انٹرنیٹ سے' ناہید عجیب سے۔ اپنے سراج الدولہ گورنمنٹ ڈگری کالج سے' کھانے پینے' گھومنے پھرنے' اپنے معالجین سے' اپنے لائق شاگردوں سے' حسن اور سعد سے' بچوں کے رسائل سے' چاہے کہیں سے شائع ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ میں مگن رہنے سے۔ خوش رہتا ہوں۔ شوگر سے' ہائی بلڈ پریشر سے کہ الحمدللہ کنٹرول ہیں۔

پسند ہیں...... سچے اور مخلص لوگ۔ اپنی ماں یا بیوی کے ہاتھ کے کھانے۔ سعیدہ بھابھی کے بنائے ہوئے چھولے۔ بھانجی عنبرین کی بنائی ہوئی چائے۔ شہناز باجی کے مزے دار کھانے۔ ملکہ کی دال چاول' کوفتے' کڑھی' منگوچیاں' ہر طرح کے چائنیز' انالین کھانے' مچھلی کا دیوانہ ہوں۔ کریم آباد کی ''سردار فش'' شمالی ناظم آباد کا ''سی فوڈز'' ''محسن آباد کا'' مزے دار ''پسندیدہ ترین جگہیں ہیں۔ احباب کی دعوتیں بھی اکثر وہیں کرتا اور بیگم صاحب کے بے لاگ تبصرے کا منتظر رہتا ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ محترمہ کی زبان اور میرے کان دراز اور سخت جان ہوتے جا رہے ہیں۔ ہاہاہا!۔ دستگیر کالونی بلاک 15 جاوید نہاری کے برابر ایک باقر خانی والا ہے' آج تک وہیں سے لاتا ہوں۔ مدینہ بیکری' گلبرگ کے ڈائیٹ پاپے' تازہ بتازہ بن۔ مخصوص فیورٹ سفید' نارنجی' سرخ' سیاہ' آسمانی' گلابی' انگوری' پیازی' شنتالوی' آبنوسی' قرمزی' آتشی رنگ' ہوائی جہاز' ریل کا سفر۔ بی پارلز ڈائیوو کا سفر' بچوں کو پڑھانا اور ان کے لیے لکھنا۔ بحیثیت بشر اپنی تعریف و پذیرائی۔ اپنے ڈرائیور حضرات کہ سارے جہاں میں غریب گھماتے پھرتے ہیں۔ کسی روز چھٹی کرلیں تو باقاعدہ رونا شروع کردیتا ہوں۔ چنگ چی' خورشید باجی کے پاس لاہور گئے۔ وہاں بچوں نے شوقیہ ''چنگ چی'' کی سیریں کروائیں۔ کون آئس کریم بہت پسند ہے۔ مہندی والے ہاتھوں کی خوش بو اچھی لگتی ہیں۔ خواتین و حضرات کے گھنے سیاہ صحت مند چمکتے بال اور صاف دانت۔ اسمارٹ لوگ جن کا وزن مناسب ہو' اب ''پسندیدہ ہیں'' جب ''خود وزن

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کم کر رہا ہوں۔ کس قدر صبر آزما کام ہے۔ منہ روکنا اور کھانے پینے سے باز رہنا کس قدر مشکل ہے' کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اس کے زور بازو کا صرف دو ٹی وی پروگرام من کو بھائے۔ ''اپنا گھر'' اور ''قدوسی صاحب کی بیوہ''۔

شائع شدہ کتابوں میں ''خون آلود خنجر'' (الحسن اکادمی)، ''چابی والی موٹر'' (رنگ ادب پبلیکیشنز) پراسرار صندوق'' (رنگ ادب (پبلی کیشنز) ''سونے کا کیک'' (سید پبلشرز) بڑا مزے کا کام ہے اپنی کتاب آپ چھاپنا۔ طباعت کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے بھی اوپر نکل چکی ہیں۔

مجھے اپنی بہت سی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ چند ایک کے نام جو حافظہ میں رہ گئے ان میں......

• چراغ تلے' ایک بھن' سب نے کہا شکریہ ادیب' گرم گرم روٹیاں' بکرا عید' بند ڈبہ کا راز (ہمدرد نونہال) حسن اور سعد کی تمام کہانیاں (تعلیم و تربیت)

''پھول'' کی تمام کہانیاں' خاص کر ''دادا کی طرح'' سوری سر'' آئس کریم چھینٹے'' پچاس سال بعد'' برگ'' کیسے لکھوں؟'' ''خوب صورت'' سوری اے جی'' مجھ سے ملیے'' وغیرہ۔ پھول میں اختر عباس کے لیے لکھ کر مجھے خود بہت مزا آتا تھا۔ وہ مجھے چیک بھجواتا' میں منی آرڈر پر مصر رہتا۔ اپنے ڈاکیے شوکت صاحب کو تین سو روپے کی منی آرڈر میں سے دس بیس روپے ضرور دیا کرتا۔ یہ تیس سال پرانی باتیں ہیں۔

نونہال میں خوب لکھا۔ ایک کہانی ''آپ مدد آپ'' اور ''بیساکھیاں'' کی محترم مسعود احمد برکاتی صاحب نے بھی تعریف کی تھی۔ اب اتنا لکھ چکا ہوں کہ دل چاہتا ہے چالیس سال پہلے لکھا ہوا ''ری پرنٹ'' کر دے کوئی رسالہ چار یا پانچ بیچز میٹرک کر چکے ہوں گے جو اسکولوں میں ہیں انہوں نے میری 70 اور 80 کی دہائی کی کہانیاں نہیں پڑھی ہوں گی۔ مجھے اپنے دوست عبدالعزیز عزمی کی بچوں کے ادیبوں کی ڈائری بھی بہت اچھی لگا کرتی تھی جو وہ ''نوٹ بنوٹ'' میں لکھا کرتا تھا۔ بے وقت مرحوم ہوا۔ سگریٹ پیتا وہ منع کرتا' اور پیتا اے او کالج ناظم آباد میں پابندی سے ''بزم دانش'' کا انعقاد کرتا' پکوڑے' سموسے' نمک پارے لازمی لاتا' مجھے بھوک لگا کرتی' سامان کے پاس جا کر کھا پی لیا کرتا۔ خوب کڑھتا' دو چار سگریٹ زیادہ پی جاتا۔ گالیاں اس لیے نہیں دیتا کہ پھر میں اس سے زیادہ مغلظات کا ماہر' پرانا پاپی بابا' ابن آس کا بھی

ابی حال...... چین اسموکر! اللہ جانے پان' سگریٹ سے ایک نفرت سی ہے مجھے۔ شروع سے روح افزا پسندیدہ مشروب ہے۔ گنے کا تازہ رس' شوگر کے عارضہ نے انتہائی محتاط کر دیا ہے۔ مگر شوگر کے عارضہ نے انتہائی محتاط کر دیا ہے مگر شوگر فری مٹھائی ''بھاشانی'' کھا لیتا ہوں۔ کچا گلہ نہایت مرغوب ہے۔ سرسید کالج کے برابر رضویہ مارکیٹ کے حلوائی کے نمک پارے انتہائی لذیذ ہوتے ہیں۔ بیگم اس قدر مزے دار چائے بناتی ہیں کہ اس میں ڈبو ڈبو کر کھاتا ہوں۔ ناظم کے کینٹے ذائقہ آج بھی یاد ہے۔ تمام ہوٹل اور کھانے پینے کی جگہیں جن کی میں نے مفت میں مشہوری کر دی مارکیٹنگ کے آداب کے تحت اشتہارات دیں اپنے بابا!

میرے خیال میں موضوع سے بالکل اتر چکا ہوں۔ تحریروں کے ساتھ پھر کھانا پینا شروع تو ہے آپ بیتی یا یادداشتیں لکھنے کا قطعی ارادہ نہیں تھا' بس نوشاد عادل سے وعدہ کر کے پھنس گیا اب لکھتا ہوں۔

خواہشات...... پاکستان چلڈرن رائٹرز گلڈ کو عالمی ادارہ بنانا' حج بیت اللہ شریف۔ بیگم صاحب کے ذاتی بنگلے کی جلد از جلد تعمیر جہاں کرایہ ادا کر کے برسوں رہوں۔ آمین!

بہت سارے ایوارڈز ملے۔ سب سے پہلے رسالے میں بچوں کے خطوط پڑھتا ہوں کہ انہوں نے میری کہانیوں کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ جب عالمی ''وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا'' نے دو ہزار کے قریب روابط کی مدد سے اردو اور انگریزی میں میرے صفحات بنائے تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ ان ایڈیٹرز کا باقاعدہ وجود ہے اور وہ خوب کام کر رہے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ وہ مدیران پروفیسر ظریف خان اور مسعود احمد برکاتی صاحبان کے صفحات بھی بنائیں۔ اس سلسلے میں امریکا جناب تنویر پھول سے خاصی بات چیت ہوئی تا حال برف جمی ہے' لیکن انٹرنیٹ کی دنیا عجیب دنیا ہے۔ عارضی شہرت ہے۔ اصل نام کتاب میں ہے۔ کتاب اولاد سے بڑھ کر ہے' جو آپ کو زندہ جاوید کرتی ہے۔ اگر کسی بچہ کو چھپے ہوئے لفظ سے محبت سے ہو جائے تو وہ لکھنا شروع کر دے گا' خوب لکھے گا۔

مجھے نیشنل بک فاؤنڈیشن یونی سیف نے بھی اعزازات دیے۔ سب کا شکریہ! محترم مظہر یوسف زئی صاحب نے مجھے نیشنل بک فاؤنڈیشن ''مسودہ'' ٹی سی ایس کرنے کا طریقہ بتایا تھا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

لیکن بھائی بندوں نے جعلی ناموں سے مسودے بھیجنا شروع کر دیے۔ نتیجتاً ان لوگوں نے نقد انعامات کا وہ سلسلہ موقوف کیا اور ایک نئے سسٹم کو فروغ دیا۔ ہمیں اچھی باتیں اور اچھی روایات کیوں راس نہیں آتیں؟

اردو ڈائجسٹ'' برسوں سے میرے سرہانے ہے' شاید اختر عباس جہاں کہیں لکھے گا وہی رسالہ میرے سرہانے ہوگا۔ اخبار جہاں اور اخبار خواتین کا وقیع کام ہے۔ فلمی صحافت میں جناب الیاس رشیدی جو میرے والد صاحب کے دوستوں میں سے تھے ان کا ''نگار'' اور انڈیا کا ''شمع'' دہلی ابھی فلمی پرچے رہے۔ انہوں نے فلمی صحافت کو فروغ دیا۔

محترم علی سفیان آفاقی صاحب جو آج کل ''ہفت روزہ فیملی میگزین'' (نوائے وقت) مدیر ہیں' فلمی صحافت کا معتبر ترین حوالہ ہیں۔

محترم پروفیسر عظمت علی خان صاحب نے ''بزم سائنسی ادب'' کی ماہانہ نشستوں کے ذریعہ سائنسی ادب کو زندہ کر دیا اور سید احمد خان کی روایات کی پاس داری کی' مرحوم ہوئے' سائنسی ادب اور دنیائے کیمیا میں عظمت علی خان کا بڑا نام ہے۔ بچوں کے تمام رسالوں نے محنت کی ہے۔

مجھے ''بزم منزل''، ''بزم قرآن'' کرن کرن روشنی'' کو دیکھ کر حقیقتاً دلی مسرت ہوتی ہے کہ بغیر اشتہارات کے رسالہ شائع کرنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اللہ ہمت دے' آمین! یہ تمام افراد اور ادارے میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں!

آخری بات..... ادیب بے وقت کی فی الحال یہ بات سن لیجئے کہ محبتوں کو فروغ دیجئے۔ اشفاق احمد صاحب' ممتاز مفتی صاحب' جگر مراد آبادی صاحب کو خوب پڑھیے۔ مرغوب تعلیمات پر عمل کیجئے۔ انسان کی عزت کیجئے۔ بچوں سے پیار کیجئے۔ پاکستان کو مضبوط بنائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو! آمین!

ساقی فاروقی کے اس شعر پر بات ختم!

محنت سے جو کام کرے وہ سب سے بڑا انسان
محنت زندہ قوموں کی ہے عظمت کی پہچان

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محبوب الٰہی مخمور

پیکر خلوص و محبت، دوستوں کے دوست، ادب دوست، دھن کے پکے، وعدے کے سچے۔ ان کا شمار پاکستان کے ان چند افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بچوں کے ادب کو بنا رکھا ہے۔ ماہنامہ انوکھی کہانیاں کے مدیر اعلیٰ، بچوں اور بڑوں کے ادیب، کئی شاہکار کتابوں کے ایوارڈ یافتہ مصنف۔ ان گنت قلم کاروں کو نمایاں کرنے اور کامیابی کے سفر پر گامزن کرنے والے قلم کے سپاہی، جن کا نام پاکستانی بچوں کی ادب میں نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔

ادب اور ادیبوں کے محبوب، محبوب الٰہی مخمور کی جدوجہد اور زندگی کے نشیب و فراز کی پر اثر روداد۔

مدیر انوکھی کہانیاں، صدر پاکستان چلڈرن رائٹرز گلڈ [illegible]

اور [illegible] ایوارڈ یافتہ ادیب

آج سے تقریباً 45 سال قبل عشاء کا وقت تھا، جب میں اس دنیائے فانی میں وارد ہوا۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد ہوں۔ میرے بعد پانچ بہنیں اور دو بھائی اور ہیں۔ ددھیال میں ...... میں سب سے بڑا ہوں خصوصاً لڑکوں میں۔

میرا بچپن عام بچوں کی طرح گزرا۔ اس زمانے میں ہماری رہائش لیاقت آباد میں تھی۔ میرے والدین اور میرے ننھیال والے قریب قریب رہائش پذیر تھے۔ بچپن میں مجھے ٹھنڈ کی بہت شکایت ہو جاتی تھی۔ میری والدہ اس وقت کم عمر تھیں، اس لیے علاج معالجے کی فکر میری نانی اماں کو کرنی پڑتی تھی۔ میرے لیے میری نانی اماں ڈاکٹر، حکیم اور مولوی سب کے پاس جاتی تھیں۔ اکثر سردیوں میں میرے جھولے کے نزدیک میری نانی اماں انگیٹھی جلا کر رکھ دیتی تھیں اور پوری پوری رات مجھے جھولا دیتی رہتی تھیں۔

بچپن کے دن لیاقت آباد بی ایریا کی گلیوں میں گزرنے لگے۔ میرے محلے داروں میں اسلم،

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

شہزاد، وقار، شفیق، قمر اور وحید شامل تھے۔ مجھ سے کچھ بڑے کفیل، ضیاء، شکیل وغیرہ تھے۔
ہمارے محلے میں اس زمانے میں ٹی وی صرف خلیل صاحب کے گھر میں تھا۔ تمام بچے ان کے گھر جا کر ٹی وی دیکھا کرتے تھے۔ بچپن کے ٹی وی پروگراموں میں مجھے دی سینٹ، دی مین فرام انکل، پلانٹ آف دی ایپس، ڈینجر مین، انکل عرفی، شمع، خدا کی بستی وغیرہ بہت اچھے لگتے تھے۔

بچپن کے کھیلوں میں گلی ڈنڈا، کل کل کانا، ایپرس، گولیاں کھیلنا، لٹو چلانا اور سگریٹوں کے خالی پیکٹ جمع کرنے کا جنون تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سائیکل (جو کہ کرائے پر ملتی تھی) چلانے کا شوق تھا۔ دوپہر کی تپتی دھوپ میں سائیکل لے کر نکل جاتے تھے اور خوب چلاتے تھے۔ کچھ بڑے ہوئے تو ندی سے مچھلیاں پکڑنے کا خیال آیا۔ اکثر ندی پر چلے جاتے اور مچھلیاں پکڑتے تھے۔
ہمارے گھر میں گوندنی کا درخت تھا۔ میں اس پر چڑھ جاتا اور گوندنیاں توڑ توڑ کر کھاتا رہتا تھا۔ میرے بڑے ماموں سید شفیع الزماں بھی گوندنیاں توڑتے جاتے اور مجھے دیتے جاتے تھے۔

رات کو محلے کے تمام بچے جمع ہو جاتے اور خوب شور کرتے تھے۔ ہمارے محلے میں رہائش پذیر ضیاء کے والد حسنین صاحب گھر سے نکل کر ہمیں ڈانٹتے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی سب رفو چکر ہو جاتے۔

پانچ سال کی عمر میں امی جان کو مجھے اسکول میں داخل کرانے کا خیال آیا اور میرا بلدیہ عظمیٰ کراچی کے اسکول میں داخلہ کرا دیا گیا۔ میں کبھی اسکول جاتا تھا کبھی نہیں۔ اسی طرح سالانہ امتحانات ہوئے جب نتیجہ نکلا تو میں فیل ہو گیا تھا، کیوں کہ مجھے کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ اب میرے والد کو میری فکر لاحق ہوئی۔ انہوں نے میرے لیے ٹیوشن لگا دی، مگر وہ تین مختلف ٹیچرز بھی مجھے نہ پڑھا سکے۔ اس کے بعد مجھے پڑھانے کی ذمہ داری میرے ماموں سید عزیز اللہ حسنین کو دی گئی۔ انہوں نے بڑی مہارت سے مجھے پڑھایا اور میں پڑھائی میں چل نکلا اور اگلے ہی امتحان میں میری پوزیشن آئی اور یوں ہر کلاس میں پانچویں تک میں پوزیشن لیتا رہا ہوں۔
پڑھائی میں، میں ہمیشہ اول رہا۔ میری ٹیچرز میڈم شوکت، میڈم ممتاز اور میڈم نجمہ نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور ان تینوں ٹیچرز کو میں اب بھی یاد کرتا ہوں۔ ہمارے اسکول کی اگلی گلی میں ایک انگلش میڈیم اسکول تھا، جس کے طلبہ سے اکثر ہمارا جھگڑا ہوتا تھا۔ ہمارے اسکول کا

گروپ اکثر اس اسکول پر پتھراؤ کرتا تھا۔ تمام تر شرارتوں کے باوجود پڑھائی میں، میں اول ہی رہا۔ پرائمری میں میرے دوست نعیم خان، عبدالجبار (جیکب لائن)، عاشقین اور شاکر تھے۔

پانچویں پاس کرنے کے بعد میں نے انجمن اسلامیہ اسکول، لیاقت آباد نمبر دس میں داخلہ لیا، یہاں ہر جماعت کے چار سیکشن تھے اور سیکڑوں کی تعداد میں لڑکے تھے۔ چھٹی جماعت میں میری دوستی محمد یونس سورتی اور شہاب الدین غوری سے ہوئی اور آج اس دوستی کو 40 سال ہو گئے ہیں۔ ہماری بچپن کی دوستی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قائم و دائم ہے۔ سیکنڈری میں ہمارا معمول تھا کہ اسکول کا کام وہیں کر لیا کرتے تھے۔ اسکول جانے کے لیے میں ایک کلومیٹر پیدل چلا کرتا تھا اور ہاف ٹائم میں...... میں اور یونس کینو کھایا کرتے تھے۔ چار آنے کے چار کینو آتے تھے۔ ہاف ٹائم میں کینو والے کے ٹھیلے پر لڑکوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ پیسے یونس کے پاس ہوتے تھے۔ میں اور وہ کینو والے کے پاس جاتے تھے۔ میں چار کینو لیا کرتا تھا۔ ٹھیلے والا اگر دیکھ لیتا تو یونس میرے والے کینو کے بدلے اسے پیسے دے دیا کرتا تھا۔ اگر وہ نہ دیکھتا تو وہ ان پیسوں کے چار کینو اور لے لیتا تھا۔ پھر ہم دونوں اسکول کے فرش پر بیٹھ کر کینو کھاتے تھے۔

میرے والد صاحب الٰہی بخش چشتی (تونسوی) نے ہم بہنوں بھائیوں کو تمام سہولیات مہیا کر رکھی تھیں۔ میرے والد صاحب خاندان کے سب سے پہلے میٹرک پاس ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈبل ایم اے تک اور باقی سب بہن بھائیوں کو بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کی سہولیات مہیا کیں۔ ہم نے بھی کوئی کام نہ کیا۔ اچھا کھایا اچھا پہنا۔ والد صاحب نے ایک کی جگہ دو دو نوکریاں کیں، مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا، بلکہ اکثر خاندان والوں کی مدد کی۔ ابا جان نے اپنے بہن بھائیوں کو بھی پیروں پر کھڑا کیا۔ ہمارے ددھیال کے اکثر افراد آج پاکستان یا یو اے ای میں ہیں اور خوب کما رہے ہیں، ان سب کی میرے والد نے کسی نہ کسی طور پر مدد کی۔ احسان جتانا ان کی فطرت میں نہیں تھا، بلکہ نیکی کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ 2000ء میں انہوں نے ایک اور نیکی کی، جو ان کے گلے پڑ گئی ہے، مگر انہوں نے اپنی تمام نیکیوں کا صلہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔
اپنے والد صاحب کا حوصلہ دیکھتا ہوں کہ وہ اکثر برے سے برے معاملات کو بڑی استقامت سے برداشت کرتے تھے اور بہت سی باتوں کو درگزر کر دیتے ہیں، جن باتوں پر اکثر مجھے غصہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

آجاتا ہے وہ درگزر کرنے کا کہتے تھے۔

میرے والد صاحب کی زندگی مسلسل محنت اور جدوجہد پر مشتمل ہے ان جیسا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ میری زندگی کے تمام معاملات میں ان کی راہنمائی میرے ہمراہ رہی ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی بدولت آج میں اس مقام پر ہوں۔ میں نے کبھی ان کو مایوس نہیں دیکھا۔ ہمیشہ پر امید دیکھا ہے۔ ان کی زندگی میرے لیے مشعل راہ ہے۔

والد صاحب کے ساتھ میری کمپنی 23 جنوری 2003ء تک رہی۔ ان کی راہنمائی ہر سو میرے ساتھ رہی۔ ہر معاملے میں انہوں نے صحیح مشورہ دیا۔ 23 جنوری 2003ء کو اچانک ان کی طبیعت خراب ہوئی اور شام سات بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ میری زندگی کا ایک دردناک واقعہ تھا کہ میں پوری رات اپنی والدہ کو یہ بتاتا رہا کہ والد صاحب آئی سی یو میں زندہ ہیں۔ ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے الٰہی پبلی کیشنز" کے نام سے میں نے ایک ادارہ قائم کیا، جس سے تقریباً متعدد کتابوں کی اشاعت کر چکا ہوں اور اس ادارے کا مقصد ہی فروغ بچوں کا ادب ہے۔

میری زندگی کا دوسرا دردناک واقعہ میرے پھوپھی زاد بھائی عبدالندیم خان شانی کی وفات کا ہے۔

یہ دسمبر 2009ء کی بات ہے۔ میں اور بچو پھا جان (شانی کے والد) ایکسپو سینٹر سے آئے تھے۔ وہاں بک فیئر لگی ہوئی تھی اور الٰہی پبلی کیشنز کا اسٹال تھا۔ گھر آئے تو پتا چلا کہ شانی کو بدہضمی کی شکایت ہے اور وہ ہمارے سامنے بیٹھا تھا۔ اُس نے ہاضمے کی چند ایک گولیاں کھائیں۔ جب طبیعت نہ سنبھلی تو ہم محلے میں موجود ڈاکٹر کے پاس اُسے لے کر گئے، مگر سب کلینک بند تھے۔ اُسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ ہم نے اُسے میڈیکل اسٹور سے ہاضمہ کا ساشہ سٹرا سوڈا لے کر پلایا۔ طبیعت جب بہتر نہ ہوئی تو ہسپتال چلنے کے لیے کہا، مگر شانی نہ مانا اور اپنے فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں ٹہلنے لگا اور مجھ سے کہا کہ آپ گھر جائیں، میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ میں واپس آ گیا اور چند منٹ کے بعد فون آیا کہ شانی کی طبیعت مزید خراب ہوگئی ہے۔ میں دوڑ کر پہنچا تو وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اسے لے کر ہسپتال پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ ایک انتہائی کرب ناک خبر تھی ایک پچیس سال کا بالکل ٹھیک ٹھاک نوجوان، جو پورے خاندان کی آنکھ کا تارا تھا، بلکہ

اپنے رہائشی علاقے میں ہر شخص کی مدد کرتا تھا اور کسی کو مشکل میں نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا ہے، جسے ایک آواز دینے کی دیر ہوتی تھی..... وہ کئی کئی چکر لگاتا تھا اور ہر دم کسی بھی کام کے لیے تیار رہتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ میرے کپڑے، موٹر سائیکل کی مرمت وسروس اور گھر کے مسائل حل کرنے کے لیے پیش پیش رہتا تھا۔ وہ اس طرح اچانک چلا جائے گا، کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ تا حال اس سانحے کو بھلانے سے قاصر ہوں۔

میری آپ بیتی کا ایک حصہ شہاب الدین غوری کے گرد گھومتا ہے۔ اکثر اسکول کے زمانے میں اور عملی زندگی میں میری اکثر باتوں کا راز دان شہاب الدین ہے۔ اسے کوئی پریشانی ہوتی ہے تو فوراً مجھ سے رابطہ کرتا ہے اور میں اور شہاب تین تین گھنٹے لیاقت آباد نرسری پارک میں بیٹھ کر اپنے اپنے مسائل زیر بحث لاتے ہیں اور پھر ان کا حل نکالتے ہیں۔ میں اور شہاب مل کر اکثر یونس سورتی کے گھر جاتے تھے اور اب بھی جاتے ہیں۔ یونس کے گھر بیٹھ کر پرانے زمانے (اسکول لائف) کو یاد کر کے خوش ہوتے ہیں، اچھے دنوں کو انجوائے کرتے ہیں۔ اب یہ دوستی ہمارے بچوں میں منتقل ہوگئی ہے۔

اپنے ماموں سید رفیع الزماں سے بھی میری بڑی اچھی کمپنی ہے۔ اکثر مسائل کے حل کے لیے وہ میرے بہت کام آتے ہیں اور اکثر ان سے بہت لمبی لمبی میٹنگ ہوتی ہیں۔ میں ان کا سب سے چہیتا بھانجا ہوں۔

میری آپ بیتی کا ایک حصہ خرم لودھی بھی ہے۔ خرم لودھی میرے والد کے دوست محب لودھی صاحب کا فرزند ہے۔ میرے والد صاحب کی محب لودھی صاحب سے دوستی پچاس سال سے ہے اور اب یہ دوستی مجھ میں اور خرم لودھی میں منتقل ہوگئی ہے۔ 1990ء میں، میں اور میرے چچا نور محمد لاہور کی سیر کے لیے گئے۔ وہاں پر ہماری رہائش منصورہ میں تھی۔ میں اور چچا محب لودھی کے گھر چوبرجی چلے گئے، جہاں ایک لمبے سے لڑکے سے ملاقات ہوئی، جو کہ بہت ہی سنجیدہ تھا۔ اسے لے کر ہم لاہور کی سیر کے لیے نکل گئے۔ خوب گھومے خوب انجوائے کیا، مگر خرم لودھی بزرگوں کی طرح سیر کرتا رہا۔ اس میں شوخی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ میں اور چچا مختلف مقامات پر تفریح کرتے رہے۔ یہ میری اور خرم کی پہلی ملاقات تھی۔ وہاں سے اسلام آباد اور مری کی جانب

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

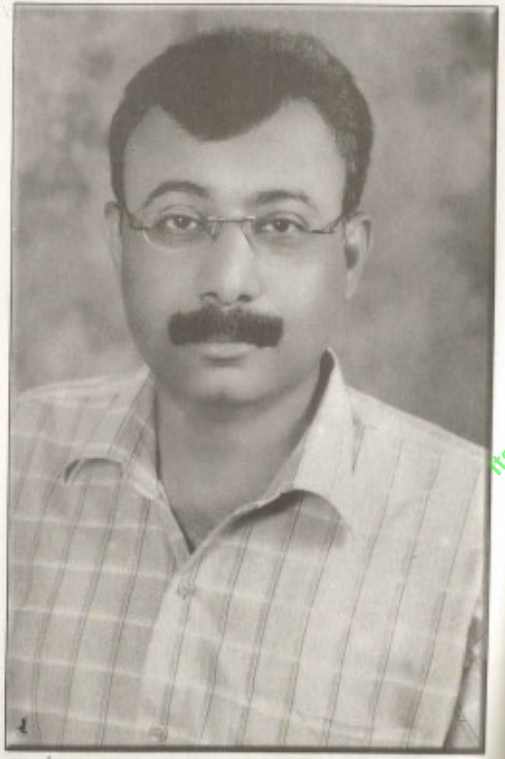

محبوب الٰہی مخمور

ہم نکل گئے اور صحیح معنوں میں سیاحت کی۔

1991ء میں چچا نور محمد کی شادی ہوئی، جس کی تمام انتظامات میرے ذمہ تھے۔ مہندی، شادی اور ولیمہ سب میں ہی پیش پیش تھا۔ اس شادی میں خرم لودھی بھی لاہور سے کراچی آیا تھا۔ اس پر سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے شادی کی تقریبات میں میری اور دیگر افراد کی کارکردگی دیکھی اور ہم نے خوب خوب انجوائے کیا۔ ان تمام امور کا خرم نے گہری نگاہ سے مشاہدہ کیا۔ خرم سے میری دوستی یہیں سے شروع ہوئی اور وہ میرے نزدیک ہو گیا۔ اس سے دوستی پکی ہوتی گئی۔ واپس جا کر وہ بھی سب سے گھل مل گیا اور اس کا طرز زندگی تبدیل ہو گیا۔ خرم لودھی کی صورت میں مجھے ایک محبت کرنے والا دوست مل گیا۔ میں سال میں دو مرتبہ لاہور ضرور جاتا ہوں اور میری رہائش خرم کے گھر ہی ہوتی ہے۔ وہاں سب ہی اچھے ہیں۔ جب کبھی میں پریشانیوں کا شکار ہوتا ہوں تو لاہور چلا جاتا ہوں۔ خرم لودھی میرے لیے ہر دم ہر گھڑی تیار رہتا ہے۔ ماہنامہ "انوکھی کہانیاں" کے لیے خرم لودھی نے بے شمار اشتہارات لیے ہیں جن کا اس نے کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ کراچی میں دو سال تک خرم کوریئر کمپنی چلاتا رہا اور میں ہر دم اس کے ساتھ رہا۔ گذشتہ بیس سال سے میں ہوں، خرم ہے اور اس کی موٹر سائیکل ہے۔ میں یہ بات فخریہ کہتا ہوں کہ خرم لودھی کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور زندگی کو وہ بہت قریب سے جانتا ہے۔ کبھی وہ بچہ بن جاتا ہے اور میری انگلی پکڑ کر زندگی کی راہوں پر آنکھیں بند کر کے نکل جاتا ہے اور کبھی میرا بزرگ بن کر مفید مشوروں سے نوازتا ہے۔

خرم لودھی کی والدہ محترمہ زاہدہ لودھی اور خرم کی دادی جان سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ زاہدہ لودھی صاحبہ مجھے خرم کا بڑا بھائی کہتی تھیں اور صرف کہتی ہی نہیں تھیں، بلکہ مانتی بھی تھیں۔ کئی ایک مواقع پر انہوں نے خرم لودھی کے ساتھ مجھے خاندانی معاملات کو سلجھانے کے لیے بھیجا اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ معاملات میں نے اور خرم نے حل کیے۔

میں جب لاہور جاتا تھا تو جواد لودھی اور مدیحہ لودھی، جو کہ خرم سے ڈرتے تھے۔ مجھ سے فرمائش کرتے تھے۔ خاص کر چاکلیٹ آئس کریم کی۔ میں فوراً ان کے لیے خرم کے ساتھ بائیک پر آئس کریم لینے جاتا تھا اور پھر گھر پر سب خوب انجوائے کرتے تھے۔

میں نے لاہور میں متعدد شادیوں میں شرکت کی اور خوب لطف اندوز ہوا۔ زاہدہ لودھی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محبوب الٰہی مخمور کی سابق گورنر سندھ اور موجودہ صدر پاکستان جناب ممنون حسین سے
1998ء میں ایک ملاقات کی یادگار تصویر

محبوب الٰہی مخمور، سابق نگراں وزیر اعظم ملک معراج خالد سے ایوارڈ وصول کرتے ہوئے

محبوب الٰہی مخمور کی حکیم سعید کے ساتھ یادگار تصویر

ایک یادگار تصویر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

صاحبہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ لاہور سے تیس چالیس کلومیٹر دور چونیاں میں پڑھاتی تھیں، جہاں ان کا میکہ بھی تھا۔ پورے ہفتے وہ چونیاں میں رہتی تھیں اور ہفتے کی شام کو لاہور آتی تھیں اور پیر کی صبح منہ اندھیرے واپس چونیاں روانہ ہوتیں۔ بچوں کے مستقبل کے لیے انھوں نے دن رات ایک کر دیئے۔ اس دوران گھر کی ذمہ داری خرم لودھی کی دادی اماں سنبھالتی تھیں۔ خرم لودھی نے اپنی والدہ محترمہ سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے انتقال کو عرصہ ہو گیا ہے، مگر اس باہمت خاتون کی یاد ہمارے دل سے نہیں جاتی۔ ان کا خلوص، ان کی محبت، ان کی چاہت اور سگی پھوپھی سے بڑھ کر ان کا پیار آج بھی میری یادوں میں شامل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میرے پہلے بیٹے عمیر الٰہی کی پیدائش پر انہوں نے مسرت کا اظہار اس بات پر کیا تھا کہ میں نے پہلے اس کا نام احمر رکھا تھا، جو اُن کا پسندیدہ نام تھا۔

ماہنامہ انوکھی کہانیاں کی جانب سے میں نے متعدد ادیبوں کو نیشنل بک فاؤنڈیشن کے مقابلہ فروغ بچوں کے ادب میں شامل کروایا اور متعدد ادیبوں کو انعامات ملے۔ اس سلسلے میں محترمہ افشاں ساجد کا کردار سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ انہوں نے بچوں کے ادیبوں کی بے پناہ حوصلہ افزائی کی خصوصاً فکشن کے شعبہ میں کتابیں اور مسودے بڑی تعداد میں انہیں موصول ہوتے تھے۔ انہوں نے اس شعبہ کے سیکڑوں بچوں کے ادیبوں کو انعام دیئے ہیں۔ بچوں کے ادیبوں کی ہر ممکن راہنمائی بھی کی ہے اور پوری ایمان داری سے نتائج کے مطابق انعامات ارسال کیے۔ سابق سکریٹری NBF اسلم راؤ نے بھی بڑا فعال اور بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ فروغ بچوں کے ادب اور کتابوں کے فروغ اور مطالعہ کتب کو عام کرنے کے لیے GTZ نے اچھا کردار ادا کیا ہے خاص کر GTZ کے اعجاز شاہ نے بچوں کے رسائل کو اعزازی اسٹال دیئے اور بچوں کے ادب کو بے حد فروغ دیا اور بچوں کے رسائل کے مدیران کو خصوصی پروٹوکول دیا گیا اور انٹرنیشنل بک فیئر میں فرداً فرداً بچوں کے ادب سے وابستہ شخصیات سے ملاقات کر کے ان کے لیے بہترین انتظامات کرائے۔ اعجاز شاہ اور GTZ نے بچوں کے ادب کے لیے انعامات وغیرہ کے لیے بے انتہا تعاون کیا ہے۔ بچوں کے ادب کو اعجاز شاہ صاحب جیسے پرخلوص شخص کی شدید ضرورت ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کی بحریہ ٹاؤن کے ریاض ملک جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں پاکستانیوں کی مدد

itsurdu.blogspot.com

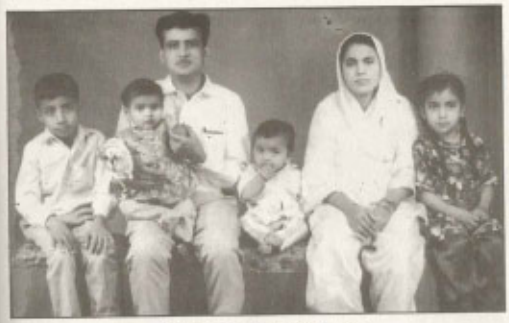

محبوب الٰہی مخمور کی اپنی فیملی کے ساتھ بچپن کی تصویر

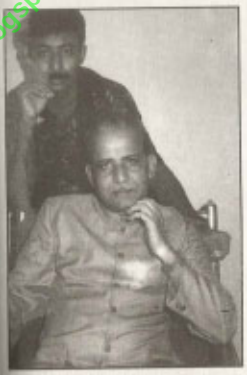

محبوب الٰہی اپنے والد الٰہی بخش پشتی صاحب کے ساتھ

محبوب الٰہی مخمور کی بچپن کی تصویر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کر رہے ہیں، وہیں انھیں شعبہ بچوں کا ادب کے فروغ کے لیے اپنا فعال کردار ادا کرنا چاہیے۔

پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ کی جانب سے بحریہ ٹاؤن کے بانی و چیئرمین جناب ملک ریاض کو گائیڈ کے لیٹر ہیڈ پر ایک تفصیلی لیٹر بھیجا گیا جس کے ساتھ اُن کی کہانیاں کے کئی شمارے اور اپنی پبلی کیشنز کی شائع کی ہوئی بہت سی کتابوں کا سیٹ بھی بھیجا گیا تھا۔ اس لیٹر میں پاکستانی بچوں کے ادب کی زبوں حالی کا تفصیلی ذکر کیا گیا تھا۔ ساتھ میں کئی نمایاں اشخاص کا تذکرہ بھی تھا، جنھوں نے بچوں کے ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ڈالا۔ خاص طور پر شہید حکیم محمد سعید اور اُن کی ادبی خدمات کا حوالہ دیا تھا کہ شہید حکیم محمد سعید کی اس ملک کے لیے بے شمار خدمات ہیں، لیکن اُن کے نام کو صرف ہمدرد نونہال نے ہی گھر گھر پہنچایا اور ہمدرد نونہال نے ہی صحیح معنوں میں اب تک نئی نسل میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ جہاں آپ نادار لوگوں کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں، مصیبت زدہ ہم وطنوں کی دادرسی اور مالی امداد میں کوشاں ہیں، وہاں آپ پاکستان کے سسکتے ہوئے بچوں کے ادب کی طرف بھی توجہ کریں۔ ہم آپ سے اپنے لیے ایک روپیہ نہیں مانگتے، بس یہ چاہتے ہیں کہ آپ پاکستان کے بچوں کے ادب پر احسان کریں۔ ہم پاکستان میں بچوں کے ادب کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں، جو ادب کے سلسلے میں وہ کام سرانجام دے گا، جو پاکستان کی تاریخ میں کبھی نہیں کیے گئے۔ اگر آپ نے یہ کام کر دیا تو یقین جانیں کہ آپ پاکستان کی تاریخ کے واحد اور پہلے شخص ہوں گے جس نے اس شعبے کو زندہ کیا اور رہتی دنیا آپ کو محسن بچوں کا ادب کے نام سے ہمیشہ یاد رکھے گی۔

پاکستان چلڈرن گائیڈ کا لیٹر بحریہ ٹاؤن راول پنڈی کے ہیڈ آفس بھیجا گیا تھا۔ پھر میں نے وہاں کئی فون کیے۔ آخر ملک ریاض صاحب کے پرسنل سیکریٹری...... سے بات ہو ہی گئی۔ جب میں نے گائیڈ کے لیٹر اور کتابوں کا ذکر کیا تو اُنھوں نے فوراً پہچان لیا۔

"اچھا...... اچھا...... وہ لیٹر...... جس میں آپ نے لکھا ہے کہ ہم آپ سے اپنے لیے ایک روپیہ بھی نہیں مانگتے...... وہی لیٹر؟"

"جی ہاں وہی...... اس کے ساتھ کچھ کتابیں بھی بھیجی ہیں۔"

"جی وہ مل گیا ہے اور ملک صاحب کی ٹیبل پر رکھ دیا ہے۔ ابھی وہ ملک سے باہر ہیں، جیسے ہی

آئیں گے تو اُن کو بتا دیا جائے گا...... پھر وہ جو فیصلہ کریں گے آپ کو کال کر کے خبر دے دوں گا۔"

میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ایک ماہ بعد جب کوئی کال نہیں آئی تو اُن سے دوبارہ رابطہ کیا۔

"وہ آ تو گئے ہیں، لیکن ابھی کئی دنوں سے آفس نہیں آئے۔" پرسنل سیکریٹری نے میرے استفسار پر جواب دیا۔

"کب تک اُمید ہے آنے کی؟" میں نے پوچھا۔

"اب میں کیا بتا سکتا ہوں...... سیٹھ آدمی ہیں، جب مرضی ہوگی آ جائیں گے۔"

اس کے بعد مزید دو ماہ گزر گئے۔ یہ 2013 کی بات ہے۔ دو ماہ بعد ایک بار پھر کال کی تو جواب ملا کہ بقر عید کے بعد آئیں گے۔ کچھ اور وقت گزر گیا۔ ہمیں اُمید تھی کہ اگر ملک صاحب نے ہمارا لیٹر پڑھ لیا تو کبھی انکار نہیں کریں گے، کیوں کہ ہم نے اپنے لیے نہیں بلکہ پاکستانی بچوں کے ادب کے لیے مدد مانگی تھی۔ آخر بقر عید کے بعد کئی ہفتے گزر گئے تو میں نے پھر کال کی۔

اس بار ملک ریاض صاحب کے پرسنل سیکریٹری نے ذومعنی انداز میں جواب دیا تھا۔

"اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ہے...... اب آپ سمجھ جائیں کہ کیا معاملہ ہے۔"

"اچھا...... ٹھیک ہے...... آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے مختصر جواب دیا تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ملک ریاض صاحب نے ہمارا لیٹر پڑھا بھی تھا کہ نہیں...... یا پڑھے بغیر انکار کر دیا تھا۔ ہماری یہ کوشش صرف اور صرف پاکستانی بچوں کے ادب کے لیے تھی۔ اس کے باوجود ہم نا اُمید نہیں ہیں۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ ہم نے خلوص دل سے اپنی سی کوشش کی تھی۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن اور اعجاز شاہ صاحب نے اسلام آباد میں بچوں کے ادیبوں کے لیے ورکشاپ منعقد کروائے گئے، جس میں...... میں نے اور بے شمار بچوں کے ادیبوں نے میرٹ کی بنیاد پر شرکت کی۔ یہاں افشاں ساجد صاحبہ نے سب سے مکمل تعاون کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ NBF میں احمد فراز صاحب، اسلم راؤ صاحب اور محترمہ افشاں ساجد کی کارکردگی قابل تحسین و قابل ستائش ہے۔ فروغ بچوں کا ادب اور لائبریریوں کے لیے کتابوں کی خریداری اور ادیبوں کو

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ان کے چیک بھجوانے میں افشاں ساجد صاحبہ نے دن رات کام کیا ہے۔ افشاں ساجد صاحبہ کی بے لوث اور شان دار کارکردگی کے آج بھی مجھ سمیت سیکڑوں ادیب معترف ہیں۔ ساتھ ہی موجودہ سربراہ این بی ایف ڈاکٹر انعام الحق جاوید سے بھی مجھے اور بچوں کے ادیبوں کو بہت سی اچھی اُمیدیں ہیں، کیوں کہ وہ ایک علمی، ادبی اور تعلیمی بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔

آج (2014ء تک) مجھے بچوں کے ادب سے وابستہ ہوئے 35 سال ہو گئے ہیں۔ متعدد مدیران و رسائل میری یادداشت میں ہیں۔ نونہال میں مسعود احمد برکاتی صاحب اور معلومات عامہ کے انچارج کھتری عصمت علی پٹیل صاحب، ٹوٹ بٹوٹ میں محمود شام صاحب، حنیف سحر، شبانہ بشیر صاحبہ، خالدہ پروین اور شاہد صاحب۔ ہونہار میں مظہر یوسف زئی، انیس رحیم اور فضل الرحمان یوسفی، بچوں کا رسالہ میں مصطفیٰ چاند (مصطفیٰ ہاشمی)، بچوں کے مشرق میں شاہد بخاری اور نصر ملک، نونہال امن لیگ میں مہ ناز رحمان، پھول وکلیاں میں سیدہ فاطمہ اور زیبا برنی، بچوں کے جسارت میں معین الدین کمالی اور حمیرا قریشی، بچوں کے جنگ میں نزہت سلیم بیگ، بزم اطفال اخبار جہاں میں شاہد جمیل، آنکھ مچولی سلیم مغل، ڈاکٹر طاہر مسعود، محمود فاروقی، احمد خان، لوٹ پوٹ میں ابن شہباز خان، بچوں کا امروز میں غلام محی الدین نظر وہ افراد ہیں، جنہوں نے بچوں کے ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان تمام افراد میں محمود شام صاحب، مظہر یوسف زئی اور حنیف سحر نے بچوں کے ادیبوں کی ہر ممکن راہنمائی اور سرپرستی کی ہے۔

حیدرآباد کے دوستوں کا ذکر بھی بہت ضروری ہے۔ جب میں نے ''انوکھی کہانیاں'' جاری کیا تو میری دوستی عبداللہ شیخ گوہر سے ہوئی۔ ساتھ ساتھ خلیل جبار، عارف شمین روہیلہ، نعیم آکاش، غلام حسین میمن اور نوشاد عادل سے بھی دوستی رہی۔ خلیل جبار، عارف شمین روہیلہ اور نعیم آکاش کراچی میں ملاقات کرتے رہے۔ عبداللہ شیخ گوہر کا ایک سلسلہ ''انوکھی کہانیاں'' میں جاری بھی ہوا۔ حیدرآباد کے ایک پرانے ساتھی آفتاب عالم قریشی سے گذشتہ دنوں ملاقات ہوئی، جو کہ بہت یادگار تھی۔

پھر 1987ء میں ایک دن اسلام آباد کے ورکشاپ میں محمد وسیم خان چیف ایڈیٹر ''نٹ کھٹ'' سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ایک اچھی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ وسیم خان دوستوں کا

دوست اور دشمنوں کا بھی دوست ہے۔ بہت جذباتی نوجوان ہے۔ جس کی حمایت کرے گا تو کھل کر کرے گا۔ وسیم خان سے اب میری اچھی دوستی ہے۔ جب بھی وسیم کراچی آتا ہے۔ وہ مجھ سے ضرور ملتا اور دسمبر 2000ء میں مدیران رسائل کا وفد حیدرآباد گیا تھا، جس کی خاطر مدارت اور رہائش وسیم خان کے ذمہ تھی۔ میں نے عرصہ دس سال بعد حیدرآباد کا چکر لگایا۔ وہ بھی صرف وسیم خان کے خلوص کی بدولت۔

دسمبر 1986ء میں میری تحریر امن مشن ''ٹوٹ بٹوٹ'' میں شائع ہوئی۔ یہ ایک طویل تحریر تھی اور مجھے امید تھی کہ یہ ایوارڈ ضرور حاصل کرے گی، کیوں کہ اس زمانے میں ٹوٹ بٹوٹ مصنف ایوارڈ کا بہت چرچا تھا۔ اسی شمارے میں حافظ ولی اللہ ارباب کی بھی کہانی تھی۔ جب نتیجہ آیا تو پتا چلا کہ کسی مصنف نے اپنی کہانی کے لیے خود ہی بہت سے کوپن بھر کے ارسال کیے تھے، اس لیے دسمبر 1986ء کا ایوارڈ روک دیا گیا ہے۔ ہم نے بھی کوئی احتجاج نہ کیا۔ چھ سال ماہ بعد حنیف سحر ''ٹوٹ بٹوٹ'' کے ایڈیٹر بنے تو انہوں نے دسمبر 1986ء کے شمارے کی تمام کہانیاں پڑھ کر میری تحریر کو ایوارڈ کا حق دار قرار دیا اور چیف ایڈیٹر محمود شام سے کہا تو انہوں نے حنیف سحر کی بات سے اتفاق کیا اور میرے ایوارڈ کا اعلان کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ حافظ ولی اللہ نے خود بہت سے کوپن استعمال کیے تھے۔ جب میں نے یہ ایوارڈ وصول کیا تو میری خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ظفر احمد خان نے کردار ادا کیا۔

حنیف سحر وہ واحد ادیب ہیں، جو کہ بچوں کے ادب میں ایک روشن مثال ہے، جس نے بہت سے اچھے کام کیے ہیں اور بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔ جب حنیف سحر ٹوٹ بٹوٹ کا ایڈیٹر تھا تو بچوں کے ادیبوں کو حنیف سحر ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں بھی اکثر حنیف سحر سے جا کر لڑتا تھا کہ میری تحریریں کیوں شائع نہیں کرتے ہو۔ جب عقل و شعور کی کسوٹی پر آئے تو پتا چلا کہ حنیف سحر ایک بلند شخصیت کا مالک ہے اور پرخلوص دوست ہے۔ حنیف سحر کو بہت سے لوگوں نے بے انتہا نقصانات پہنچائے ہیں، مگر اس نے کسی کو اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ اس کا بڑا پن ہے۔ کچھ اچھے لوگوں کا محبت کرنے والے دوست کا اور دل کی باتوں کا ذکر کرنا بھی گناہوں تو کچھ قیود کی بنا پر نہ کر سکوں گا، البتہ ایک اپنے خاص الخاص دوست ڈاکٹر گلاب کا ذکر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کروں گا جس کی بدولت میری مشکلات کافی حد تک کم ہوئیں۔ جس کے مشوروں نے میری رہنمائی کی۔ جس کی وسعت نظری کا مجھے قائل ہونا پڑا اللہ تعالیٰ سے میری دلی دعا ہے کہ وہ تاحیات میرے ساتھ رہے۔ ڈاکٹر گلاب سے مشورہ میرے لیے ذہنی آسودگی کا باعث رہا۔ اگر میں نے اپنے کسی دوست سے محبت کی ہے تو وہ ڈاکٹر گلاب ہے۔

کہانیاں لکھنے کا سلسلہ 1978ء سے شروع ہوا۔ میں بچوں کا اخبار ''مشرق'' پڑھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک تحریر لکھ کر بچوں کے مشرق میں بھجوادی۔ اس وقت بچوں کے اخبار کے انچارج شاہد بخاری تھے۔ انہوں نے میری پہلی تحریر شائع کی۔ میری حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے مزید تحریریں روانہ کیں اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا اور میں کئی سال تک بچوں کے مشرق میں لکھتا رہا۔ اس زمانے میں محمد فاروق دانش، تاج محمد راہی، ایم مغیث اکوزئی، جاوید بادشاہ، یار محمد خان، رفیق اختر، ندیم واسطی، آفتاب عالم خان، قاضی سراج الدین بھی لکھا کرتے تھے۔ بچوں کے مشرق کے بعد میں نے ''امن'' جسارت'' حریت'' انقلاب'' جنگ'' اخبار جہاں'' نوائے وقت'' ''نونہال'' تعلیم و تربیت'' جگنو'' بچوں کا ڈائجسٹ'' بچوں کا رسالہ'' ''ہونہار پاکستان'' ٹوٹ بٹوٹ'' اور خزانہ میں سینکڑوں تحریریں لکھیں۔ 1980ء کے عشرے میں...... میں نے بہت لکھا، اقبال ناز، حنیف سحر، امتیاز ملک، معین قریشی ہمارے سینئر ہوتے تھے۔ میرے ساتھ مصطفیٰ چاند (مصطفیٰ ہاشمی)، عبدالعزیز عزمی، عمر احمد خان، خواجہ وقار احمد، یاسمین حفیظ، علی حسن ساجد، ابن شہباز خان، ظفر احمد خان اور شاہد علی سحر لکھا کرتے تھے۔

اسی دوران میں نے اور میرے دوستوں موسیٰ رضا، نور محمد ہاشمی، حکیم عبدالقادر قریشی، سید علی حیدر نقوی اور سید رفیع الزماں نے علامہ اقبال رائٹرز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور ادبی نشستوں کا آغاز کیا۔ اس وقت کئی اور ادبی تنظیمیں کام کر رہی تھیں، جن میں شاہین ادبی سوسائٹی، پاکستان رائٹرز کلب، گلستان رضا سوسائٹی، ہونہار کلب، معمار ملت پاکستان قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال رائٹرز ایسوسی ایشن نے میرے ادبی ذوق کو فروغ دیا، کئی یادگار تقریبات منعقد کروائیں جن میں پروفیسر آذر حفیظ، شمی فاروقی، اشتیاق طالب، عارف شفیق، پروفیسر عبدالطاہر خان، زبیر اکرم ندیم وغیرہ کو سننے کا موقع ملا۔

1980ء میں نونہال میں لکھا اور اس کے انعامی مقابلوں میں حصہ لیا۔ میری جب بھی کوئی قابل ذکر تحریر شائع ہوتی تو جناب حکیم محمد سعید کی جانب سے ایک کتاب کا تحفہ آتا تھا جس میں مطالعہ کو وسعت دینے اور مزید لکھنے کے بارے میں حکیم صاحب کا خط بھی لگا ہوتا تھا۔

1978ء سے لے کر 1994ء تک میری 185 کہانیاں و مضامین اور 240 دیگر تحریریں اور کوئز مقابلے شائع ہوئے۔ بچوں کے انقلاب میں تین ماہ تک ہر ہفتے میرا ''تبصرہ'' شائع ہوتا رہا۔ یہ 1982ء کی بات ہے۔ سینئر ادیب اور شاعر اشرف ٹھٹھوی اس زمانے میں انقلاب میں نظمیں لکھتے تھے اور میرے تبصروں کی زد میں لازمی آجاتے تھے۔ ٹھٹھوی صاحب سمجھتے تھے کہ محبوب الٰہی مخمور کوئی بزرگ ادیب و شاعر ہے، جو اتنا بے لاگ تبصرہ کرتا ہے۔ ایک مرتبہ 1984ء میں ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے، کیوں کہ اس وقت میں سترہ اٹھارہ سال کا تھا اور اس وقت تک میری 480 سے زائد نگارشات شائع ہو چکی تھیں۔

مشرق میں بچوں کا انسائیکلوپیڈیا کے عنوان سے ایک سال میرا کالم شائع ہوتا رہا۔ میں نے 1978ء میں لکھنے کا آغاز کیا تھا اور 5 مئی 1979ء کو میری کہانی کو مشرق کی جانب سے پہلا انعام ملا تھا۔ اس مقابلے میں 23 کہانیاں شامل تھیں۔

انعامات اور اعزازات کی بات چل نکلی ہے تو بتاتا چلوں دو مرتبہ میں نے اور ایک مرتبہ میرے بھائی انعام الٰہی مخمور نے ٹوٹ بٹوٹ ایوارڈ حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ SSO گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ''انوکھی کہانیاں'' نے مسلسل پانچ ایوارڈ حاصل کیے 1993ء حقوق اطفال نمبر تیسرا انعام، 1994ء خاص نمبر برائے خاص بچے دوسرا انعام، 1995ء محنت کش بچے چوتھا انعام، 1996ء فروغ تعلیم نمبر تیسرا انعام اور 2010ء میں پیارے نبی نمبر پر اول انعام دعوۃ اکیڈمی اور یونیسیف سے حاصل کیا۔

شعبہ بچوں کے ادب کے متعدد ورکشاپ میں شرکت کی۔ خصوصاً 1987ء کا تربیتی کیمپ برائے نوجوان ادیب مجھے یاد رہے گا جس میں کراچی سے مصطفیٰ چاند، ابن شہباز، عارف انجم صدیقی، آصف جاوید سکندر، عامر یونس اور میں نے شرکت کی تھی۔ میرے ساتھ مصطفیٰ ابن شہباز اور عارف نے ریل کا سفر ایک ساتھ کیا تھا، جس میں بہت مزا آیا اور اسلام آباد میں بھی بہت اچھی

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

گزری۔ وہاں میری ملاقات حیدرآباد کے قلم کار محمد سعید اختر سے ہوئی اور وہ دوستی اب تک قائم ہے۔ کالج کے زمانے میں بزم ادب کا جنرل سیکریٹری (سراج الدولہ کالج) 1984-85 میں رہا۔ 1986ء میں نائب صدر پولیٹیکل سائنس رہا۔ اسی دور میں کالج میگزین کا نائب مدیر رہا اور ”گل تر“ کے عنوان سے میگزین جاری کی۔ اسی زمانے میں ہمارے کالج میں ہفتہ طلبہ منایا گیا۔ میری شامت آئی اور میں نے آٹھ سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لے لیا۔ دوڑ لگائی میدان کے چار چکر لگانے تھے۔ دو چکر لگانے کے بعد میری ٹانگیں جواب دے گئیں۔ بڑی مشکلوں سے باقی کے دو چکر پورے کیے اور اختتامی لائن پر جا کر بیٹھ گیا اس دوڑ میں میری تیسری پوزیشن آئی تھی، مگر پندرہ دن تک ٹانگوں کا درد نہ جا سکا۔

مصطفیٰ چاند، عبدالعزیز عزمی، آصف مالک، آفاق مسیح، جمال صدیقی، حارث کاظمی وغیرہ بھی میرے گروپ کے رائٹرز ہیں۔ یاسمین حفیظ، سلمیٰ کنول، آفتاب عالم خان غوری، تبسم صالحہ صدیقی سے میری ملاقاتیں ہونہار کلب کے پروگراموں میں ہوئیں۔ مصطفیٰ چاند سے میری دوستی بہت پرانی ہے میں اور مصطفیٰ چاند مختلف معاملات کے سلسلے میں موٹر سائیکل پر بہت گھومتے رہتے ہیں۔ پھر ہوا یوں کہ مصطفیٰ چاند، شاہد علی سحر، رؤف اسلم آرائیں اور مجھے ”انوکھی کہانیاں“ شائع کرنے کا خیال آیا۔

مصطفیٰ ہاشمی اور میرے ذہن میں بچوں کے لیے رسالے کا خیال عرصہ دراز سے تھا۔ پھر ہم نے رؤف اسلم اور شاہد علی سحر کو سفاری پارک میں بلایا۔ یہاں ایک میٹنگ ہوئی اور بچوں کے لیے ایک رسالے کی اجرا کا منصوبہ بنا۔ اب یہ طے کرنا باقی تھا کہ رسالہ کا کیا نام رکھا جائے۔ مصطفیٰ ہاشمی نے کہا کہ اس کا نام بچوں کی کہانیاں رکھا جائے۔ میں نے تجویز دی کہ ”انوکھی کہانیاں“ ہونا چاہیے۔ مزید ایک دو نام اور تجویز کیے گئے۔

پھر مصطفیٰ ہاشمی نے جون 1991ء میں ڈیکلریشن کے سلسلے میں کوشش کی اور ہمیں انوکھی کہانیاں کے نام سے رسالہ جاری کرنے کا ڈیکلریشن مل گیا۔ ہر چوتھے دن رسالہ کا میٹر میرے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ میں پانچ بجے اپنے آفس بولٹن مارکیٹ سے نکلتا۔ ون ڈی پر شاہین کمپلیکس جاتا۔ وہاں سے پی آئی ڈی سی پل سے گرانڈ ہوٹل بلڈنگ پیدل جاتا۔ وہاں کمپوزنگ کا میٹر دے

الٰہی بخش کی جوانی کی تصویر

محبوب الٰہی مخموری اپنی فیملی کے ساتھ ایک یادگار تصویر

itsurdu.blogspot.com

عبدالوسیم خان، ندیم (شانی) اور عبدالقسیم خان

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

الٰہی بخش چشتی صاحب کی ایک یادگار تصویر

محبوب الٰہی مخمور، خرم لودھی کے ساتھ

عمیر الٰہی، زوہا محبوب اور حماد الٰہی اپنے کزن محمد اشعر کے ساتھ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کر واپس آتا۔ پھر ہر تیسرے دن میٹر وہاں سے لیتا تھا۔ اس کے بعد اشتہارات کے سائٹ، ناظم آباد، شاہرہ فیصل، کلفٹن اور ڈیفنس کا سفر بسوں اور ویگنیوں میں کرتا۔ وہاں مارکیٹنگ کے لوگوں سے ملتا تھا اور رسالے کو اشتہارات جاری کرواتا تھا۔ سب سے زیادہ چکر ہمیں ابلاغ ہی اشتہاری ایجنسی نے لگوائے، جب کہ ہمدرد اور پاکولا نے ابتدا سے ہی تعاون کیا اور اشتہار جاری کیے۔

صرف تین ماہ کے بعد ہی مصطفیٰ ہاشمی، شاہد علی سحر اور رؤف اسلم نے کہا کہ رسالے کو وہ وقت دینے سے قاصر ہیں اور شاہد علی سحر کا الیکٹرونس کا کاروبار تھا۔ رؤف اسلم ایک فوڈ فیکٹری میں تھا، جب کہ مصطفیٰ ہاشمی کی اسی زمانے شادی ہوگئی تھی اور دوشیزہ میگزین کے متعدد رسالوں کا ایڈیٹر تھا، اس لیے وہ بھی شدید مصروف تھے، اس لیے تینوں نے فیصلہ کیا کہ رسالہ انوکھی کہانیاں بند کر دیا جائے۔ جس پر میں کہا کہ رسالہ مستقل بنیادوں پر میرے حوالے کر دیا جائے۔ اس پر تینوں نے کہا کہ یہ ایک مشکل کام ہے۔ چار بندوں سے نہیں سنبھل رہا..... تم اکیلے کیسے کرو گے۔

میں نے کہا کہ رسالہ تو آپ لوگ بند کر رہے ہیں۔ اب میرے حوالے کر دو۔ اگر میں اس کو نہ سنبھال سکا تو یہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ انھوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ پھر اس پر سب نے رضامندی سے رسالہ میرے حوالے کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے رسالہ کا ایک چھوٹا سا آفس ولایت آباد میں قائم کیا۔ تمام چیزیں وہاں رکھ دی۔ میں پانچ بجے اپنے آفس سے نکل کر ولایت آباد انوکھی کہانیاں کے آفس آجاتا تھا۔ وہاں رسالہ کا کام کرتا تھا۔ آٹھ نو بجے وہاں سے بذریعہ بس اپنے گھر یوسف پلازہ چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ایک بھاری بھرکم بیگ میرے کندھے پر ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے، جس میں رسالے سے متعلق تمام ضروری چیزیں ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہیں، جہاں کہیں موقع ملتا تھا، میں رسالہ کا کام نمٹاتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ صبح یوسف پلازہ سے کنٹریکٹ بس میں، میں روزانہ رسالہ کی پروف ریڈنگ کرتا تھا اور یوں سفر کے دوران میرا کافی کام ختم ہو جاتا تھا۔ کھانے کے وقفے میں، میں بولٹن مارکیٹ سے آرام باغ اور برنس روڈ پیدل ہی چلا جاتا تھا، جہاں سے کاغذ اور دیگر رسالے کے معاملات کرتا تھا۔ رسالہ کا ٹائٹل بنوانے کے لیے نورانی پروسس میں کئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا تھا۔ جہاں غلام حسین سے سرورق بنواتا تھا۔ ٹائٹل کے لیے کھوڑی گارڈن سے کتابیں خریدتا تھا۔ پھر ان کو اسکین کراتا اور ٹائٹل بنوایا جاتا تھا یہ سب

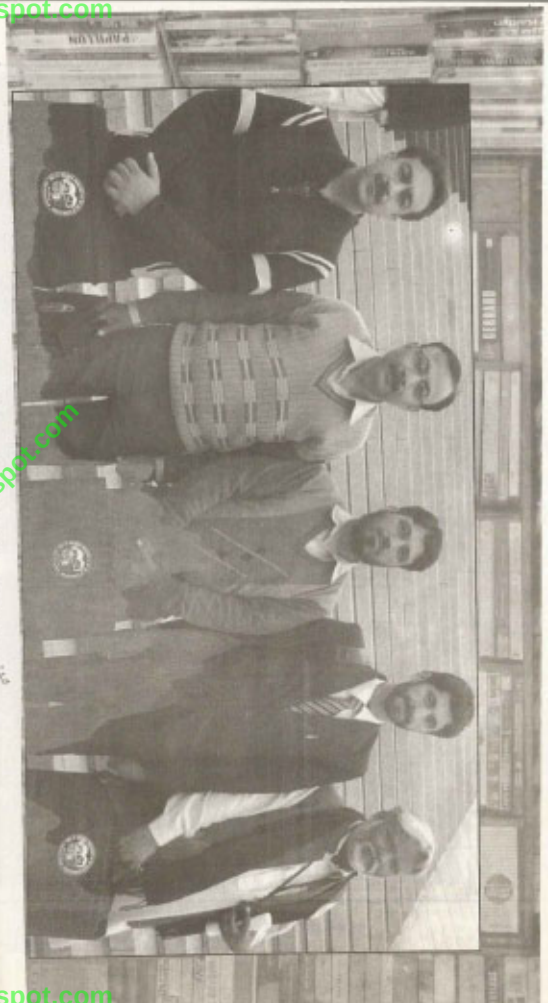

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ایک مشکل کام تھا۔ اس سارے کاموں میں مجھے میرے والد صاحب الٰہی بخش چشتی کی راہنمائی حاصل رہتی تھی۔ وہ ہر مشکل میں میرا حوصلہ بڑھاتے تھے اور ہر ممکن مدد فراہم کرتے تھے۔

آج 2014ء میں انوکھی کہانیاں کو 24 سال ہو گئے ہیں۔ الحمدللہ رسالہ جاری و ساری ہے۔ بچوں کے ادب سے میری دل چسپی بچپن سے رہی ہے اور آج بھی ہے۔ جون 1991ء سے ہم نے رسالے کی تیاری شروع کی۔ کمپوزنگ اور اشتہارات کا شعبہ میرے پاس تھا۔ شاہد اور رؤف کے ذمہ ایڈیٹنگ تھی۔ مصطفیٰ کے ذمہ لے آؤٹ ٹیکنیکل امور اور پرنٹنگ کا شعبہ تھا۔

مجھے یاد ہے اچھی طرح کہ ہم نے "انوکھی کہانیاں" کا پہلا شمارہ افتخار الدین کے ذریعے تیار کروایا تھا اور یہ تمام کام مصطفیٰ کے گھر پر انجام پایا تھا۔ رات بارہ بجے ہم نے سلیم روٹی کھائی تھی۔ اس وقت وہاں ہمارے علاوہ سلیم فاروقی اور دانش صاحب بھی تھے۔ جب پرنٹنگ کے بعد رسالہ ہمارے ہاتھ میں آیا تھا تو نہ پوچھیے کہ ہماری کیا حالت تھی۔ خوشی کے مارے ہمارے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ کم از کم میں مرتبہ میں نے ایک دن میں رسالہ کھول کر دیکھا تھا۔ رسالے کی سرکولیشن کی ذمہ داری صابر بھائی نے انتہائی محنت سے نبھائی۔ رسالہ کو پاکستان کے کونے کونے میں پہنچایا۔

دسمبر 1991ء سے آج تک میں ہی "انوکھی کہانیاں" اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نکال رہا ہوں۔ گذشتہ دس سالوں میں بہت سی اونچ نیچ آئیں، مگر سب سے پنجہ آزمائی کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ صابر بھائی جو کہ رسالہ پاکستان بھر میں بھجواتے تھے، میں ان کے ساتھ ریلوے اسٹیشن رسالہ بلٹی کروانے جاتا تھا اور رسالہ کے کارٹن بھی صابر بھائی کے ساتھ اُتارتا تھا۔ اس طرح مجھے رسالے کے جملہ امور سے مکمل واقفیت ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے میں تمام کام کر سکتا ہوں اور یہی راز ہے رسالے کی کامیابی کا۔

مارچ 1984ء میں میرے والد نے مجھے کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کراچی میں ملازمت دلوائی۔ دوران ملازمت میں پڑھتا بھی رہا۔ اسی دوران میں نے ایم اے صحافت اور ایم اے اردو مکمل کر لیا۔ آج بھی چیمبر میں میری ملازمت ہے۔ گذشتہ دس سالوں سے یونین کا جنرل سکریٹری ہوں اور ورکرز کے حقوق کی جنگ لڑ رہا ہوں اور گذشتہ دس سال سے میں نے ایمپلائز

یونین سنبھالی ہوئی ہے اور وہ یونین جس کو انتظامیہ نے ختم کرا دیا تھا، دوبارہ بحال کروا دی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ لیبر کورٹ، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سے میں نے اور میرے ساتھیوں نے یونین بحال کروائی ہے اور ہمارے دور میں کسی بھی ورکر کو نہیں نکالا جا سکا ہے۔ یہ بات شاید قریبی ساتھی قلم کاروں کے علاوہ باقی لوگ نہیں جانتے کہ جہاں میں ادب اور ادیبوں کے لیے کام کر رہا ہوں، وہیں ورکرز کے حقوق کے لیے بھی کوشاں رہتا ہوں۔

میری بہترین اور خوب صورت ترین یادا شتوں میں سید قاسم محمود صاحب سے ملاقاتیں بھی موجود ہیں۔ میں نے اس عظیم شخص سے اسلام آباد میں ملاقات کی پھر لاہور میں، میں اور خرم ادوی ان سے ملتے ٹاؤن شپ گئے۔ جہاں سید قاسم محمود سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ سید قاسم محمود جیسا قابل اور سادہ شخص میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمود احمد غازی، پروفیسر انیس احمد، عبدالجبار شاکر، میرزا ادیب، نظر زیدی، سعید لخت، ظہور الدین بٹ سے بھی ملاقاتیں رہی ہیں۔

جب میں آپ بیتی کو دوبارہ تحریر کر رہا تھا تو اطلاع ملی کہ ہم سب کے دوست اور انوکھی کہانیاں کے لکھاری کامران خان طالب انتقال کر گئے ہیں۔ ایک شاک لگا، کیوں کہ پچھلے چھ ماہ قبل سے کامران خان طالب کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ اچانک ان کے گردوں میں انفیکشن ہو گیا، مگر کامران خان نے بڑی ہمت سے اس کا علاج کرایا۔ پھر 26 نومبر کو وہ بے ہوش ہو گئے تو ان کے گھر والے لیاقت ہسپتال لے گئے، جہاں بیس دن وہ زیر علاج رہے اور پھر ٹھیک ہو کر واپس گھر آئے اور 3 دسمبر 2012ء کو اچانک انتقال ہو گیا۔ کامران خان طالب سے میری ایک طویل عرصہ سے دوستی تھی اور اکثر وہ میرے آفس آ جایا کرتے تھے اور گھریلو و دیگر معاملات میں مجھ سے مشورہ لیتے تھے وہ ایک پرخلوص شخصیت کے مالک تھے اور بچوں کے ادب کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

اسی طرح بچوں کے ادب کی دو اور شخصیتوں کا ذکر کروں۔ ایک مظہر یوسف زئی اور دوسرے پروفیسر ظریف خان۔ مظہر یوسف زئی نے ہونہار رسالے سے میرے حوصلہ افزائی کی اور ماہ نامہ انوکھی کہانیاں کی باقاعدگی سے اشاعت پر بہت خوش ہوتے تھے۔ 75,70 سال کی عمر تک انہوں نے بچوں کے ادیبوں کو یکجا کیے رکھا اور متعدد تقریبات میں وہ پیش پیش رہے۔ اسی طرح

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

پروفیسر ظریف خان نے کراچی آ کر بچوں کے ادیبوں کو محبت کے پھول پیش کیے۔ ہر دم مسکرانا ان کی فطرت تھی اور ان کی یادیں ناقابل فراموش ہیں۔

علامہ اقبال رائٹرز ایسوسی ایشن کے تحت میں نے اور میرے ساتھیوں نور محمد ہاشمی، موسیٰ رضا، سید علی حیدر نقوی، میر مجاہد حسین جو قیرا کرام ملک، شکیل احمد، اور سید رفیع الزماں نے متعدد تقریبات منعقد کروائی۔ اسی سلسلے میں، میں ممتاز ادیب اور محقق سید قاسم محمود صاحب سے بھی ملا۔ انہیں اپنی ایسوسی ایشن کے بارے میں بتایا۔ یہ 1987ء کی بات ہے۔ سید قاسم محمود صاحب کا آفس لائٹ ہاؤس، کراچی کے پاس تھا، جہاں وہ ایک پرسکون گوشے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ ان کے اسٹاف نے مجھے ان سے ملوایا۔ میں نے دیکھا ایک شخص سفید کرتے اور پاجامے میں ملبوس لکھنے میں مصروف ہے۔ میرے تعارف کرانے پر انہوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے جرائد طالب علم، افسانہ ڈائجسٹ اور سائنس میگزین ہر ماہ پڑھتا ہوں تو وہ خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے مجھے بیس کتابیں اسلامی المانک نامی انسائیکلوپیڈیا کی تحفتاً دیں جو میں نے اپنی تقریب میں ایوارڈ یافتہ ادیبوں کو دیں۔ یہ میری سید قاسم محمود صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔

itsurdu.blogspot.com

کچھ عرصہ بعد وہ واپس لاہور چلے گئے۔ سید قاسم محمود صاحب سے میری ملاقاتیں شعبہ بچوں کا ادب (دعوۃ اکیڈمی) اسلام آباد کے مختلف ورکشاپ میں ہوتی رہیں۔ علاوہ ازیں لاہور میں، میں ان کے گھر بھی گیا اور ان کی ہزاروں کتابوں پر مشتمل لائبریری بھی دیکھی وہ ایک لکھنے کی مشین تھے۔ انہوں نے وہ کام کیے جو بڑے بڑے ادارے نہیں کر پاتے۔

بچوں کے ادب کے حوالے سے ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر سے بھی میری متعدد ملاقاتیں رہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے کھوکھر صاحب کا کام بھی قابل ستائش ہے۔

دو سال قبل جب میں مدیران کی ورکشاپ میں اسلام آباد گیا تو وہاں پر پاکستان بھر کے ادیبوں اور مدیران سے ملاقات رہی۔ اس ورکشاپ کے رابطہ کار محمد علی تھے۔ محمد علی ایک دھان پان سی شخصیت کے مالک ہیں، مگر انہوں نے بچوں کے رسائل میں بے پناہ لکھا ہے۔ وہاں محمد علی ہر مدیر کو ان کا کمرا الاٹ کر رہے تھے اور ورکشاپ کی تفصیلات اور دیگر امور کی مکمل نگرانی کر رہے تھے۔ محمد علی

سے خوب گفتگو ہوئی۔ اسی رات ماہنامہ گلونہ پشاور کے ایڈیٹر اور بچوں کے ادیب عمران یوسف زئی بھی ورکشاپ پہنچ گئے۔ خوب محفل جمی۔ رات دس بجے عمران یوسف زئی نے کہا کہ مارکیٹ سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آتے ہیں تا کہ رات سکون سے گزرے۔ محمد علی سے جناح سپر مارکیٹ کا پتا معلوم کیا تو بولے۔ وہ نزدیک ہی ہے۔ پیدل چلتے ہیں۔ پھر میں، محمد علی، علی حسن ساجد، عمران یوسف زئی اور فاروق دانش کا قافلہ جناح سپر مارکیٹ کے لیے چل پڑا۔ چلتے چلتے آدھا گھنٹہ ہو گیا مگر مارکیٹ نہ آئی۔ محمد علی سے پوچھا تو کہنے لگے الٹے ہاتھ پر جو سڑک ہے وہاں ہے۔ الٹے ہاتھ پر پہنچے تو مارکیٹ نہ تھی تو بولے۔ اب اگلے موڑ پر سیدھے ہاتھ پر ہے۔

اس وقت اسلام آباد میں رات گیارہ بج رہے تھے اور ٹریفک بھی کم تھی۔ پھر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی ہم چلتے رہے۔ پھر بارش تیز ہو گئی۔ ہلکی سردی تو پہلے ہی تھی اب شدید سردی لگنے لگی اور ہم سب سردی کی وجہ سے کپکپانے لگے مگر محمد علی کبھی کھبے پاسے اور کبھی سجے پاسے کرتے رہے۔ بڑی مشکل سے ایک ٹیکسی کر کے اس میں پانچ آدمی پھنس کر واپس آئے۔ یہ ایک یادگار واک تھی۔ اس ورکشاپ میں محمد علی نے اپنی محنت اور جاں فشانی سے سب کے دل جیت لیے۔

اس ورکشاپ کی دوسری رات کو ڈھائی بجے ڈاکٹر عمران مشتاق کی کتاب آخری راز، محبوب الٰہی مخمور کی امن مشن، علی عمران ممتاز کی کتاب روشن دیس پاکستان اور طاہر عمیر کے چلڈرن ٹائمز کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی اور رات ساڑھے تین بجے ڈاکٹر عمران مشتاق نے ٹیلی فونک خطاب کیا۔ وہ بھی لندن سے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے محمد ندیم اختر لیہ سے اور محمد عرفات ظہور، ملتان سے خصوصی طور پر آئے تھے۔ یہ بھی ایک یادگار لمحہ ثابت ہوا۔ جب اسلام آباد سو رہا تھا اور بچوں کے ادیب و مدیران رسائل نے ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔

الٰہی پبلی کیشنز نے کتابوں کی اشاعت کا آغاز کیا تو سیالکوٹ کی معروف ادیبہ رضیہ خانم نے اپنی کتاب نگارشات خانم اشاعت کے لیے مجھے ارسال کی۔ میں نے مکمل توجہ کے ساتھ اس کتاب کو شائع کیا تو رضیہ خانم بہت خوش ہوئیں اور اس کتاب کی ہر طبقہ فکر سے تعریف ہوئی۔ پھر رضیہ خانم نے دوسری کتاب آرزوئے خانم لکھی۔ حسب روایت وہ بھی الٰہی پبلی کیشنز کے پاس آئی۔ اس کتاب کو بھی بڑی خوب صورتی اور محنت کے ساتھ میں نے شائع کیا۔ رضیہ خانم کا انوکھی کہانیاں سے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ناطہ پندرہ سال پرانا ہے۔ وہ پوری توجہ اور یکسوئی کے ساتھ انوکھی کہانیاں میں لکھتی ہیں اور لکھ رہی ہیں۔ رضیہ خانم وہ ادیبہ ہیں جو بچوں اور بڑوں کے ادب سے والہانہ محبت کرتی ہیں اور بچوں کے ادب کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہیں۔

دوسری کتاب کے بعد رضیہ خانم کی تیسری کتاب ''صحرا میں پھول'' بھی ابھی پبلی کیشنز نے شائع کی ہے۔ اس طرح رضیہ خانم نے ہیٹ ٹرک مکمل کر لی اور جس دل جمعی اور یکسوئی کا مظاہرہ وہ کرتی ہیں ایسی ادیبہ میری نظر سے نہیں گزری۔

بچوں کے ادب میں سید کمیل اختر ہاشمی، محمد عرفان رامے، محمد سعید عباس اور عبدالرشید فاروقی بہت لکھ رہے ہیں۔ نوشاد عادل نے ایک تواتر کے ساتھ بچوں اور بڑوں کے ادب سے وابستگی برقرار رکھی اور کئی سال سے وہ لکھ رہے ہیں۔ ان کی سنجیدہ اور مزاحیہ تحریریں خوب ہوتی ہیں۔ انوکھی کہانیاں میں سب سے زیادہ ناولٹ لکھنے کا اعزاز نوشاد عادل کو حاصل ہے۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ نوشاد عادل کے متعدد ناولٹ ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور پڑھنے والا ان کے سحر سے مدتوں نہیں نکلتا ہے۔ انھوں نے متعدد بچوں کے ادیبوں کو جو لکھنا چھوڑ چکے تھے انھیں اس جانب دوبارہ راغب کیا اور آج کل مجھ سے بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ میں مزاحیہ سیریز لکھوں۔ نوشاد عادل کے بھائی عمیر عادل نے بھی معرکتہ الآرا ناولٹ اور کہانیاں لکھی ہیں۔

دعوۃ اکیڈمی شعبہ بچوں کا ادب، اسلام آباد کی تقریبات میں میری ملاقاتیں میرزا ادیب، نظر زیدی، سعید لخت، بیگم ثاقبہ رحیم الدین، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر محمود احمد غازی، عبدالجبار شاکر، پروفیسر سلیم مغل، نظر زیدی، پروفیسر طاہر مسعود، ملک معراج خالد (نگران وزیر اعظم پاکستان) اور متعدد شخصیات سے ہوئیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

میں اپنی آپ بیتی میں اپنے پر خلوص دوستوں کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ ان میں ایک ڈاکٹر طارق ریاض خان (سائنسی بابو) ہیں۔ میں جب بھی لاہور گیا ہوں۔ ان سے ملاقات ضرور ہوئی ہے اور ہمیشہ میں نے انہیں پر خلوص پایا۔ خصوصاً یہ کہ وہ مجھے اپنے بڑے بھائی کا درجہ دیتے ہیں اور بھائی جان' بھائی جان کہتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی ہے۔ ڈاکٹر طارق ریاض ایک سینئر

استاد ہیں اچھے ادیب ہیں۔ ان کی بڑائی یہ ہے کہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں شاگردوں کے استاد ہیں۔ طالب علم ان کا ادب کرتے ہیں ان کی تکریم کرتے ہیں وہ اپنے سینئرز کی عزت کرتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت اور تکریم کے اعلیٰ درجے پر فائز کیا۔ میری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس مقام پر فائز فرمائے جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو اور ہم فخریہ کہہ سکیں کہ ڈاکٹر طارق ریاض خان ہمارے ادیب ساتھی ہیں۔

اسی طرح نذیر انبالوی بھی بچوں کے ادب میں ایک قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے بے پناہ محنت کی ہے اور آج ایک اچھے دوست اور ادیب مانے جاتے ہیں۔

میری آپ بیتی میں ابن آس محمد (محمد اختر) کا ذکر نہ ہو تو مزہ نہیں آئے گا۔ آج سے 25 سال قبل میں اورنگی ٹاؤن جایا کرتا تھا وہاں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ یہ لائبریری ابن آس محمد کی تھی۔ میں ان سے ملاقات ضرور کرتا تھا۔ پھر ابن آس محمد نے امت جوائن کر لیا اور بہت بہت لکھا۔ اکثر میری ملاقات ان سے حنیف سحر کی جانب سے منعقدہ ادبی تقریبات میں ہوتی تھی۔ ابن آس ہر تحریر پر مثبت اور جامع تنقید کرتے تھے اور خوب کھل کر ادبی نشست میں گفتگو ہوتی تھی۔ ان تقریبات میں حنیف سحر، ایم اسلم خان اور مظہر یوسف زئی پیش پیش ہوتے تھے۔ ابن آس محمد نے بچوں کے لیے بے تحاشا لکھا پھر ٹی وی ڈراموں میں مصروف ہو گئے۔ ایک طویل عرصہ بعد ان سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور بچوں کے ادب کے حوالے سے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر وسائل کی کمی آڑے آتی ہے۔ اب بھی ابن آس وہی عام آدمی ہیں جیسے پہلے تھے جب کہ شہرت و دولت اور عہدے نے بہت سے لوگوں کی گردنوں میں سریا ڈال دیا ہے مگر مصطفیٰ ہاشمی، ابن آس محمد، حنیف سحر وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے عزت و دولت بے پناہ دی ہے مگر ان کی شخصیت میں کوئی فرق نہیں پڑا وہ آج بھی ویسے ہی ہیں اور اپنے دوستوں سے اسی طرح ملتے ہیں جیسے پہلے ملتے تھے۔

شمیم ادیبہ یاسمین حفیظ ان افراد میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے 30-25 سال اسی شعبے میں گزار دیئے ہیں۔ ہونہار کلب کی تقریبات، کے لے کر کہانیاں لکھنے تک یاسمین حفیظ نے مسلسل جدوجہد کی مثال قائم کی ہے۔ انہوں نے اپنی شناخت بنائی ہے۔ ایک بہترین ادیبہ ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد ادیبوں کی بہن ہیں اور ان سے بڑے خلوص سے ملتی ہیں۔ یاسمین حفیظ کی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

قربانیوں کا شمار کرنا مشکل ہے کبھی کبھی مجھ سے اور انوکھی کہانیاں سے ناراض بھی ہو جاتی ہیں، مگر پھر انہیں میں منا لیتا ہوں اور مان جاتی ہیں کیوں کہ زیادہ ناراض رہنا ان کی فطرت نہیں ہے۔ یاسمین حفیظ نے میری فرمائش پر بہت ساری شاندار کہانیاں، ماہ نامہ انوکھی کہانیاں میں لکھی ہیں۔ نوٹ بنوٹ مصنف ایوارڈ کی تقریب میں مجھے اور یاسمین حفیظ کو دو دو نوٹ بنوٹ مصنف ایوارڈز ملے ہیں۔

ہونہار کلب کا ذکر آیا ہے تو بھی بتاتا چلوں کہ ہونہار کلب کے صدر ایک زمانے میں حنیف سحر تھے اور نائب صدر سلمٰی کنول قاضی، ہونہار کلب کے تحت متعدد پروگرام ہوئے جس میں عبدالعزیز عزمی، علی حسن ساجد، جمال صدیقی، خواجہ وقار احمد، کاوش صدیقی، امتیاز ملک، اقبال ناز، محبوب الٰہی مخمور (راقم) یاسمین حفیظ، آفتاب عالم خان، مظہر یوسف زئی، ذریب ملیح آبادی، ابن حسن نگار، شاہد جمیل، فضل الرحمن یوسفی اور انیس الرحیم نے شرکت کی۔ پھر آئندہ ہونہار کلب کی صدارت مجھے ملی اور میں نے بھی متعدد تقریبات منعقد کروائیں۔

میری اسکول اور کالج لائف میں میری چھوٹی بہن (جو تین سال چھوٹی تھی) یاسمین الٰہی نے میرا بہت خیال رکھا۔ میری صحت کے حوالے سے تھے اور کھانے پینے کے حوالے سے وہ بہت متحرک تھی۔ اُس نے پورے گھر کا انتظام سنبھال رکھا تھا۔ ہم سب بہن بھائی خوب انجوائے کرتے تھے۔ دوسری بہن شاہین اور تیسری پروین کے ساتھ میں نے بہت سیر سپاٹے کیے جب کہ انعام، احسان، نسرین اور نازنین ہمارے ساتھ تفریح وغیرہ کرتے تھے۔

اکثر میں گھر سے دیر سے آتا تو میری بہن یاسمین میرا انتظار کرتی تھی۔ پھر شاہین اور پروین مجھے گرما گرم کھانا دیتے تھے۔ ہم بہن بھائیوں نے بہت سے ریل کے سفر کیے، جن میں خوب انجوائے کیا۔ یاسمین اور شاہین کی شادی واہ کینٹ ہوگئی۔ میرے بہنوئی سید خالد محمود جو یاسمین کے شوہر ہیں ایک سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کے دو بچوں نعمان اور حسان نے قرآن کریم حفظ کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اسکول کے پوزیشن ہولڈر ہیں جب کہ ذیشان اور عمیرہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ میں نے ٹنڈ کرائی اور چمکتا ہوئے سر کے ساتھ واہ کینٹ چلا گیا تو تمام افراد حیران رہ گئے خاص کر میری بھانجی عمیرہ خالد کی تو ہنسی چھوٹ گئی۔ میری دوسری بہن شاہین بھی واہ کینٹ میں

ہے۔ اُن کے شوہر تنویر فیاضی بھی واہ فیکٹری میں ملازم ہیں۔ ان کے بچے سلیمان، عثمان اور اقراء ہیں۔ تینوں بچے پڑھائی لکھائی میں اچھے ہیں میں جب واہ کینٹ جاتا ہوں تو تمام بچے میرے گرد جمع ہو جاتے ہیں پھر میں انہیں خوب سیر سپاٹے کراتا ہوں۔

اس طرح پروین اور ان کے شوہر یونس سورتی کا ذکر آتا ہے یہ فیملی بھی بہت نائس ہے۔ تسمیہ، شایان اور عالیان پڑھنے لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں، جب کہ نسرین اور نازنین بھی ٹھیک ہیں۔ انعام الٰہی ایک ٹی وی چینل میں جاب کرتا ہے، جب کہ سب سے چھوٹا بھائی احسان الٰہی مستقل کی ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اُس نے اپنی پڑھائی کے سلسلے میں بے حد محنت کی ہے۔ آج وہ اُس کا پھل پا رہا ہے۔

ملتان کے ایک میرے دوست خواجہ مظہر نواز صدیقی بھی ہیں کافی عرصہ قبل کراچی آتے تھے تو ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ پھر گزشتہ ایک تقریب میں ملتان جانا ہوا تو پھر ملاقات ہوئی۔ بہت اچھا لگا۔ اس سفر ملتان میں، میں، سید صفدر رضا، غلام محی الدین ترک، سید رفیع الزماں، نوشاد عادل اور محمد سعید سعیدی ایک ساتھ تھے۔ ریل کا سفر بہت شاندار رہا۔ خصوصاً سید صفدر رضا رضوی کے بھائی شبر رضوی نے حیدرآباد اسٹیشن پر ہمارا استقبال کیا۔ چکن کڑاہی، گرما گرم روٹیاں، چائے اور سموسوں سے ہماری تواضع کی۔ چکن کڑاہی شبر رضوی نے خود بنائی تھی اس میں جو ذائقہ تھا وہ آج تک بھولے نہیں بھولتا۔ ملتان تک کے سفر میں ہم شبر رضوی کو دعائیں دیتے رہے۔

ملتان میں ہماری ملاقات محترم مظہر کلیم ایم اے سے ہوئی، جن سے ملنا ہماری زندگی کا ایک یادگار واقعہ تھا۔ اس موقع پر حیات خان نیازی سے بھی ملاقات ہوئی اور تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ملتان کی تقریب میں چند باتیں ایسی ہوئیں جو نہ ہونی چاہیے تھیں جس پر مجھے افسوس ہوا، البتہ اس تقریب کے ذریعے کچھ لوگ پہچانے گئے وہ کیا ہیں۔ ملتان میں شاہد حفیظ، صداقت حسین ساجد، عادل صدیقی، عرفات ظہور، ندیم اختر، عبداللہ نظامی، عاطر شاہین، محمد حیات خان نیازی، محمد فہیم عالم، خواجہ مظہر نواز صدیقی، محمد علی لطیف کھوکھر، پھول بھائی، وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جس پر کالیڈ کے تمام عہدے داران مسرور ہوئے۔

یہ ایک عجیب واقعہ میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ پیش آیا۔ یہ ستمبر 1991ء کی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

بات ہے کہ ہم لوگ کرائے کے فلیٹ میں شکیل کارپوریشن کے فلیٹ میں شفٹ ہوئے۔ یہ فلیٹ ایک ہندو کی ملکیت ہوا کرتا تھا اور اس فلیٹ کے بارے میں عجیب وغریب اور جنوں کے واقعات بھی مشہور تھے مگر ہمیں اس کی خبر نہ تھی۔ ہم خوشی خوشی کریم آباد کے فلیٹ میں منتقل ہو گئے۔ دوسرے دن صبح چوکیدار نے پوچھا کہ ہمارے فلیٹ کا نمبر کیا ہے جب ہم نے فلیٹ نمبر بتایا تو وہ بڑی زور سے چونکا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو وہ ہماری بات ٹال گیا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح چوکیدار ہمارے فلیٹ پر آیا اور پوچھا خیریت ہے۔ ہم نے پوچھا ''کیوں کیا ہوا تو وہ بولا'' کل رات آپ کے فلیٹ سے لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہم نے کہا ''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی ہے'' اس پر وہ واپس چلا گیا۔ ان ہی فلیٹوں میں ہمیں ایک جاننے والے مل گئے جب ہم نے انہیں بتایا کہ فلاں فلیٹ میں آئے ہیں تو اس نے پریشانی کا اظہار کیا اور کہا کہ کچن کے پاس جو بڑی کھڑکی ہے اسے بند رکھا کرو۔ ہم نے وجہ پوچھی تو وہ فوراً جواب دیئے بغیر وہاں سے کھسک گئے۔ ہم سوچتے رہے کہ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے۔ رات یا دن میں یہاں گھر والے باتھ روم وغیرہ جاتے تو لائٹوں میں پانی خود بخود چلنے لگتا تھا۔ پہلی رات میں سونے کے لیے لیٹا تو پوری رات ایسا لگا کہ جیسے کوئی لڑ رہا ہے لڑنے کے لیے بھی مجھے نیند نہیں آئی پھر دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی ہوا کہ 72 گھنٹے میں مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔ اس کے علاوہ جب میں ستمبر 1991ء کے رسالے کراچی فلیٹ میں پہنچا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی میرے پاؤں میں دھاگے لپیٹ رہا ہے مگر نظر کچھ نہ آتا تھا۔ ایک رات ایک بجے مجھے آوازیں آئیں جیسے بچے بہت سے بچے کھیل رہے ہوں۔ جب میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ رات کو فلیٹ کی چھت پر کسی کے چلنے کی آوازیں بھی آتی تھی۔ ایک صبح میں نے دیکھا کہ والد صاحب مجھ سے پہلے اٹھ گئے ہیں اور شیو کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھے پھر والد صاحب نظر آئے میں نے ایک گھنٹے قبل شیو والی بات کی کہ آپ اتنی صبح کہاں کی تیاری کر رہے تھے تو وہ بولے میں تو ابھی اٹھا ہوں۔ میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے میرے والد صاحب نے میرے نانا سید سراج الدین صاحب کو بلایا اور انہیں تفصیل سے آگاہ کیا تو انہوں نے پورے فلیٹ میں حصار باندھا اور دم کیا اور کہا کہ اب تمام معاملات صحیح ہو گئے ہیں اس لئے اب ہم پر کچھ نہیں ہوگا۔ دو چار دن سکون

سے گزرے پھر یہی واقعات دوبارہ شروع ہوئے جس کا رکنا ناممکن نظر آتا تھا۔ والد صاحب نے میرے نانا سراج الدین صاحب کو دوبارہ بلایا۔ انہوں نے دوسری مرتبہ آیت قرآنی کی تلاوت کی اور پھر انہوں نے کہا'' کہ اب یہ فلیٹ چھوڑ دینا چاہیے ورنہ زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ الماری پر رکھا ہوا بستر زمین پر گرا۔ نانا جان نے کہا'' یہ اس بات کی علامت ہے کہ جلد از جلد گھر چھوڑ دیا جائے'' یوں ہم نے فوراً سامان سمیٹا اور اس آسیب زدہ گھر کو خیر باد کہہ دیا۔

مجھے کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا ابتدائی جماعتوں سے شوق تھا۔ 1980ء میں، میں نے ایک رسالہ ''ذکی'' نکالنے کا پروگرام بنایا، جب کہ اس وقت میں نے میٹرک بھی نہیں کیا تھا۔ نہ اس وقت میرے پاس وسائل تھے نہ رسالے کی اشاعت کے سلسلے میں کوئی سمجھ بوجھ تھی۔ بس ایک پوسٹر پرنٹ کروالیا اور بچوں کے ادیبوں کے پتے میرے پاس تھے انہیں وہ پوسٹر بھیج دیا۔ شوقیہ رائٹرز نے بے شمار تحریریں میرے پتے پر ارسال کر دیں۔ اس رسالے کی اشاعتی ٹیم میں امان اللہ راجا اور اکبر شاہ تیموری میرے ساتھ تھے۔ پھر جب تمام اخراجات اور مسائل کا علم ہوا تو ہم رسالہ نہ نکال سکے۔ اسی زمانے میں لانڈھی سے ایم مغیث اکوزئی، شکیل احمد عزیزی، جاوید بادشاہ، یار محمد، ابن ولایت یار محمد، رفیق اختر بھی خوب کہانیاں لکھتے تھے۔ الد... علی مختار، آفتاب عالم خان، رخسانہ تاج، ندیم واسطی، محمد ذاکت علی، سیما واسطی بھی لکھا کرتے تھے۔

بچوں کے ادیبوں کی سب سے پہلے حوصلہ افزائی ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ کے چیف ایڈیٹر محمود شام صاحب کی۔ انہوں نے بچوں کے ادیبوں کی ہر ماہ میٹنگ کا انعقاد کرنا شروع کیا، جس میں مصطفی ہاشمی، عبدالعزیز عزمی، خواجہ وقار احمد، عابد رضا ارتقائی، ڈاکٹر ظفر احمد خان، محبوب الٰہی مخمور (راقم)، اقبال ناز وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ پھر اس سلسلے کو حنیف سحر نے اور وسیع کیا اور کراچی بلکہ پاکستان کے بہترین ادیبوں کو ٹوٹ بٹوٹ میں جمع کیا اور ان کی میٹنگیں کیں۔ محمود شام صاحب کی حوصلہ اور راہنمائی نے بچوں کے متعدد ادیبوں کو اس جانب راغب کیا۔

اس کے بعد ہونہار پاکستان رسالہ کو بھی خیال آیا اور سب سے آخر میں نونہال نے بھی نوجوان، بچوں کے ادیبوں کی تحریریں شائع کرنا شروع کی۔ ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ نے پروقار اور

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

شاندار ایوارڈ فنکشن کروا کر بچوں کے ادیبوں کو ایوارڈ اور نقد انعامات دیے۔ وزیر اعلیٰ ہاؤس میں بچوں کے ادیبوں کے اعزاز میں دعوت کروائی۔ اس لیے آج بھی مجھ مست بچوں کے متعدد ادیب جو اب ایڈیٹرز، صحافی، ڈرامہ نگار اور دیگر شعبوں کے کامیاب افراد ہیں۔ محمود شام صاحب کو اپنا استاد مانتے ہیں۔ آج اس بات کو 30 سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ میں آج بھی محمود شام صاحب سے ملاقات کرتا ہوں۔ میں تو کیا بہت سے ساتھی ادیب بھی ملتے ہیں، مگر محمود شام صاحب کی عادت والطوار میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا وہ آج بھی ویسے ہی ملتے تھے جیسے آج سے 30 سال قبل ملتے تھے۔ آج بھی ان کے چہرے پر وہی پرخلوص مسکراہٹ اور وہی اپنائیت موجود ہوتی ہے اور آپ ان سے ملیں اُن کا چہرہ آئینے کی مانند آپ کو بتائے گا کہ محمود شام بالکل ویسے ہی ہیں جو اُن کا چہرہ بول رہا ہے، ورنہ آج وہ اتنے مصروف ہیں۔ اتنے بڑے صحافی ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ گروپ ایڈیٹر ہیں۔ علمی و ادبی و سیاسی شخصیت و صحافی، مصنف و ادیب ہیں، مگر وہ مجھ سے بلکہ اُس وقت کے ٹوٹ بٹوٹ کے لکھنے والوں سے پرخلوص انداز سے ملتے ہیں۔ انہیں وقت دیتے ہیں اگر ہمیں ان سے کوئی کام پڑ جائے ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ ایسے عظیم لوگوں کا سایہ تادیر قائم و دائم رہے۔

بچوں و بڑوں کے ممتاز سینئر شاعر ضیاء الحسن ضیا کا انوکھی کہانیاں اور مجھ سے بڑا پرانا ناطہ ہے۔ اکثر ضیاء صاحب میرے آفس آتے ہیں اور اپنی نگارشات سے نوازتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بے حد قیمتی مشورے بھی دیتے ہیں۔ میں نے ضیاء الحسن ضیا سے زیادہ مخلص شخص بچوں کے ادب میں نہیں دیکھا۔ انتہائی نفیس شخصیت کے مالک ہیں۔ بہت سارے بچوں کے شاعروں کے کلام کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو لکھنے کے اسرار و رموز بھی سکھاتے ہیں۔ نہ کسی سے اس بات کا ذکر کرتے ہیں نہ کسی کو جتلاتے ہیں۔ ضیاء الحسن ضیا ایک گھنے درخت کے مانند ہیں جس کے سائے سے ہر خاص و عام مستفید ہو رہا ہے۔

وہ دوست اور رائٹرز جو میرا بہترین اثاثہ ہیں، ان میں الطاف حسین، نوشاد عادل، غلام محی الدین ترک، محمد علی، صداقت حسین ساجد، شاہد حفیظ، رانا محمد شاہد، ڈاکٹر عمران مشتاق، احمد عدنان طارق، رضیہ خانم، رابعہ حسن، رابعہ شاہین، محمد سعید عباس، عبداللہ نظامی، ندیم اختر، عادل منہاس،

ابن آس محمد، صفدر رضا، شفیق غزالی، جدون ادیب، مصطفیٰ ہاشمی اور محمد وسیم خان شامل ہیں۔

ماہ نامہ "انوکھی کہانیاں" کراچی کے ذریعے میں نے صحیح معنوں میں زندگی کو سمجھا، لوگوں کو جانا۔ اس رسالے کے ذریعے میرا حلقہ احباب وسیع ہوا۔ جب پہلا رسالہ پرنٹنگ کے مراحل میں تھا تو میں نے اس کے لیے اشتہارات جمع کرنے کی مہم شروع کی اور بہت سے پرخلوص دوستوں اور بزرگوں کا میرے ساتھ تعاون رہا۔ خصوصاً عبدالقادر کوتوال صاحب، محترم عارف ڈوسل، حکیم محمد سعید شہید، حکیم عبدالقادر قریشی شہید، شیخ منظر عالم صاحب، رحمان علی صاحب، ایاز رحمان صاحب، جناب سردار شہزاد، ندیم نظام صاحب، آفتاب صاحب اور صابر صاحب۔

ابتداء میں "انوکھی کہانیاں" کے لیے کہانیوں کا معیار ہم نے بہت بلند رکھا تھا، جس کی وجہ سے بہت سی کہانیاں واپس کر دیا کرتے تھے۔ تاہم "انوکھی کہانیاں" میں شازیہ فرحین، محمد سعید عباس، عمران مشتاق، سلمان غزالی، شاہد علی سحر، مصطفیٰ چاند، سہیل اختر ہاشمی کی بے شمار کہانیاں شائع ہوئیں۔ جدون ادیب کے ذریعے الطاف حسین سے میری دوستی ہوئی اور الطاف حسین نے ہمارے رسالہ میں لکھنا شروع کر دیا۔ اس بات کو کئی سال ہو گئے ہیں۔ الطاف حسین آج بھی "انوکھی کہانیاں" اور میرا دوست ہے۔ الطاف حسین کی سنجیدہ اور مزاحیہ تحریریں سب میں پسند کی جاتی ہیں۔ الطاف حسین سیدھا اور کھرا بندہ ہے، جس سے دوستی کرتا ہے کھل کر کرتا ہے اور جس سے لڑائی کرتا ہے تو کھل کر کرتا ہے۔ سچی اور کھری بات کہنے سے نہیں ڈرتا ہے۔ میری آپ بیتی میں انوکھی کہانیاں لازم و ملزم ہے اور میرے رسالہ کو اس مقام تک پہنچانے میں آصف اصغر خان صاحب، ثاقب حبیب صاحب، ضیاء قریشی صاحب اور ندیم نظام (امیج ایڈورٹائزنگ) کا کردار قابل تحسین ہے۔ ان افراد نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا۔

"انوکھی کہانیاں" کے امور کی تمام تر ذمہ داری برائے لاہور خرم لودھی کے سپرد ہے۔ خرم لودھی نے میرے لیے وہ کچھ کیا ہے جو کہ میرا بھائی بھی نہ کر سکا اور نہ ہی کر سکے گا۔ جب میں لاہور شہر میں رسالے کے کام کے سلسلے میں لوگوں سے ملتا تھا تو خرم لودھی میرے ساتھ میرے سائے کی مانند ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے صبح دوپہر شام ہو رات وہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک واقعہ کا خصوصاً ذکر ضروری سمجھتا ہوں کہ جب میں اور خرم لودھی خالد خواجہ صاحب کے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

پاس اشتہار کے سلسلے میں گئے تو انہوں نے انتظار گاہ میں بٹھوا دیا اور بھول گئے میں اور خرم لودھی تین چار گھنٹے بیٹھے رہے۔ پھر جا کر یاد دہانی کروائی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے کمرے میں پہنچتے ہی سرکولیشن اور رسالہ کے معیار اور پتا نہیں کیا کیا سوالات کی بوچھاڑ کر دی خواجہ صاحب کا رویہ بڑا سخت تھا مگر ہم نے ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے واپسی پر خرم نے کہا کہ "یار محبوب" خواجہ صاحب کا رویہ تو ٹھیک نہیں ہے مگر ہمیں ان کی جان نہیں چھوڑنی ہے" اور اس طرح کئی دن تک خواجہ صاحب کے آفس جاتے رہے آخر پانچویں دن خواجہ صاحب نے ہمیں پورے سال کے لیے اشتہارات جاری کر دیے آج اس بات کو طویل عرصہ ہو گیا ہے، مگر خرم اور میری خالد خواجہ صاحب سے تعلق داری و محبت آج بھی برقرار ہے میں جب بھی لاہور جاتا ہوں خواجہ صاحب سے ضرور ملتا ہوں بقول خواجہ صاحب کے خرم لودھی اور میں نے رسالہ کے لیے بہت محنت کی جب پہلی مرتبہ تم دونوں میرے پاس آئے تھے تو لڑکے لگتے تھے اب تو بابا لگتے ہو۔

جب ہم نے انوکھی کہانیاں شروع کیا تو اشتہارات کا شعبہ میرے پاس تھا۔ جولائی 1991ء کی بات ہے۔ ہم نے ہمدرد سے اشتہار لینا تھا۔ ہمدرد مطب آرام باغ میں میرا دوست حکیم عبدالقادر قریشی، حکیم محمد سعید کے نائب حکیم تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ ہم رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ ہمدرد کا اشتہار لینا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب سے ملاقات کرا دو، تاکہ ہمیں اشتہار مل جائے۔ اس پر حکیم قادر قریشی نے کہا کل آجاؤ۔ میں نے کہا کس وقت؟

بولے۔ "فجر کی نماز کے بعد۔"

میں حیران ہوا۔ "اتنی صبح؟"

وہ بولے۔ "حکیم محمد سعید صاحب فجر کی نماز کے بعد سے ہی مریض دیکھتے ہیں۔"

پھر میں اور مصطفیٰ ہاشمی صبح سات بجے آرام باغ پہنچ گئے۔ حکیم قادر قریشی صاحب نے کچھ دیر کے بعد ہمیں اندر بلوایا اور ہم نے آنے کا مقصد بیان کیا۔ میں نے ایک سرخ و سفید چہرے والے شخص کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ پھر وہ مخاطب ہوئے۔ میں ان کا لباس دیکھنے لگا۔ سفید رنگ کی شیروانی پہنے ہوئے حکیم محمد سعید صاحب بیٹھے تھے۔ ان کی مسکراہٹ نے ان کے چہرے

پر ایک نور سا پیدا کیا تھا۔ مجھے ان کی شخصیت سے کوئی خوف پیدا نہیں ہوا، بلکہ ان کے سامنے والی کرسی پر ادب سے بیٹھ گیا۔ وہ اس دوران مریضوں کو بھی دیکھتے رہے۔

حکیم محمد سعید صاحب مزید اپنائیت کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "جی فرمایئے؟"

میں نے اپنا مقصد بتایا کہ ہم دوست مل کر انوکھی کہانیاں رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ آپ سے اشتہار کی درخواست لے کر آئے ہیں۔

حکیم محمد سعید صاحب گویا ہوئے۔ "رسالہ کا کیا مقصد ہے؟"

میں نے کہا کہ پاکستان اور اسلام سے محبت۔ انہوں نے مجھ سے اشتہار کا لیٹر لیا اور اس پر ہدایات لکھ دیں اور کہا کہ ناظم آباد سے اشتہار لے لیں۔ میں نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا اور فوراً ہمدرد ناظم آباد مصطفیٰ ہاشمی کے ساتھ روانہ ہوا، جن کے پاس بائیک تھی۔ ہمدرد سینٹر میں رحمان علی صاحب سے ملاقات کر کے انہیں حکیم محمد سعید صاحب کی جانب سے لکھا ہوا لیٹر دیا۔

رحمان علی صاحب نے وہ لیٹر لیا اور فرمایا۔ "کتنے شمارے شائع ہو چکے ہیں؟"

اس پر میں نے کہا۔ "پہلا شمارہ اب شائع ہوگا۔"

انہوں نے لیٹر لے کر کہا۔ "تین شمارے شائع ہو جائیں تو آنا۔ اس کے بغیر اشتہار نہیں ملے گا یہ ہماری پالیسی ہے۔"

میں نے انہیں حکیم محمد سعید کی لکھی ہدایت دکھائی مگر وہ نہ مانے اور میں واپس آ گیا۔ میں نے حکیم عبدالقادر قریشی کو دوپہر میں فون کیا کہ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے اشتہار نہیں ملا۔

اس پر وہ بولے۔ "کل پھر صبح آؤ۔ پھر حکیم محمد سعید صاحب سے مل لو۔"

میں نے ہامی بھر لی اور اگلی صبح میں پھر آرام باغ پہنچ گیا۔ ایک بار پھر ہماری شہید پاکستان حکیم محمد سعید صاحب سے ملاقات ہوئی۔

مجھے دیکھ کر انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "کیا ہوا میاں؟"

میں نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس پر حکیم محمد سعید صاحب نے کہا۔ "نیا لیٹر لے آئے ہیں؟"

میں نے نیا لیٹر انہیں پیش کیا۔ حکیم صاحب نے اپنا قلم نکالا تو میں نے کہا۔ "براہ کرم آپ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

سبز سیاہی والے پین سے نہ لکھیں۔"

اس پر انہوں نے ہاتھ روک کر کہا۔ "کیوں؟"

میں نے کہا۔ "سبز رنگ سے لکھنے کا مقصد ہے اشتہار نہ دیا جائے، اسی لیے مجھے اشتہار نہیں ملا ہے۔ واقعی کیا ایسا ہوتا ہے؟"

اس پر وہ بہت ہنسے اور بولے۔ "آپ کے پاس قلم ہے؟"

میں نے اپنی جیب سے قلم نکال کر انہیں پیش کیا۔ مسکرائے اور پھر انہوں نے میرے قلم سے اشتہار دینے کے لیے ہدایات جاری کیں اور بولے۔ "اب تو آپ خوش ہیں۔ سبز کے بجائے نیلی سیاہی سے میں نے لکھا ہے اور وہ بھی آپ کے قلم سے۔"

میں ایک بار پھر ہمدرد سینٹر ناظم آباد رحمان علی صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں دوسرا ایڈیٹر پیش کیا تو وہ حیران ہوئے کہ میں دوبارہ حکیم محمد سعید صاحب سے مل کر ان کے لیے نئی ہدایات والا ایڈیٹر لے آیا ہوں۔ پھر رحمان علی صاحب نے ہمارے رسالہ کو پہلا اشتہار جاری کر دیا اور 2014ء میں 24 سال سے زائد ہو گئے ہیں اور ہر شمارے میں ہمدرد کا اشتہار ضرور موجود ہوتا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب نے نہ صرف بچوں کے رسائل کو ترجیحی بنیادوں پر اشتہارات جاری کرنے کی ہدایت کی ہوئی تھی، بلکہ بچوں کے ادب کے لیے ان کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اس کے علاوہ بھی حکیم محمد سعید صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں، مگر ان جیسی شخصیت کا مالک میں نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ اُن کی زندگی ایک سچے پاکستانی کی تھی، وہ بغیر سیکیورٹی کے آتے جاتے تھے۔ وقت کی پابندی اُن کا طرہ امتیاز تھی۔ پاکستان سے محبت اُن کے انگ انگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے پاکستانیوں کی خدمت کرتے کرتے جام شہادت نوش کیا۔

یہ واقعہ میری یادوں میں ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے۔

"انوکھی کہانیاں" کے ساتھ ساتھ میں نے ایک فلمی اخبار اور ایک اسپورٹس کا اخبار بھی جاری کیا تھا۔ دونوں کے بارہ بارہ شمارے آئے۔ پھر میں ان دونوں اخبارات سے کنارہ کش ہو گیا، کیوں کہ میرا رجحان اس جانب نہیں ہو رہا تھا۔

"انوکھی کہانیاں" کے حوالے سے نوشاد عادل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ نوشاد عادل کی طویل ترین تحریریں میں نے ہی شائع کی ہیں۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، نوشاد عادل لکھتا ہی بہت شان دار ہے۔ بچوں کی پسندیدگی میں نوشاد عادل اور سعید عباس سرفہرست ہیں آج کل احمد عدنان طارق، غلام محی الدین ترک اور ڈاکٹر عمران مشتاق بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔

میری زندگی کا ایک یادگار لمحہ وہ تھا، جب انوکھی کہانیاں نے 1991ء میں دعوۃ اکیڈمی سے تیسرا انعام حاصل کیا تھا اور یہ انعام مصطفیٰ ہاشمی نے وصول کیا تھا، جب کہ اُس وقت رسالے کو شائع ہوتے ہوئے چند مہینے ہوئے تھے۔ اس کے بعد انوکھی کہانیاں نے دوسرا انعام، چوتھا انعام حاصل کیا اور دسمبر 2010ء میں انوکھی کہانیاں پاکستان بھر میں اول نمبر پر آیا۔ یہ ایک ناقابل فراموش لمحہ ہے۔ آج انوکھی کہانیاں سیکڑوں شمارے شائع ہو چکے ہیں اور بچوں کے ادب میں انوکھی کہانیاں ایک حوالہ بن چکا ہے۔ انوکھی کہانیاں کے اولین شماروں میں یحییٰ حسینی کی تحریریں اور قلمی دوستی میں تعارف بھی شائع ہوا ہے، جو اس وقت جیوپر کی ایک معروف شخصیت ہیں۔

یہ میری زندگی کا یادگار واقعہ بھی ہے کہ مجھے ایک خط پنجاب لائبریری پروجیکٹ کے ڈائریکٹر کی جانب سے خط ملا ہے کہ میں ایک کتاب ساڑھے سترہ ہزار کی تعداد میں چھاپ کر لاہور بھجواؤں۔ اس پروجیکٹ کے ڈائریکٹر محمد حسین رضوی تھے انہوں نے میری ہر ممکن رہنمائی کی اور ہم نے مقررہ تعداد میں کتاب چھاپ کر بھجوادیں جس کے بل کی ادائیگی محمد حسین رضوی نے فوراً کرادی۔ محمد حسین رضوی ایک عظیم دوست اور کتاب دوست شخصیت ہیں ان سے میری گفتگو ہمیشہ ٹیلی فون پر ہوئی مگر ان کی شخصیت ہمیشہ ایک باکردار علم دوست انسان کے عنوان سے میرے سامنے رہے گی۔

ویسے تو میں متعدد مرتبہ لاہور گیا ہوں اور ہر بار دوستوں سے ملاقات ہوتی رہی ہے۔ آخری مرتبہ میں افق دہلوی، امان اللہ نیئر شوکت، امتیاز عارف اور ڈاکٹر طارق ریاض سے ملاقات ہوئی۔ امان اللہ نیئر شوکت نے پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور لاہور کے دوستوں نے کافی سارے تحفے بھی مجھے دیئے۔

اس بات کا میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ ابھی پبلی کیشنز کی چار کتابیں (۱) یہ میرا پاکستان ہے (۲) وہ شمع

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

جس نے (۳) نسخہ حیات (۴) امن مشن پچاس ہزار کی تعداد میں پنجاب کی لائبریوں میں بھیجی گئی ہیں۔ الٰہی پبلی کیشنز کے زیر اہتمام درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

☆ خوف ناک کہانیاں ☆ خوشیوں بھرے غبارے ☆ چوں کہ چناں چہ ☆ پراسرار گڑیا ☆ علامہ اقبال ☆ خالق پاکستان محمد علی جناح ☆ بانی پاکستان محمد علی جناح ☆ مصور پاکستان علامہ اقبال ☆ جزیرے کے قیدی ☆ چار سال کا بچہ ☆ پھول کی پتی ☆ وادی جان ہسپانیہ میں ☆ ہیرا موتی ☆ وہ شمع جس نے ☆ نسخہ حیات ☆ ایک ٹوٹا ہوا آنسو ☆ ساتواں طلسم ☆ دیوزاد ☆ بھیانک لمحہ ☆ آٹھواں کمرا۔

میرے لیے یہ لمحہ بھی قابل ذکر ہے، جب میرے بیٹے عمیر الٰہی نے میٹرک کا امتحان 88 فی صد سے پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا اور اب وہ آدم جی کالج کا طالب علم ہے۔ علاوہ ازیں عمیر الٰہی کی دو کتابوں کو NBF نے اول انعام سے بھی نوازا ہے۔

جب میں نے میٹرک سائنس گروپ سے پاس کرنے کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لیا تو سائنس گروپ میں نمبر کم آئے۔ پھر میں نے سراج الدولہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ داخلہ لینے جب میں پہنچا تو داخلے بند ہو چکے تھے۔ میں پرنسپل پروفیسر میر حامد علی صاحب کے پاس گیا، جو علمی و ادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے داخلے سے انکار کر دیا تو میں نے بتایا کہ میں کہانیاں وغیرہ لکھتا ہوں، جس پر انہوں نے میری کہانیاں منگوائیں۔ دوسرے دن میں اپنی کہانیاں لے کر گیا تو انہوں نے میرے داخلے کی منظوری دے دی اور یوں میں نے سراج الدولہ کالج سے بی اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ پھر ایم اے میں داخلہ کا پروگرام بنایا اور داخلہ کے لیے وفاقی اردو کالج پہنچ گیا۔ اُس وقت شعبہ صحافت کے چیئرمین پروفیسر علی محمد شاہین تھے انہوں نے داخلہ کے لیے شرط رکھی کہ میں صحافت کے شعبہ سے منسلک ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کروں، خصوصاً کسی اس رسالے کا، جس میں لکھتا ہوں۔

میں وہاں سے سیدھا محمود شام صاحب کے آفس آیا، جو اُس وقت ہفت روزہ معیار اور ماہ نامہ ٹوٹ بٹوٹ شائع کرتے تھے اور ٹوٹ بٹوٹ میں میری متعدد کہانیاں شائع ہو چکی تھیں۔ محمود شام صاحب نے فوراً لیٹر ہیڈ نکالا اور اپنی رائٹنگ میں ایک بہترین سرٹیفکیٹ لکھ کر دیا، جسے میں

نے پروفیسر علی محمد شاہین کو پیش کیا۔ انہوں نے محمود شام صاحب کا سرٹیفکیٹ دیکھا اور فوراً داخلہ دے دیا۔ یوں ایم اے صحافت کا سفر شروع ہوا۔ ایم اے صحافت میں میرے کلاس فیلو بشیر سدوزئی (جو سٹی گورنمنٹ میں ڈائریکٹر ہیں)، عارف مصطفیٰ (کوئز ماسٹر) اور اجمل خٹک (جنگ کے صحافی اور کالم نگار) تھے۔ ایم اے صحافت پاس کرنے کے بعد میں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ میری کلاس فیلو رعنا اقبال تھیں، جو اس وقت ڈاکٹر رعنا اقبال ہیں۔ وفاقی اردو یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ جن اساتذہ سے میں نے پڑھا۔ سلیم مغل، بنویر شعیب بلی محمد شاہین، سعید قادری، علی حیدر ملک، توصیف خان، ذکریا ساجد وغیرہ شامل تھے۔

ماہ نامہ "انوکھی کہانیاں" کراچی میں اُتار چڑھاؤ آتے رہے ہیں، مگر آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ قائم و دائم ہے۔ ایک زمانے میں میرے پاس رسالہ چھپوانے کے لیے رقم نہ تھی تو میں نے اپنے آفس سے قرض لے کر اسے جاری و ساری رکھا۔ میرے والد الٰہی بخش چشتی (تونسوی) نے ہر قدم پر میری راہنمائی کی اور میرا حوصلہ بڑھایا اور انوکھی کہانیاں کو جاری رکھنے پر زور دیا۔

اپنی آپ بیتی میں اپنے خاندان کا حوالہ بھی دینا چاہوں گا۔ ڈیرہ غازی خان کی تحصیل تونسہ شریف میں خواجہ سلیمان تونسویؒ اور خواجہ نظام الدین تونسویؒ کے مزارات ہیں اور یہ دونوں بہت عالی مرتبت بزرگ گزرے ہیں جن سے دنیا نے فیض حاصل کیا۔ خواجہ سلیمان تونسویؒ نے تونسہ شریف آباد کیا اور وہ اپنے ساتھ میرے جد امجد میاں احمد کھوکھر چشتی سلیمانی کو لائے اور تونسہ شریف کو آباد کیا۔

یعنی میاں احمد پھر میاں شیر محمد، پیر حافظ بخش پھر محمد یار پھر میرے دادا احمد بخش پھر میرے والد الٰہی بخش تونسوی چشتی۔ یوں میرے دادا کے دادا بلکہ ان کے دادا نے تونسہ شریف آباد کیا بعد میں خواجہ سلیمان تونسویؒ کے مرید و خلیفہ مقرر ہوئے۔ آج بھی میرے خاندان کے متعدد افراد تونسہ شریف میں رہائش پذیر ہیں۔ تونسہ شریف اور خواجہ سلیمان تونسویؒ کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں میرے دادا کے دادا بلکہ ان کے دادا کا ذکر بھی موجود ہے۔

یہ ہمارے ساتھ ایک روحانی سلسلہ کی کڑی ہے۔ میرے والد صاحب الٰہی بخش چشتی تونسویؒ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کبھی کبھی کچھ ایسے واقعات کا ذکر کرتے تھے کہ نیند کی حالت میں انہوں نے ایسی جگہیں دیکھی ہیں اور باتیں بتائیں جن کا ظہور ہوا بعد میں پھر اسی طرح کے مختلف واقعات میرے سامنے بھی آئے کہ میں نے بھی وہ تمام واقعات اس سے پہلے نیند میں دیکھے ہوئے ہیں۔

میری دادی میرا بڑا خیال کرتی تھیں۔ میرے لیے کڑھائی والے کرتے بنا کر دیتی تھیں۔ میری پھوپھیاں بھی میرے لیے نت نئے کپڑے بنا کر دیتی تھیں۔ میں جب کبھی تونسہ شریف جاتا تھا۔ میرے لیے خصوصی انتظامات کرتیں۔ مجھے چلغوزے بہت پسند تھے۔ میری دادی کچے چلغوزے منگوا کر خود بھون کر دیتی تھیں۔ میں اپنے علاقے کے پرائمری اسکول بھی جاتا تھا۔ وہاں تختیاں پر لکھ کر پڑھائی ہوتی تھی۔ اس پر اسکول کا کام کرتا تھا۔ میرے تایا واحد بخش کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ جب میں صرف چھ ماہ کا تھا تو وہ مجھے لے کر باہر نکل جاتے تھے۔ تایا جان کا انتقال 1995ء میں ہوا وہ مجھے اپنے بچوں سے زیادہ چاہتے تھے۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میری مرتب کردہ متعدد کتابوں کو نیشنل بک فاؤنڈیشن حکومت پاکستان نے منظور کیا۔ اس کے علاوہ 2012ء میں قائداعظم پر میری کتاب کو نیشنل بک فاؤنڈیشن نے اول انعام سے نوازا۔ اسی طرح سیرت النبی ﷺ نمبر پر دعوۃ اکیڈمی سے انوکھی کہانیاں نے اول انعام حاصل کیا۔

بڑوں کے لیے متعدد افسانے اور کہانیاں لکھی ہیں، جو کہ سسرت ڈائجسٹ کراچی، سچی کہانیاں اور دوشیزہ میں شائع ہوئیں اور یہ باعاوضہ تحریریں تھیں اور پانچ تحریریں دوم اور سوئم انعامات کی حق دار بھی قرار پائیں۔ میں نے چند نظمیں بھی لکھی ہیں۔

مارچ 1995ء میں میری شادی خانہ آبادی ہوئی۔ میری بیگم بی اے پاس ہیں۔ ادب سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انوکھی کہانیاں کے کام سے دور رہتی ہیں۔ اکثر اوقات مجھے انوکھی کہانیاں کے تمام تر کام سرانجام دیتے ہوئے دیکھتی ہیں تو مجھے کوئی اور کام کرنے کے بارے میں کہتی ہیں۔ انہیں کیا پتا کہ ان سے میری دوسری شادی ہے۔ پہلی شادی اگست 1991ء میں انوکھی کہانیاں سے ہوچکی ہے، جب کہ وہ تو مجھے اکثر پریشان کرتی رہتی ہے۔ انوکھی کہانیاں مجھے سکون دیتی ہے، ذہنی آسودگی دیتی ہے۔ انوکھی کہانیاں کے بارے میں انہیں کیا معلوم کہ یہ میرا جنون ہے، جس

کے لیے میں رات چار چار بجے تک جاگتا ہوں۔ اس کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہوں۔ جب نیا شمارہ آتا ہے تو ایک راحت کا احساس ہوتا ہے۔

1996ء میں میرے بیٹے عمیر الٰہی اور 2001ء میں میرے دوسرے بیٹے حماد الٰہی کی ولادت ہوئی اور 2011ء میں میری پیاری بیٹی زوہا محبوب ہمارے گھر میں خوشیوں کی صورت میں آئی اور اب یہ گڑیا سارا دن گھر میں گھومتی ہے اور سب کی لاڈلی ہے۔

فروری 2011ء میں بچوں کے کچھ ادیبوں نے ایک تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا، جو فروغ بچوں کے لیے کام کرے۔ پھر اس کا نام پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ تجویز کیا گیا۔ ان ادیبوں میں سید صفدر رضا رضوی، غلام محی الدین ترک، سید رفیع الزماں، ضیاء الحسن ضیا، نوشاد عادل اور محبوب الٰہی مخمور (راقم) شامل تھے۔ اس سے قبل بھی فروغ ادب کے لیے ہم نے کام شروع کیا تھا، مگر پھر چند وجوہات پر وہ روک دیا گیا، لیکن اس بار پورے عزم کے ساتھ قدم بڑھائے۔ صدارت کے لیے ایک سنیئر ادیب و شاعر کو منتخب کیا گیا، مگر ان کی عدم دل چسپی اور عدم تعاون کی وجہ سے انہیں ہٹا کر فروری 2012ء میں صدر مجھے منتخب کیا گیا۔ الحمد للہ اس تک گائیڈ متعدد تقریبات کر چکی ہے اور متعدد کتابوں کی اشاعت ہو چکی ہے، اس میں بچوں کے ادیبوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ گائیڈ کی نیم اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کر رہی ہے اور فروغ بچوں کے ادب کے لیے کوشاں ہے۔ ساتواں طلسم، پراسرار گڑیا، قائداعظم محمد علی جناح، علامہ اقبال ان کتابوں کے انتساب مسعود احمد برکاتی، ڈاکٹر افتخار کھوکھر، حکیم محمد سعید اور بلوچستان کے بچوں کے ادیبوں کے نام ہے۔ اب گائیڈ کی کوشش ہے کہ مزید کتابوں کو بھی بچوں کے ادیبوں کے نام انتساب کے ساتھ شائع کریں۔ اس طرح گائیڈ بچوں کے ادب سے وابستہ شخصیات کو خراج تحسین پیش کرے گی۔

میں مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ رہا ہوں اور یہ سب تنظیمیں بچوں کے ادب کے حوالے سے تھیں۔ ایک بار پھر بچوں کے ادب کی زبوحالی پر متعدد ساتھیوں نے مل کر پاکستان چلڈرن گائیڈ کا قیام عمل میں لایا گیا، کیوں کہ ہمارے بڑوں نے اس ادب کو تسلیم ہی نہ کیا۔ جی ہاں..... بچوں کے ادیبوں کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کے ادب اور ادیبوں کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ بڑوں کے ادیبوں کے لیے تو پھر بھی صورت حال بہتر ہے کہ انہیں اعزازات بھی مل

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

جاتے ہیں، مگر آج تک ملکی سطح کا کوئی اعزاز بچوں کے ادیبوں کو نہیں دیا گیا، حالاں کہ ہمارے بچوں کے ادیبوں نے ہزاروں ایسی کہانیاں، نظمیں اور مضامین لکھے جن کی الگ ادبی شناخت ہے، جنھیں ادبی معیار پر پرکھا جاسکتا ہے، مگر انہیں نظر انداز کرنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

بچوں کا ادب کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑوں کا ادب بھی خود بخود زوال پذیر ہو گیا۔ پاکستان میں بڑوں کا کوئی ادبی رسالہ باقاعدگی سے نہیں نکل رہا، تاہم بچوں کے پچاس سے زائد رسالے نکل رہے ہیں جن میں نصف باقاعدہ ہیں۔ بچوں کے ادب کو نظر انداز کرنے کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا کہ بچوں کے ادب میں ایک تحریک کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے جو بچوں کے ادب کو پروان چڑھا سکے۔ بچوں کے قلم کاروں کو مناسب حق دلا سکے۔ وہ قلم کار جو اپنی مصروفیات اور فکر معاش کی وجہ سے بچوں کے ادب سے دور ہو گئے ہیں، انہیں واپس اس شعبہ میں لایا جائے، تاکہ وہ پھر سے قلم اور کاغذ سے رشتہ جوڑ سکیں، اپنی خوب صورت تخلیقات پیش کر سکیں۔

ذہن میں یہ احساس جاگا کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی مرحلہ پر گائیڈ (رہنمائی) کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کے ادب اور ادیبوں کے لیے تو یہ ناگزیر ہے۔ اسی احساس نے گائیڈ کے قیام پر دوستوں کو آمادہ کیا ہے۔ جن دوستوں نے یہ بیڑہ اُٹھایا ان میں مجھ سمت نوشاد عادل، سید صفدر رضا رضوی، غلام محی الدین ترک، محمد سعید سعیدی، سید رفیع الزماں اور ضیاء الحسن ضیا شامل ہیں۔ اس گھمبیر صورت حال میں ہم نے اپنے حصے کی شمع کو روشن کرنے کا عزم کیا ہے اور ہم نے گائیڈ کی صورت میں اسے روشن کر دیا ہے گائیڈ میں صرف بچوں کے ادیبوں کی تنظیم نہیں ہے، بلکہ وہ ہر شخص شامل ہو سکتا ہے، جو بچوں کے ادب میں دل چسپی رکھتا ہے اور بچوں کے رسائل اور کتابوں کا قاری ہے۔

عزیز ساتھیو! عزم صادق ہو تو بڑی سے بڑی چٹانوں کو پاش پاش کیا جاسکتا ہے۔ دوستوں آپ اور ہم فرد واحد نہیں ہیں، بلکہ ایک طاقت ہیں ہم گائیڈ کے پلٹ فارم پر متحد ہو کر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اسی نظریئے کے تحت گائیڈ کا قیام ہم لوگوں نے عمل لائے ہیں جس کے تحت حیدر آباد رائٹرز کنونشن، غلام حسین میمن اور عارف شین روہیلہ کے اعزاز میں تقریب، ملتان کے تربیتی کیمپ میں گائیڈ کے چھ عہدے داران کی شرکت اور اسی پروگرام میں دس ہزار روپے کی کتابوں

کی بچوں کے ادیبوں میں تقسیم، عمران یوسف زئی کے اعزاز میں استقبالیہ، نوعمر اور نوخیز ادیبوں اسامہ احمد، محمد شفیق غزالی اور دعاز ہرا کے لیے حوصلہ افزائی کے انعامات، محمد نعیم عالم اور محمد ارشد سلیم کے اعزاز میں استقبالیہ، بچوں کے متعدد ادیبوں کی کہانیوں کے مجموعے پراسرار گڑیا، ساتواں طلسم، خوفناک کہانیاں، چوں کہ چناں چہ، دیو زاد اور بھیانک لمحہ کی اشاعت۔ گائیڈ کے تحت بچوں کے ادیبوں کی سستی ترین کتابوں کی اشاعت کے لیے رہنمائی، بچوں کے ادب سے وابستہ حکیم محمد سعید، محترم مسعود احمد برکاتی، ڈاکٹر افتخار کھوکھر، ضیاء الحسن ضیا، افشاں ساجد، اعجاز شاہ اور بلوچستان کے بچوں کے ادیبوں کے نام پانچ کتابوں کے انتساب کرنے کی نئی روایت کا آغاز کیا ہے۔ گائیڈ کے تحت آئندہ آنے کتب کے انتساب بچوں کے ادیبوں و شعراء کے نام کیے جائیں گے۔

گائیڈ نے تحریک پاکستان، علامہ اقبال اور قائد اعظم پر 3 کتابیں شائع کی ہیں۔ گائیڈ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کی چار کتابوں کو نیشنل بک فاؤنڈیشن نے اول انعامات سے نوازا ہے۔ گائیڈ کے مقاصد یہ ہیں۔

گائیڈ کے مقاصد

- بچوں کے ادب کی ترویج اور قلم کاروں کی بہتری کے لیے کام کرنا۔
- بچوں کے قلم کاروں کی کتابوں کی اشاعت۔
- سستی کتابوں کی اشاعت۔
- بچوں کے ادیبوں کا اپنی مدد آپ کے تحت ایک فنڈ کا قیام جس کے ذریعے کتابوں کی اشاعت اور مستحق ادیبوں کی مالی معاونت۔
- اگر کوئی ادیب اپنی کتاب خود شائع کرانا چاہے تو گائیڈ اسے معاونت کی پیش کش کر سکتی ہے۔
- بچوں کے رسائل کے درمیان خاص نمبر کا مقابلہ منعقد کروانا۔
- قلم کاروں کے لیے بچوں کے ادب کے معمار کے حوالے سے مختلف ایوارڈ کا اجراء۔ حکیم محمد سعید ایوارڈ، مسعود احمد برکاتی ایوارڈ، مظہر یوسف زئی ایوارڈ، محمود شام ایوارڈ۔
- نئے قلم کاروں کو ہر ممکن رہنمائی فراہم کرنا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

}قلم کاروں کے درمیان رابطہ فراہم کرانا۔

}سینئر قلم کاروں کے اعزاز میں اعتراف کمال کی تقاریب منعقد کرنا اور انہیں اعزازات سے نوازنا۔

}ادیبوں کی سال گرہ پر گائیڈ کی طرف سے مبارک باد اور رسائل میں تصویر کے ساتھ پیغام شائع کرانا۔

}گاہے بگاہے قلم کاروں کے لیے گائیڈ قلم کارانسٹی ٹیوٹ کا قیام۔

}بچوں کے ادیبوں کے لیے ایک مرکز کی تعمیر جس میں لائبریری، قلم کاروں کی رہائش کے لیے ہوسٹل، سیمینار ہال وغیرہ شامل ہیں۔

}بچوں کے ادب پر ایک ویب سائٹ کی تشکیل۔

}بچوں کے ادیبوں کے دن منانا۔

}مرحوم ادیبوں کے اعزاز میں یادگاری تقریب منعقد کرنا۔

}قلم کاروں کے لیے تقریب پذیرائی منعقد کرانا ۔

}قلم کاروں کی کتابوں کی تقریب رونمائی۔

}گاہے بگاہے قلم کاروں کی تربیت کے لیے ورکشاپ کا انعقاد۔

}بچوں کے ادب سے متعلق سیمینار کانفرنس، لیکچر، تصویری نمائش کا انعقاد۔

}بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال۔

}بچوں کے رسائل و کتابوں کی نمائش کا انعقاد۔

}بولتی کہانیوں کے ذریعے بچوں میں ادب کا شوق پیدا کرنا۔

}بچوں کے پاکستانی ادب سے انتخاب شائع کرنا۔

}بچوں کے عالمی ادب سے انتخاب شائع کر کے اسے اردو میں شائع کرنا۔

}مختلف ممالک کی لوک کہانیوں کا انتخاب اردو زبان میں شائع کرنا۔

}پاکستان کی علاقائی زبانوں کا انتخاب اردو زبان میں شائع کرنا۔

}بیرون ملک قائم بچوں کے ادب سے وابستہ تنظیموں سے روابط۔

یہ تھا پاکستان چلڈرن گائیڈ کا تعارف اور مقاصد۔ اب دوبارہ اپنی آپ بیتی کی طرف آتا ہوں۔

بچوں کے ادب اور ادیبوں و شعراء کے حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ تعمیر ادب لیہ بہت عمدہ کام کر رہا ہے۔ بچوں کے ادیبوں کو یکجا کر رہا ہے اور عبداللہ نظامی اور ندیم اختر اس سلسلے میں قابل تحسین ہیں۔ آج کے بچوں کے ادب کو حیات خان نیازی، الطاف حسین، محمد شاہد حفیظ، محمد علی، عمران یوسف زئی، طارق ریاض خان، عبدالعزیز چشتی، صداقت حسین ساجد، شفقت محمود ساجد، رانا محمد شاہد، شبیر ناقد، غلام حسین میمن محمد پیرل میرانی، پیر نوید ہاشمی، رضوان بھٹی، عارف شین روہیلہ، پروفیسر مجیب ظفر انوار، رابعہ حسن، رابعہ شاہین، مشتاق حسین قادری، شیخ فریدہ، قربان علی ایری، نور محمد جمالی، ہبرک کارمل جمالی، ظفر شمیم، محمد شعیب خان، احمد عدنان طارق اور ڈاکٹر عمران مشتاق نے اپنے خون سے پروان چڑھایا ہے۔

میں امن پسند آدمی ہوں۔ لڑائی جھگڑے کو بالکل پسند نہیں کرتا مگر کوئی حد سے زیادہ بات کرے تو میں اس کا جواب ایسا دیتا ہوں کہ وہ تا عمر یاد رکھے۔ میرے اور میرے والد کے اصول ایک ہی ہیں کہ کوئی بات کرو صبر تحمل سے کرو اور اپنا اخلاق درست رکھو فضول اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرو۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ فضول باتیں کرتا ہے تو ہم اسے اپنے حلقہ عنایت و رشتہ سے خارج کر دیتے ہیں اور اس ملنا ترک کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔

زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے۔ نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ لوگوں سے میری گزارش ہے کہ کسی کے لیے آسانیاں پیدا کرنا ان کی فطرت نہیں ہے تو کسی کے لیے گڑھے بھی نہ کھودیں کہ اوپر والی ذات کہیں تمہیں ہی ان گڑھوں میں نہ دھکیل دے، کیوں کہ ابھی بھی وقت ہے سنبھلنے کا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

احمد عدنان طارق

وہ آیا اور چھا گیا کی مثال احمد عدنان طارق پر صادق آتی ہے۔ بہت چھوٹے بچوں کے بڑے ادیب، جو منفرد رنگ، ڈھنگ سے کہانی کہنے کے فن سے بخوبی آشنا ہیں۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی نرالی تحریروں سے اپنی خداداد صلاحیتوں کا ادب پر خوب سکہ جمایا۔ چھوٹے بچوں کے لیے بیڈ ٹائم اسٹوریز اور فنتاسی لکھنے والے قلم کار جن کی کہانیاں بچوں کو ایک اور دنیا میں لے جاتی ہیں۔

ادب اطفال میں تیزی سے اپنی شناخت بنانے والے کی کہیں ہنساتی اور کہیں رلاتی آپ بیتی

itsurdu.blogspot.com

میری آپ بیتی کا محور دو کمروں کا ایک گھر ہے۔ اس گھر کی نچلی منزل میں چاچا صدیق رہتا تھا اور اوپر والی منزل میں...... میں اپنی پیاری امی اور پانچ چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک کمرے میں میری ماں کا پلنگ بچھا ہوا تھا اور چھوٹی بہنوں کے لیے چارپائیاں، جہاں سے جب کسی بہن کا دل کرتا، وہ اپنا بستر چھوڑتی اور امی کے پلنگ پر ان کے ساتھ لیٹ جاتی۔ امی کے ساتھ لیٹنے کی باری سب بہنوں کی آتی رہتی تھی۔ آج میں حیران ہوں کہ امی اتنی چھوٹی بچیوں کے ساتھ گزارا کیسے کر لیتی تھیں۔

آج میرے ماشاءاللہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ان کے شور وغل سے کبھی میں بھی بور ہو جاتا ہوں تو امی ہم چھ کو صرف ماں ہونے کے ناطے ہی برداشت کرتی ہوں گی۔ اس کمرے میں ایک بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن بھی تھا، جس کے متعلق آئندہ بات ہوگی۔ اس گھر کا دوسرا کمرا میرا تھا۔ اس میں ایک پلنگ تھا، جس کے سرہانے اور پائنتی کے ساتھ بائیں ہاتھ دو الماریاں تھیں، جن پر میں نے تالے لگائے ہوتے تھے، کیوں کہ میری ساری قیمتی چیزیں ان الماریوں میں پڑی ہوتی تھیں اور ان قیمتی چیزوں کو سب سے بڑا خطرہ صرف میری ننھی بہنوں سے ہی تھا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

دونوں کمرے آمنے سامنے تھے اور درمیان میں ایک برآمدہ تھا اور پر ایک کوٹھا تھا جس میں ایک اوپن ایئر باتھ روم تھا جو سب کے لیے تھا۔ دوسرے کو ٹھے پر جانے کے لیے سیڑھیاں نہیں تھیں، لیکن وہاں مجھے بار بار چڑھنا پڑتا تھا، کیوں کہ وہاں ٹیلی ویژن کا انتہائی بلند والا انٹینا لگا ہوا تھا، جب کہ تمام گھر کے برتن اس انٹینا پر ٹنگے ہوئے تھے۔ برآمدے میں ایک نلکا تھا، ایک نوکرا تھا، جس کے نیچے سالن وغیرہ پکا کر رکھ دیا جاتا تھا اور اس پر اینٹیں رکھی ہوتی تھیں۔ ایک جانب پانی کے گھڑے رکھنے کی جگہ تھی اور ایک جگہ روٹی پکانے کے لیے اماں مہتاب بی بی نے مختص کر رکھی تھی، جہاں وہ ایک مٹی کے چولہے کی مالک تھی اور پھونکیں مار مار کر آگ جلاتی اور سب کے لیے روٹی پکاتی۔

یہ میرا گھر، جو آج مجھے یاد آتا ہے تو میرا دل کرتا ہے کہ کوئی میرا آج والا گھر، جس میں دنیا کی سبھی سہولتیں ہیں، دو دو ایئر کنڈیشنر لگے ہوئے ہیں، ہر کمرے میں LCD اور فریج ہے..... وہ مجھ سے لے لے اور مجھے وہی چھوٹا سا گھر لوٹا دے، جہاں میں اپنی بہنوں اور ماں کے ساتھ زندگی کی تلخیوں سے دور خوش و خرم بچپن گزارا کرتا تھا۔ یہ میرا گھر فیصل آباد سے اوکاڑہ جاتے ہوئے درمیان میں آنے والے ایک حصہ تاندلیانوالہ میں تھا، جو فیصل آباد سے پچاس کلومیٹر دور ہے۔ گھر 1969ء سے لے کر 1978ء تک رہا۔

میری تاریخ پیدائش 14 جولائی 1963ء ہے۔ میں فیصل آباد میں پیدا ہوا، جو میرے ننھیال اور ددھیال دونوں کا آبائی شہر ہے۔ میرے والد محترم کا نام شیخ محمد طارق تھا، جو اس دنیا میں اب نہیں ہیں۔ وہ ایکسائز آفیسر تھے اور 1994ء میں جھنگ ضلع سے بطور ETO ریٹائر ہوئے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور دوسرے بیٹے کی خواہش میں میری 5 چھوٹی بہنیں تھیں، بلکہ ماشاءاللہ ہیں۔ میرے والد ایم اے انگلش تھے۔ وہ اپنی سروس کی وجہ سے کبھی کسی شہر میں اور کبھی کسی شہر میں تعینات ہوتے رہے اور ہم لوگ اپنی ماں کے پاس رہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہماری ماں سے ہماری رفاقت زیادہ لمبی نہیں ہوگی۔ شاید اسی لیے خدا نے ہمیں بچپن ان کے ساتھ گزارنے کا موقع دیا۔

میری والدہ جاٹ فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا نام مسز شمیم ملک تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ

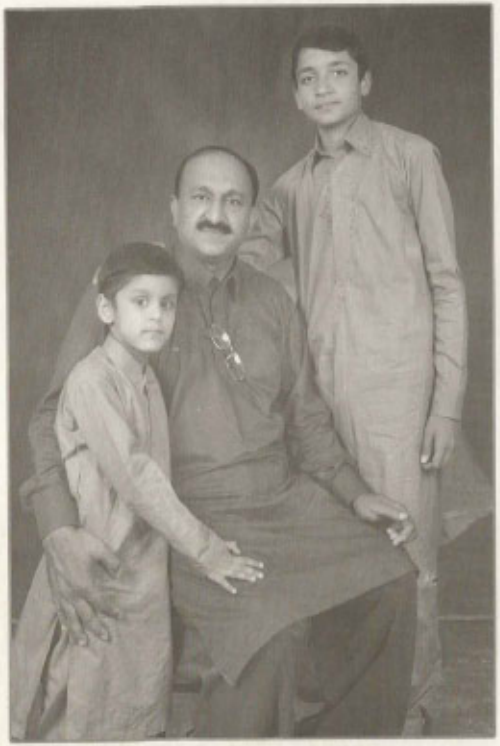

احمد عدنان طارق

اپنے صاحب زادوں کے ساتھ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

معاذ اور تزئین

دریائے میکونگ پر

احمد عدنان طارق کی بیٹی تزئین اور عمر طارق

احمد عدنان طارق والد صاحب کے ہمراہ ایک سالگرہ کی تقریب میں

احمد عدنان طارق کمبوڈیا میں انڈین آرمی کے ساتھ

احمد عدنان طارق کا ایک انداز

کرکٹ سے بہت لگاؤ ہے

رفعت مہدی سفیر زمبابوے سے
میڈل لگواتے ہوئے

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تھیں۔ وہ ڈبل ایم اے تھیں۔ ان کا ایک ایم اے میرے اور میرے والد کی طرح انگریزی میں تھا۔ وہ غالباً بہت ہی چھوٹی عمر میں ڈائریکٹ ہیڈ مسٹریس ہی بھرتی ہوئی تھیں۔ وہ مختلف اسکولوں میں ہیڈ مسٹریس رہیں۔ پیر محل اور جڑانوالہ وہ گرلز ہائی اسکول ایسے ہیں، جن کی دھندلی سی یاد میرے ذہن میں ہے۔

1969ء میں میں صرف چھ سال کا تھا، جب امی کی تعیناتی تاندلیانوالہ میں ہوئی۔ اس وقت مجھ سے چھوٹی دو بہنیں امبر اور عمارہ تھیں۔ باقی بہنیں تاندلیانوالہ میں ہی پیدا ہوئیں۔ میں فیصل آباد میں اس وقت کامل فاؤنڈیشن میں پڑھتا تھا۔ اس وقت اس اسکول کا نام بچوں کا مدرسہ تھا۔ چوں کہ امی نے نوکری کی وجہ سے اب تاندلیانوالہ میں رہنا تھا، اس لیے مجھے بھی فیصل آباد کے سب سے اچھے انگریزی میڈیم سکول سے اُٹھا کر تاندلیانوالہ کے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ میں چھ سال کا تھا، لیکن تب بھی دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ تاندلیانوالہ بوائز پرائمری سکول میں میں جب نیکر شرٹ پہن کر پہلے دن اسکول گیا تو میرے ہم جماعت مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے، جیسے میں مریخ سے آیا ہوں۔ تاندلیانوالہ جو آج فیصل آباد کی تحصیل ہے، تب صرف ایک چھوٹا سے قصبہ تھا، جو گھی کی خرید و فروخت کے لیے مانا جاتا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب امی نے پہلے دن گرلز ہائی سکول کا چارج لیا تو سارے اسکول میں [illegible]بازاری کا سماں تھا۔ اسکول کی دو سینئر استانیاں جن کی آپس میں سخت دشمنی تھی۔ ایک کا نام آپا پھولاں اور دوسرے کا نام ثریا بخاری تھا کہ درمیان اس وقت گھمسان کی جنگ جاری تھی، جب میں امی کا ہاتھ تھامے امی کے اسکول میں داخل ہوا۔ آنٹی ثریا بخاری جن سے میری مرحومہ امی کی بعد میں گہری دوستی ہو گئی، بجلی کے کھمبے پر چڑھی ہوئی تھیں اور آپا پھولاں گروپ کی لڑکیاں انھیں [illegible] سے شیطان کی طرح کنکر مار رہی تھیں۔ امی کے اسکول میں قدم رکھنے کے بعد یہ طوفان [illegible] لیکن میرے معصوم ذہن میں وہ منظر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ میری نظر میں آپا [illegible]لاں ہمیشہ ظالم اور آنٹی ثریا بخاری ہمیشہ مظلوم رہیں، حالاں کہ ندیم جو آپا جی کا بیٹا تھا۔ بعد میں [illegible]ک تک میرا کلاس فیلو بھی رہا۔

میری والدہ نے ان حالات میں سکول کا چارج لیا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ تاندلیانوالہ میں

احمد عدنان طارق پیراشوٹنگ کرتے ہوئے

احمد عدنان طارق ہائی اسپیڈ بوٹ کا سفر کرتے ہوئے

ہاتھی کو بھی قابو کر لیا

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اگلے نو سالوں میں اتنی ہر دل عزیز ٹیچر تھیں کہ لوگ انہیں میڈم کے نام سے پکارتے۔ وہ برقع نہیں اوڑھتی تھیں۔ موٹی تھیں اور بچپن میں ایک چوٹ کی وجہ سے تھوڑا لنگڑا کر چلتی تھیں، لیکن دوپٹہ اوڑھتی تھیں اور پورے بازو والا سفید اوور کوٹ پہنتی تھیں۔

1978ء میں جب میری تاریخ پیدائش 14 جولائی آئی تو انہوں نے شاید اللہ سے کوئی وعدہ کیا تھا۔ معمولی بیماری کے بعد صرف 36 سال کی عمر میں چل بسیں۔ میں اس وقت 15 سال کا تھا اور میٹرک کا رزلٹ اُن کے مرنے کے صرف دو دن بعد مجھے ملا۔ میرے تین چار ہم جماعتوں کی شروع سے میرے ساتھ کلاس میں مقابلہ بازی تھی۔ یہ لوگ تھے عبدالغنی، نثار، سعید، ریاض اور اکبر۔ میں کلاس میں ان دیگر دوستوں کے برابر کا ذہین تھا۔ اکبر اور میرا مسئلہ یہ تھا کہ ہم کبھی سکون سے نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ پڑھتے تھوڑا، لیکن نمبر سب سے زیادہ آتے۔ ہمیشہ اکبر مجھ سے ایک دو نمبر زیادہ ہوتا۔ میری والدہ کی ہمیشہ خواہش رہتی کہ کبھی میرے نمبر اکبر سے زیادہ آئیں۔ میٹرک کے پرچوں میں بھی میری ماں کی یہی خواہش تھی۔

آپ کو میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ مجھ کیسے کیسے بہانے سے پڑھایا کرتی تھیں۔ ان دنوں ہاکی کا ورلڈ کپ ہو رہا تھا۔ پاکستان کا فائنل ہالینڈ سے ہونا تھا اور PTV جو اس وقت واحد چینل تھا، جو ہم دیکھ سکتے تھے۔ یہ میچ رات ایک بجے براہ راست آ رہا تھا۔ امی کو ہاکی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''کاکے..... (وہ مجھے پیار سے کاکا کہتی تھیں) تم نے میچ دیکھنا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جی امی۔''

وہ بولیں۔ ''میچ تو میں نے بھی دیکھنا ہے، لیکن اگر ہم دونوں ماں بیٹا سو گئے تو ہمیں کون جگائے گا؟''

میں نے پوچھا۔ ''امی..... پھر کیا کریں؟''

تب انھوں نے مجھے اس وقت دس روپے دیئے اور کہا۔ ''جا کر ڈرائی فروٹ لے آ۔''

اس وقت 10 روپے کا ڈرائی فروٹ منگوانا شاید امیر لوگوں کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ میں بازار سے لے کر آیا تو امی میرے بستر پر رضائی لیے بیٹھی تھیں۔

انہوں نے کہا۔ ''چلو بیٹا میں تمہیں انگیٹھی کی تیاری کرواتی ہوں، اس سے دل بھی لگا رہے گا اور پڑھائی بھی ہو جائے گی اور اس طرح ہم میچ بھی دیکھ لیں گے۔''

لہٰذا بہانے بہانے سے انہوں نے مجھے ساری رات پڑھا لیا۔ وہ ہر ہفتے مجھے کہتیں کہ عدنان اپنے چار دوستوں کو کھانے پر بلا لاؤ۔ میں حیران ہوتا کہ اس کی کیا ضرورت ہے، لیکن اب پتا چلتا ہے کہ وہ ہر ہفتے دیکھتیں کہ میرے دوست تبدیل تو نہیں ہو رہے اور اگر ہو رہے ہیں تو کس قسم کا دوست نیا آ رہا ہے۔

تاندلیانوالہ میں ایک ہی سینما گھر تھا، جس کی دیواریں تو پکی تھیں، مگر چھت پر ترپال پڑی ہوتی تھی۔ یہ سینما ہی وہ واحد تفریح تھی، جو لوگوں کو میسر تھی۔ میرے والد اس سینما گھر کو ہر ہفتے چیک کرنے آتے۔ اسی بہانے وہ ہفتہ کی رات اور اتوار کا دن ہمارے ساتھ گزارتے اور پھر واپس اپنی نوکری پر چلے جاتے۔ ہمیں والد سے بہت ڈر لگتا تھا۔ دیر سے ملنے کی وجہ سے ہمارے اور ان کے درمیان ایک حجاب سا تھا۔ یہ حجاب اس وقت بھی رہا، جب وہ ضلع کے ایکسائز آفیسر تھے اور میں اسی ضلع جھنگ کے ایک تھانے کا SHO۔ اس سینما گھر کے مالک نواز خان تھے، جو میرے والد کے دوست تھے۔ ان کی دو بیٹیاں تاندلیانوالہ کے اکلوتے گرلز اسکول میں امی کے پاس زیر تعلیم تھیں اور خان صاحب کی اہلیہ امی کی بہت قریبی سہیلی تھی۔ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ ان دنوں علاقہ کی ویسے بھی بہت عزت تھی۔ امی کے حسن سلوک اور بہادرانہ دو ٹوک فیصلوں سے سارا تاندلیانوالہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اسکول میں استانیوں کی لڑائیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اسکول امن کا گہوارہ بن گیا۔ اس وقت ہماری بھی واحد تفریح سینما تھی۔

امی کا قول تھا کہ بچوں نے جو چھپ کر کرنا ہے وہ سامنے ہوتا کہ تجسس بھی کسی ڈھنگ سے ہو سکے۔ میری امی کی ہی تربیت تھی شاید کہ آج یہی رنگ کہ نصیحت ڈھنگ سے کرتی ہے۔ میری کہانیوں میں یہ رنگ اُتم موجود ہے۔ تاندلیانوالہ کا واحد کوچوان جوشہر میں رہتا تھا۔ اس کا نام نوری تانگے والا تھا۔ وہ ہر ہفتے اپنا تانگہ لے کر آتا۔ اس پر امی اپنی آل اولاد کے علاوہ محلہ سے اپنی سہیلیوں کو بھی ساتھ لیتیں۔ سینما میں واحد بکس (علیحدہ کمرا) ہمارا انتظار کر رہا ہوتا۔ ہمارے آنے سے قبل اس کمرے سے صوفے اٹھا لیے جاتے اور چارپائیاں ڈال دی جاتیں، جس کا دل

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

جہاں کرتا، وہیں بیٹھ جاتا۔ منگل سے جمعہ تک ایک نکٹ میں دو شو، یعنی دو فلمیں لگی ہوتیں۔ وہ میں اور امی بڑے شوق سے دیکھتے۔ میں سارا ہفتہ اس دن کا انتظار کرتا۔ صبح اسکول جا کر فلم کے متعلق شیخیاں مارتا، کیوں کہ میرے کلاس فیلوز میں سے کسی کے پاس سینما جا کر فلم دیکھنے کے ذرائع نہیں تھے۔ بچیوں میں سے جو سو جاتا اس کے منہ میں فیڈر ڈال کر اسے وہیں سلا لیا جاتا۔ رات جب واپسی ہوتی تو میں اور ماں دونوں گھر پیدل جاتے۔ ماحول ایسا تھا کہ چوری، ڈکیتی کا نام تک نہیں تھا اور نہ ہی کبھی ان دنوں میں بجلی بند ہوتی تھی۔ وہ فلمیں میں نے آج بھی DVD's میں محفوظ کر کے رکھی ہوئی ہیں۔ جب کبھی انھیں دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میری ماں میرے پہلو میں ہیں۔ یہ DVD's میرے پاس اسی طرح محفوظ ہیں، جس طرح میرے بچپن میں میری الماریوں میں محفوظ میرا قیمتی خزانہ۔ وہ قیمتی خزانہ کیا تھا..... وہ تھے میرے بچوں کے ناول۔ فیروز سنز کے ناول، فتح غلام علی اینڈ سنز کے ناول، سنگ میل پبلی کیشنز کے ناول، بچوں کی دنیا بک ڈپو کے ناول۔ وہ قیمتی خزانہ آج دوبارہ میرے پاس محفوظ ہے۔ مجھے ان کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے۔ جیسے مجھے کوئی جام جمشید ہیں اور میں اپنے بچپن کو دیکھ رہا ہوں۔

میں نے بتایا کہ جب امی فوت ہوئیں تو ان کے منہ سے میرے لیے جو آخری بات نکلی وہ یہ تھی کہ کاکے تمہارا میٹرک کا رزلٹ آ گیا ہے۔ وہ آخری لبوں پر تھیں۔ ان کے چہرے پر افسردگی تھی۔ یہ الفاظ جو انہوں نے مجھ سے کہے..... یہ وہ آخری الفاظ تھے، جو وہ ادا کر سکیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ امی ابھی نہیں۔ تو کہنے لگیں کہیں اس وجہ سے جھوٹ تو نہیں بول رہے کہ تمہارے اکبر سے نمبر کم ہیں۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھیں۔ انھیں اسپتال کے اس بیڈ پر لیٹے ہوئے اندازہ تھا کہ وہ اس عدنان سے بات کر رہی ہیں، جو زندگی میں محنت کر کے اپنے باپ کا سہارا بنے گا۔ بہنوں کی شادی کرے گا۔ پھر وہ چلی گئیں..... ہمیشہ کے لیے۔

میری سال گرہ بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتی تھی۔ سارا خاندان جمع ہوا کرتا تھا۔ ہم ان دنوں فیصل آباد شنکی محلہ میں سال گرہ کے لیے ہی آئے تھے۔ 14 جولائی کو میری سالگرہ تھی اور 18 جولائی کو میرا رزلٹ۔ میں نے اپنا میٹرک کا رزلٹ ان کی رسم قل پر سنا۔ میرے نمبر تقریباً 700 تھے کل نمبر 850 میں سے۔ یہ کوئی نوے فیصد نمبر تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ

زندگی میں پہلی دفعہ میرے 2 نمبر اکبر سے زیادہ تھے۔ پورے تاندلیانوالہ میں صرف دو ٹیلی ویژن تھے۔ میں اپنے والدین کا اتنا لاڈلا تھا کہ جب ہم فیصل آباد نانی کے پاس آتے تو پڑوسیوں کے ہاں ٹی وی دیکھنے جاتے، جس گھر میں ان دنوں ٹی وی ہوتا وہ بہت امیر گھر سمجھا جاتا تھا۔

ایک دفعہ میری پسندیدہ انگریزی فلم Man From Uncle چل رہی تھی کہ پڑوسیوں کے مہمان آ گئے۔ میں چھ سال کا تھا انھوں نے مجھے کرسی سے نیچے بٹھا دیا۔ میں چپ کر کے اُٹھا اور گھر واپس آ گیا۔ گھر آ کر میں نے ٹی وی لینے کی ضد میں شور مچا دیا۔ اسی رات میری خواہش کی تکمیل کر دی گئی۔ ہم نے RGA کمپنی کا ٹیلی ویژن 1969ء میں خریدا۔ اس کے لیے 20 فٹ لمبا سلور ایلومینیم کا انٹینا خریدا گیا۔ آج کل کے بچوں کو شاید سمجھ نہ آئے، کیوں کہ وہ تو ریموٹ سے بار بار چینل تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس وقت صرف PTV ہوتا تھا اور اس کی تصویر صاف دیکھنے کے لیے لاکھ جتن کرنے پڑتے تھے۔

جب ہمارا ٹی وی تاندلیانوالہ پہنچا تو ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہاں بوسٹر نہ ہونے کی وجہ سے نشریات صاف نہیں آتی تھیں، بلکہ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بڑی بوڑھی عورتوں کے مطابق یہ شیطانی چرخا تھا اور میڈم کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ شیخ مظفر جو تاندلیانوالہ میں مارکیٹ کمیٹی کے چیئرمین تھے کے گھر دوسرا ٹی وی تھا۔ تاندلیانوالہ کے آدھے لوگ ان کے گھر اور آدھے ہمارے گھر میں ہوتے۔ لوگ سرِ شام ہمارے گھر آتے اور رات گیارہ بجے آخری پروگرام نور بصیرت دیکھ کر جاتے۔ اس پورے عرصہ میں میری پریڈ ہوتی رہتی۔ میں کئی دیواریں پھلانگ کر کوٹھے پر جاتا اور انٹینا کا رخ اپنی ماں کی ہدایت پر کئی بار تبدیل کرتا، تاکہ تصویر صحیح نظر آئے اور کبھی نہیں تھکتا۔ میں معلومات عامہ میں 14 سال کی عمر میں پنڈی ڈویژن چیمپئن تھا۔ میں بیڈمنٹن میں 14 سال سے کم عمر کھلاڑیوں میں تاندلیانوالہ جیسی چھوٹی سے جگہ سے پنجاب سلیکٹ تھا۔ میں سنگل چیمپئن تھا۔ اور ڈبلز میں سعید میرا پارٹنر تھا۔ کیرم بورڈ میں میں بڑے بڑوں کو آسانی سے شکست دے سکتا تھا۔ یہ تھی میری اُٹھان۔

میں ایک پڑھے لکھے متمول خاندان کا اکلوتا ہونہار بیٹا تھا۔ ٹی وی پر ان دنوں طارق عزیز کا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

پروگرام نیلام گھر آتا تھا، جو آج بھی آتا ہے۔ ایک دفعہ میرے والد نے مجھے اس پروگرام نیلام کے سوالات حاضرین سے پہلے بوجھتے سنا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ تم جتنے سوال بوجھو گے تمھیں ایک سوال کا ایک روپیہ ملے گا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مجھے گھر سے صرف چار آنے جیب خرچ ملا کرتا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ 57 روپے جیتے۔ پھر ہر سوال کے آٹھ آنے۔ پھر چار آنے اور پھر دس پیسے، لیکن پھر بھی میں ہفتے میں والد محترم سے سات آٹھ روپے بنا ہی لیا کرتا تھا۔ نقد پیسے کلاس میں صرف میرے پاس ہی ہوتے تھے۔ آٹھویں نویں جماعت میں میری ماں مجھے سارے مہینے کے روپے دینے لگیں کہ گھر چلاؤ۔ شاید انھیں علم تھا کہ انہوں نے چلے جانا ہے اور بہنوں کو میں نے ہی ماں کی طرح پالنا ہے۔

یہ معلومات عامہ کا خزانہ کہاں سے آیا؟ اس کا ماخذ میری ماں کے سکول کی لائبریری تھی۔ میں نے جب اردو کے ہجے کرنے شروع کر لیے تو میں اخبار پڑھنے لگا۔ انگریزی اسکول سے ابتدا کرنے کی وجہ سے انگریزی مجھے پہلے ہی اپنے کلاس فیلوز سے اچھی آتی تھی۔ امی کے سکول سے ڈاک روز ہمارے گھر آتی تھی۔ نئی کتابیں ہمارے گھر آتی تھیں، جن میں بچوں کی کتابیں بھی ہوتیں تھیں۔ میں نے کہانیاں پڑھنی شروع کیں تو ان میں ہی کھو کر رہ گیا۔ ایک دو فیروز سنز کی رنگین منظوم کتابیں، ننھا سوداگر، بونوں کو خزانہ ملا، جس میں الفاظ کم تھے اور رنگین تصویریں زیادہ ...... میں نے پڑھیں اور پھر بہتر سے بہتر کی تلاش میں رواں ہو گیا۔

کیا آپ سوچ سکتے ہیں ...... میں نے نسیم حجازی کو گیارہ سال کی عمر میں اور ابن صفی کو تیرہ سال کی عمر میں پڑھا۔ میں نے فیروز سنز کا ناول دلاور پڑھا۔ اس میں ایک بچہ اپنی پنسلوں اور قیمتی چیزوں کو ایک درخت کے نیچے چھپاتا ہے۔ میں نے امی کے وسیع و عریض اسکول کے گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے تک کئی شاخوں میں اپنی تتلیوں، رنگوں اور پنسلوں والے ڈبے کو کئی مہینے تک چھپائے رکھا۔ وہ درخت میرا قلعہ تھا۔ پھر میرے گھر میں تعلیم و تربیت کی آمد ہوئی اور اسی طرح بچوں کے دوسرے رسائل بچوں کی دنیا، بچوں کا باغ اور جگنو وغیرہ۔ میں اپنے جیب خرچ سے انھیں خریدنے لگا تھا۔

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں نانی کے گھر جاتا تو میری نانی مجھے ناشتے کے لیے ایک روپیہ

دیتیں، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ تاندلیانوالہ میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ میں ناشتہ نہ کرتا۔ پھر اپنا جیب خرچ لیتا۔ اپنے ماموں اور خالاؤں سے رقم اینٹھتا اور اتنی دیر چین سے نہ بیٹھتا، جب کہ روزانہ ایک ناول خرید نہ لیتا۔ جب میں چھٹیوں کے بعد تاندلیانوالہ جاتا تو چھٹیوں کے دنوں جتنے ناول جمع کر چکا ہوتا۔ میں نے ان ناولوں کو خود جلد کرنا سیکھا۔ میری شروع کی گورنس چھیماں اس میں میرا ساتھ دیتی۔ پھر میں نے ایک لائبریری کی طرح ان ناولوں کی فہرست بنائی۔ ناولوں کے پیچھے ان کے نام اور نمبر لکھے۔ ناولوں کے علاوہ ان دنوں میرے پاس بے شمار ڈاک کے ٹکٹ تھے۔ سو سے زیادہ ملکوں کے سکے ہوا کرتے تھے۔ میں بہت اچھا پورٹریٹ بناتا تھا۔ میں نے ان دنوں دنیا کے سارے ملکوں کے سربراہوں کے اسکیچز بنائے۔ خصوصاً 1974ء میں جب پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی اور تمام اسلامی ممالک کے صدور پاکستان تشریف لائے۔ میں نے لائبریری کے ناولوں کا کرایہ لینا شروع کر دیا۔ یہ سارے مشاغل صرف گیارہ سال کی عمر میں تھے۔ میرے ایسے گاہک جو مجھے کرایہ دیتے تھے، وہ صرف میری بہنیں تھیں، جن سے میں ان کا سارا جیب خرچ اینٹھ لیا کرتا تھا۔

ان دنوں کی بات ہے، جب عمرو عیار سیریز کے، جو فیروز سنز نے چھاپی ...... سات حصے چھپے تھے اور آخری تین حصوں کا انتظار تھا۔ میں نے پیسے جمع کر کے فیروز سنز کو بذریعہ پوسٹل آرڈر بھجوائے تو ایک دن فیروز سنز سے میرا کتابوں کا پارسل مجھے ملا۔ یقین کریں کہ میں نے ایک مہینہ یہ پارسل ہی نہیں کھولا، حالاں کہ میں اس کے اندر بند کتابیں پڑھنا چاہتا تھا۔ پھر جب میں نے یہ کتابیں پڑھ لیں تو میرا واحد مقصد اب انھیں چھوٹی بہن امبر سے بچانا تھا وہ کرایہ دیے بغیر ہی یہ کتابیں پڑھنا چاہتی تھی۔

ایک رات میری ماں نے مجھے جگایا اور مجھے کوٹھے پر دکھانے لگیں۔ چاندنی رات تھی اور کوٹھے پر کوئی چہل قدمی کر رہا تھا۔ ماں تنہا بچوں کے ساتھ رہتی تھیں، لیکن بہادر تھیں۔ انہوں نے ہاتھ میں چھڑی پکڑی، جس سے کبھی کبھار ہماری پٹائی ہوتی تھی۔ مجھے ساتھ لیا اور کوٹھے پر چڑھیں تاکہ چور پکڑ لیں۔ جب دیکھا تو چالاک امبر چاندنی رات میں میرا ناول پڑھ رہی تھی۔ اندازہ کریں شوق کا عالم کہ ایک چھوٹی سی لڑکی جس کی عمر اس وقت صرف دس سال تھی، اکیلی کوٹھے پر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

صرف ناول پڑھ رہی تھی وہ بھی اتنی رات میں۔ تو بچوں کے ناولوں کا یہ شوق تھا، جو آج بھی ہے مگر اب ان کی حالت دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔

تعلیم و تربیت میں ننھے ادیب میں لکھنا شروع کیا۔ میری پہلی کہانی تعلیم و تربیت میں صرف بارہ سال کی عمر میں چھپی۔ اس سے پہلے بھی میں کہانیوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے تبصرے لکھ کر بھیجتا جو چھپ جاتے۔ تعلیم و تربیت میں چھپنا مشکل تھا، لیکن بچوں کی دنیا میں اس سے بھی پہلے چھپ رہا تھا، یعنی کوئی گیارہ سال کی عمر سے۔ 1976ء سے 1978ء تک میں نے تعلیم و تربیت میں مستقل لکھا یعنی 12 سال کی عمر سے 14 سال کی عمر تک۔ میرا ایک مضمون "کتے" نومبر 1978ء کے تعلیم و تربیت میں چھپا۔ یہ مضمون پطرس بخاری کے مشہور مضمون "کتے" سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ یہ میں نے اگرچہ لکھا اپنی ماں کی زندگی میں، لیکن چھپا ان کے فوت ہونے کے بعد۔ میں نے جب یہ مضمون لکھا تو میرے پاس لکھنے کے لیے صاف کاغذ نہیں تھے، بلکہ کاپیوں کے صفحوں کو پھاڑ کر لکھا کرتے تھے۔ تعلیم و تربیت کو مضمون بھیجنے کے لیے پیسے اپنی جیب خرچ سے نکالنے پڑتے تھے۔ میری ماں نے یہ مضمون پڑھا اور پڑھ کر بہت خوش ہوئیں اور ان کی زندگی میں ہی اس مضمون کے بارے میں فیروز سنز کی طرف سے ایک خط آیا، جو سعید لخت صاحب نے میری ماں کو لکھا، جس میں تحریر تھا کہ اتنا چھوٹا بچہ اور اتنی سخت تحریر۔ اس بچے کو تنقید کی بجائے مزاح کی طرف راغب کیا جانا چاہیے۔ مجھے پتا ہے کہ یہ خط میری ماں نے اپنی ماتحت استانیوں اور سہیلیوں کو کتنی دفعہ دکھایا ہوگا، کیوں کہ مجھے تو شاید ابھی اس تحریر کے مفہوم کا پورا پتا بھی نہیں لگ سکا تھا۔

تاندلیانوالہ میں ہر کوئی سوچتا تھا کہ میں بڑا ہو کر بہت بڑا آفیسر بنوں گا اور یہ ہو جاتا اگر مجھے کم از کم دو سال اور مل جاتے۔ میں اپنے ہم عصر کلاس فیلوز کے ساتھ F.Sc فیصل آباد کی بجائے سمندری میں کر لیتا، لیکن مجھے اس کی مہلت نہیں ملی۔ میٹرک کے رزلٹ اور میری سالگرہ کی وجہ سے میری ماں نے چھٹی لی اور ہم فیصل آباد آ گئے۔ جہاں میری نانی کا بہت بڑا گھر تھا۔ والد صاحب ان دنوں فیصل آباد میں ہی تعینات تھے۔ رات میری ماں اس کمرے میں سوئیں، جس میں صفائی کے لیے DDT پاؤڈر چھڑکا ہوا تھا۔ ان دنوں یہ گھروں میں عام معمول تھا، لیکن

پتا نہیں کیسے ماں کی طبیعت خراب ہوئی۔ وہ ساری رات اسی پاؤڈر زدہ کمرے میں سانس لیتی رہیں۔ پھر دو تین دن اُن کی طبیعت خراب رہی انھیں اسپتال داخل کروانا پڑا، جہاں میری خالہ زاد بہن ڈاکٹر ناہید تھیں۔ معلوم ہوا کہ ماں کو یورک ایسڈ سے بلڈ یوریا ہو گیا ہے۔ وہ صرف 36 سال کی عمر میں بچوں کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ میری سب سے چھوٹی بہن سمادیہ ابھی شیر خوار ہی تھی۔ وہ گئیں تو ساتھ ہی میرا بچپن بھی چلا گیا۔

میں 14 سال کا بچہ تھا۔ 15 سال کی عمر میں بڑا ہو گیا۔ ان کا ساتھ چھوٹا تو تاندلیانوالہ بھی چھوٹ گیا، کیوں کہ ہمارا کوئی ذاتی گھر تو وہاں تھا نہیں...... ایک چھوٹا سا آشیانہ تھا، جو ماں کی نوکری کی وجہ سے تھا۔ ہماری روحیں اسی گھر میں رہ گئیں۔ ہمارے جسم فیصل آباد آ گئے۔ میں آخری بار تاندلیانوالہ اپنا سامان لینے کے لیے گیا۔ بعد میں جب پولیس آفیسر بنا تو کوئی آٹھ دفعہ تاندلیانوالہ اور اس سے ملحقہ تھانوں گڑھ، ماہلک، CIA اور تاندلیانوالہ سٹی SHO رہا، لیکن آج بھی اتنے سال گزرنے کے بعد لوگ میری ماں کی وجہ سے میری عزت زیادہ کرتے ہیں۔

ہم بچے اپنے والد کے پاس آ گئے۔ فیصل آباد میں ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ گوبند پورہ پرانا محلہ تھا اور گھر بھی کیا تھا ایک حویلی تھی، جہاں میری پھوپھیاں رہتی تھیں، میرے چچا رہتے تھے...... تاندلیانوالہ میں میں ہی تھا۔ یہاں میرے کزن ساتھ تھے۔ میں نے گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں داخلہ لے لیا۔ تاندلیانوالہ ہائی اسکول میں ہر کوئی ہمیں جانتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں استاد ایک دفعہ کلاس سے گیا تو دوبارہ کالج میں اسے ڈھونڈا نہیں جا سکتا تھا۔ بہرکیف میرا اب بھی کلاس میں رول نمبر ایک ہی تھا۔ بچوں کے ناول چھوٹ گئے۔ کالج میں میں بچپن کا ایک شوق باقی رہا...... وہ تھا ادب کا مطالعہ۔ میں نے کتابیں پڑھنا کبھی نہیں چھوڑیں۔ والد صاحب صبح دفتر جاتے۔ ایک آدھ گھنٹہ کے لیے دوپہر میں گھر واپس آتے۔ شام کو انھوں نے فیصل آباد کے تمام سینما گھروں کو دوبارہ چیک کرنے جانا ہوتا تھا۔ مجھ پر توجہ خاصی کم ہو گئی تھی۔ اب فیصل آباد تھا اور میں ایک بڑے افسر کا اکلوتا بیٹا۔ چھوٹے ہوتے ہوئے بھی میں بابا جان کے پاس سرگودھا، وہاڑی [illegible] میں رہا۔ فلموں کا میں شروع سے شوقین تھا۔ ان دنوں بھی بابا جان مجھے سینما چیک کرنے ساتھ لے جاتے اور مجھے کسی ایک سینما میں بٹھا دیتے اور خود دوسرے سینما چیک کرنے چلے جاتے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

۔ان کے جانے کے بعد سینما مالکان میری خاطر تواضع میں جت جاتے۔ گوشت سے کھانا ملتا۔ پیپسی وغیرہ جتنی مرضی پیتا۔ غرض عیش ہی عیش ہوتی۔ اس اثناء میں میرے کلاس فیلوز سے لے کر کئی لڑکے میرے دوست بننے کے خواہاں تھے۔ میں شدت سے تنہائی محسوس کرتا تھا۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ میں فیصل آباد میں بھی گاؤں کے لڑکے دوستی کے لیے تلاش کرتا، جیسا کہ تاندلیانوالہ میں میرے دوست کلاس فیلوز تھے۔ کئی الٹی سیدھی دوستیاں ہوئیں۔ دوست بنتے رہے بگڑتے رہے۔ میں بابا جان کو دیکھتا، وہ بھی، مایوس اور تنہا تھے۔

آخر کار ہماری مرضی سے انہوں نے 1984ء میں دوسری شادی کی۔ 1978ء سے 1984ء تک اب میری بوڑھی نانی اماں ہی ہماری ماں تھیں۔ میری بڑی پھوپھی جان نے بھی ہمارا بہت خیال رکھا لیکن میری نانی جانتی تھیں کہ ہم کس ناز و نعم سے پلے ہیں۔ میری چھوٹی امبرامی کے مرنے تک کبھی روٹی نہیں کھاتی تھی، بلکہ دودھ اور فروٹ پر پل رہی تھی۔ امی کے مرنے کے بعد میں اپنی بہنوں کا بہت خیال کرتا تھا۔ کوئی کھانے کی چیز خریدتی تو بھی بہنوں کے ساتھ مل کر کھاتی۔ میری خالہ نعیم بھی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ تمام بہنیں ان کے اسکول میں زیر تعلیم تھیں۔ بعد میں تمام بہنیں کم از کم بی اے تک پڑھیں۔ ایک بہن عمارہ نے ایم اے بی ایڈ کیا۔ حمنہ طارق گورنمنٹ گرلز کالج کی صدر بھی رہی۔ سب کی شادیاں میری شادی سے قبل ہوئیں۔ جس میں ظاہر ہے میری کوششوں کا بہت دخل تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں شادیاں ہوئیں کہ دو بہنیں بی اے کرتے وقت اپنے بیٹوں کو گود میں اٹھا کر کالج لے کر جاتی تھیں۔

بہر کیف میری نانی ان دنوں تانگے پر مرغ پلاؤ اور شامی کباب بنوا کر ہمارے لیے لاتیں۔ میں تو سائیکل پر روز ان سے ملنے کالج سے واپسی پر چلا جاتا، لیکن بچیوں کو ملنے وہ بے چاری بوڑھی عورت اتنا تردد کرتیں۔

میں نے FSc کیا تو میرے نمبر 613/1000 آئے، جو میڈیکل کالج میں داخلے کے حساب سے تھوڑے تھے۔ میرے میٹرک کے کلاس فیلوز اکبر اور عبدالغنی میڈیکل کالجوں میں چلے گئے۔ اکبر جس سے میرے ایک دو نمبروں کا فرق ہوتا تھا اور جس کے میٹرک میں مجھ سے دو نمبر کم تھے۔ F.Sc میں اس نے مجھ سے ڈیڑھ سو نمبر زیادہ لیے۔ آج کل وہ امریکا میں ہے اور بڑی

مدت سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میرا رزلٹ میری ماں کے مرنے کی چھاپ لیے برا تھا۔ اگرچہ فرسٹ ڈویژن تھی، لیکن فرق پڑ گیا تھا۔ میرے تمام ماموں لندن سیٹ تھے۔ ان دنوں وہ میرے بابا جان کے پاس آئے اور انہوں نے آ کر کہا کہ مجھے F.Sc ڈویژن امپروو کرنے کی بجائے گریجوایشن کرنی چاہیے، کیوں کہ وہ مجھے لندن لے جانا چاہتے تھے۔ میرے والد نے ہاں کر دی تو میں نے B.Sc میں داخلہ لے لیا، حالاں کہ اگر میں F.Sc دوبارہ کرتا تو آسانی سے اتنے نمبر لیتا کہ میڈیکل کالج چلا جاتا۔ B.Sc میں میں پھر رول نمبر ایک تھا۔ میں اپنے تینوں مضامین زولوجی، بوٹنی اور کیمسٹری کا صدر تھا۔ کالج کی کوئی ایسی سرگرمی یا دورہ ایسا نہیں تھا، جو میرے بغیر ہوتا ہو۔ ہم ان دنوں ناران ٹور پر گئے۔ میں کئی دفعہ گئے، کراچی گئے، لیکن میری بدقسمتی مجھے ایسا کوئی کلاس فیلو دوست نہیں ملا، جو میرے میٹرک کے کلاس فیلوز جیسا ہو۔

میں میٹرک کر کے فیصل آباد آیا تو میں بیڈمنٹن کا پلیئر تھا، لیکن فیصل آباد میں اچھی بیڈمنٹن صرف اچھے کلبوں میں کھیلی جاتی تھی۔ میں نے داخلہ نمبروں سے لیا تھا پھر بھی میں نے کالج کی طرف سے ٹرائل دیے، لیکن وہاں چینی کوچ ٹریننگ دے رہے تھے۔ اہمیت کی کمی اور لگا بندھا وقت..... میرا دل نہ لگا۔ ہاں اس اثناء میں کچھ لڑکے جو مجھے جانتے تھے، میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے کرکٹ کا میچ کھیلنے کی آفر کی۔ مجھے کرکٹ کھیلنا نہیں آتا تھا، لیکن میرا قد 16 سال کی عمر میں 6 فٹ ہو چکا تھا۔ میں نے دور سے دوڑ کر تیز بالنگ کی میری گیند اتنی تیز تھی کہ میں نے اپنی زندگی کے پہلے میچ میں 5 وکٹیں لیں۔ میری بڑی تعریف ہوئی۔ میں نے سوچا کہ میں بیڈمنٹن میں جھک مار تا رہا ہوں، اصل میرا ٹیلنٹ تو کرکٹ میں تھا۔ اس دن سے آج جب میری عمر 51 سال ہے۔ کرکٹ میری رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ میں نے فیصل آباد کے دس رجسٹرڈ کلبوں کی کپتانی کی۔ زیادہ کرکٹ میں نے کوہ نور ملز کی طرف سے کھیلی۔ میں کالج میں ڈگری ٹیم کا کپتان رہا۔ 1981ء میں 19 سال سے کم عمر یونیورسٹی کی ٹیم کی طرف سے انڈیا اور آسٹریلیا انڈر 19 کے خلاف کھیلا۔ میں اقوام متحدہ کے مشنوں پر پولیس کی طرف سے باہر گیا تو وہاں اقوام متحدہ کی ٹیم کی کپتانی کی۔ میری زندگی کے بہت تھوڑے جمعہ اور اتوار ایسے ہیں، جو کرکٹ کی نذر نہ ہوئے ہوں۔ اب میرا بڑا بیٹا معاذ جو پندرہ سال کا ہے بہت اچھا لیگ اسپنر ہے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اس اثنا میں خصوصاً سوتیلی ماں کے آنے کے بعد زندگی مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے F.Sc کے دوران پوسٹل لائف انشورنس میں بیمہ پالیسیاں بھی کیں۔ یہ نہیں تھا کہ میں غریب تھا، لیکن میں فضول خرچ تھا اور آج بھی ہوں۔ گھر کے جیب خرچ سے میرا خرچ پورا نہیں ہوتا تھا۔ میرے والد صاحب مجھے سمجھاتے تھے کہ چوری اور فریب نہیں کرنا ورنہ اگر تم پیسے کمانے کے لیے اینٹیں بھی اٹھاؤ گے تو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب میں بی ایس سی کر رہا تھا تو تب بھی اضافی پیسے کمانے کے لیے محلے میں میٹرک کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا لیتا تھا۔ اضافی روپے کمانے سے میں اپنی بہنوں کے ساتھ خوب کھاتا پیتا۔ کئی دفعہ ان کے کالج کے تعلیمی دورے ہوتے تو تب وہ بابا جان سے بھی پیسے اینٹھتیں اور مجھ سے بھی انھیں اتنے پیسے مل جاتے، جس سے انھیں ٹورز پر کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مجھے اس بات کا سب سے بڑا فائدہ رہا کہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے تمام بہنیں ہر وقت میرا خیال کریں، لیکن میں جو تنہا رہ گیا تھا، اس کا احساس صرف مجھے ہی تھا۔ بہانے بہانے سے تانڈو لیانوالہ چلا جاتا، لیکن اب وہاں کیا تھا؟ تب میں نے تہیہ کیا تھا کہ کبھی نہ کبھی میں نے تانڈو لیانوالہ آ کر آباد ہونا ہے۔ میرا کام صرف بی ایس سی پاس کرنا تھا۔ اچھی پوزیشن لینا تاکہ کیوں کہ مجھے پتا تھا کہ بی ایس سی کے بعد میں نے لندن چلے جانا ہے۔ لیکن جب میں نے بی ایس سی پاس کی تو بغیر زیادہ محنت کے بھی میری ایک نمبر سے سیکنڈ ڈویژن آ گئی، مگر اب امی کے فوراً بعد میرے ماموؤں کو جو مجھ سے ہمدردی اس وقت تھی اب اس میں اتنی گرم جوشی نہیں تھی، لہٰذا میرا لندن جانے کا پلان ختم ہو گیا۔

اب میں گریجویٹ تھا، لیکن میری منزل کہ میں نے زندگی میں کون سا شعبہ اپنانا ہے کوئی واضح نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اب ایک دفعہ کوشش کر کے محنت کرتے ہیں اور B.Sc کا امتحان دوبارہ دیتا ہوں، تاکہ زیادہ نمبروں سے میں ایم ایس سی بائیو کیمسٹری کروں۔ میں نے دوبارہ داخلہ بھیجا اور تن دہی سے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے میٹرک میں اتنی محنت نہیں کی تھی جتنی اب۔ میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے۔

انہی دنوں میں میرے والد محترم نے دوسری شادی کی اور وہ مصروف ہو گئے۔ میری دوسری ماں بھی ہیڈ مسٹریس تھیں اور لاہور کی رہنے والی تھیں۔ بابا جان کو اب دو گھروں کی ذمہ

داری پوری کرنا تھی۔ میں وقار صاحب جو کیمسٹری کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے سے F.Sc اور B.Sc دونوں سال ٹیوشن پڑھتا رہا تھا۔ میری بدقسمتی کہ انہیں دنوں میں انھوں نے میرے والد سے اپنے گھر کا ٹیکس معاف کرنے کو کہا، لیکن میرے والد وہ کام نہ کر سکے۔ میرے کیمسٹری کا پریکٹیکل کے انچارج وقار صاحب تھے۔ میں نے انھیں سالٹ کے متعلق پوچھا تو انھوں نے جل بھن کر مجھے جلی کٹی سنا دیں۔ مجھے کنفرم تھا کہ میں اس پریکٹیکل میں پاس نہیں ہو سکتا۔ میں نے والد صاحب کو بارہا کہا کہ کسی طرح میرے پریکٹیکل کی پیروی کریں، لیکن وہ ہر ہفتہ لاہور جانے کے باوجود یہ کام نہ کر سکے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ میرے B.Sc میں 467/700 نمبر آئے، لیکن میں کیمسٹری کے پریکٹیکل میں فیل ہونے کی وجہ سے کیمسٹری کے پرچے میں فیل ہوا اور کیوں کہ میں ڈویژن بہتر بنا رہا تھا، اس لیے ایک پرچے میں فیل ہونے کا مطلب سارے امتحان میں فیل ہونا تھا۔ اتنے نمبر لے کر بھی فیل ہونا ویسے بھی میں زندگی میں پہلی دفعہ فیل ہوا تھا۔ میں بہت رویا۔ میری نانی نے مجھے پیار کیا اور سمجھایا کہ مشکلیں اب تم پر اتنی آ چکی ہیں کہ اس کے بعد اللہ تم پر مہربانی ہی کریں گے۔ ان باتوں نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے نوکری کی تلاش شروع کی۔ میں نے انگریزی اخبار گھر میں لگوا رکھا تھا، جس میں نوکری کے اشتہارات زیادہ ہوتے ہیں۔

میں نے گلیکسوز میں میڈیکل ریپ کا اشتہار دیکھا اور اپلائی کیا۔ میری انٹرویو کی کال آئی۔ میرا انٹرویو آواری ہوٹل لاہور میں تھا۔ جس دن میں نے لاہور جانا تھا، میری جیب میں صرف سات روپے تھے۔ ان دنوں لاہور سے فیصل آباد بس کا کرایہ بھی سات روپے ہی تھا۔ میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کے علاوہ ایک امیر پڑوسی ارشاد کا ایک طرح سے منشی بھی تھا جو میرے ساتھ کرکٹ بھی کھیلتا تھا۔ میرا ہم عمر تھا، لیکن بہت امیر تھا۔ وہ اَن پڑھ تھا اور امیر تھا۔ میں پڑھا لکھا ضرورت مند تھا۔ میں بدھ کے روز اس کے ساتھ گاڑی میں لاہور جاتا تھا اور اس کے لین دین کا حساب دیکھتا تھا۔ میں نے بابا جان سے پیسے مانگے، لیکن نہ ملے۔ میں نے ارشاد کی منت کی کہ وہ مجھے پہلے لاہور انٹرویو کے لیے چھوڑے اور واپسی پر مجھے لے لے۔ اس نے مجھے آواری ہوٹل کے سامنے چھوڑ دیا۔ میں نے انٹرویو دیا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میں ان دنوں بہت خوب صورت اور جوان تھا۔ میرا انٹرویو بہت اچھا ہوا، لیکن انہوں نے فیصلہ دوپہر 3 بجے کرنا تھا۔ میں ہوٹل سے باہر مال روڈ پر آ گیا۔ میں ایک پیسہ خرچ نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اگر ارشاد نہ آتا تو میرا پروگرام پیدل لاری اڈے تک جا کر سات روپے سے فیصل آباد تک کی بس کا ٹکٹ خریدنا تھا۔ وہی ہوا ارشاد کو نہیں آنا تھا وہ نہ آیا۔ میں نے سخت گرمی میں بھوک برداشت کی۔ پیاس برداشت کی۔ پیاس ایک نلکے سے پانی پی کر بجھائی۔ یہ شاید میری زندگی میں سخت ترین دن تھا۔ اس وقت میری عمر صرف 18 سال تھی، لیکن جب رزلٹ اناؤنس ہوا تو میں پہلے نمبر پر سلیکٹ ہوا۔ مجھے کپڑے بنوانے کے لیے نقد دو ہزار روپے ملے اور میں میڈیکل ریپ ہو گیا۔ میری کل تنخواہ تقریباً 4 ہزار روپے فکس ہوئی اور میں منٹوں میں امیر ہو گیا۔ ہوٹل سے باہر نکل کر مرضی کا برگر کھایا۔ پیپسی پی اور گھر لوٹا۔ اب مجھے ارشاد کے پاس نوکری کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ایک سال میں نے محنت سے نوکری کی۔ مجھے پیسوں کی اب کوئی پرابلم نہیں رہی۔ چار ہزار روپے خاصی بڑی رقم تھی۔ لاہور چکر لگنے لگے۔ مجھے موٹر سائیکل بھی مل گئی۔ اچھے کپڑے پہننے میری ضرورت بن گئی، کیوں کہ میری نوکری میں میں نے ہر وقت بڑے نامور ڈاکٹرز کو ملنا تھا۔

یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا کہ ایک دن ایک کرکٹ میچ کے دوران میرا جگری دوست طارق کمبوہ جو بعد میں ڈی ایس پی ہو کر لاہور میں شہید ہوا۔ میچ چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے اسے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ تھانیدار بھرتی کے لیے اس نے درخواست دینی ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ ڈومیسائل بنوایا اور درخواست دے دی۔ کچھ ہی دنوں میں کال آ گئی۔ فزیکل فٹنس چیک کرنے کے لیے ہمیں 17 کلومیٹر سائیکل چلانا پڑا اور 5 کلومیٹر دوڑ لگانی پڑی۔ مجھے تو پرواہ نہیں تھی، کیوں کہ میں اتنا فٹ تھا اور زندگی میں کوئی دن مجھے یاد نہیں تھا جب میں نے ورزش نہ کی ہو۔ بڑی آسانی سے میں نے وہ فاصلہ طے کیا۔ پھر میرا امتحان ہوا تو پانچ ہزار لڑکوں میں سے میں نے ٹاپ کیا۔

اس عرصے میں میں نے ایم اے انگریزی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگرچہ میں وہ پرائیویٹ کر رہا تھا، لیکن گورنمنٹ کالج کے انگریزی کے ہیڈ شیخ سجاد صاحب نے مجھے اپنی کلاس اٹینڈ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، کیوں کہ میں ایک دن ان کے پاس گیا اور بی ایس سی کے بعد ایم اے

انگلش کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے مجھے کاغذ ساتھ لانے کے لیے کہا اور پھر مجھے ہسٹری آف انگلش لٹریچر پر لکھنے کو کہا۔ میں نے جو لکھا، وہ ان کی توقع سے بڑھ کر تھا۔ انھوں نے میری بائیسویں کری کلاس میں لگوا دی، تاکہ میں لیکچر اٹینڈ کر سکوں لیکن امتحان پرائیویٹ دوں۔ جب میں 5 ہزار لڑکوں کے ٹیسٹ میں پہلے نمبر پر آیا تو طارق مرحوم نے مجھے بتایا کہ وہ سفارش سے بھرتی ہو چکا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں زندگی کے ہر شعبے حتیٰ کہ شخصیت سے بھی اس سے بہتر ہوں، اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ مجھے پہلے بتا دے کہ اگر میں سلیکٹ نہ بھی ہوں تو مایوس نہ ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہنے لگا کہ دعا کرے کہ میں بھی سلیکٹ ہو جاؤں اور اللہ نے میری سن لی۔

میں بغیر سفارش اور بغیر رشوت دیے پولیس میں ASI بھرتی ہو گیا۔ طارق اور میں ٹریننگ پر سہالہ چلے گئے۔ ٹریننگ کے سال میں میں نے ایم اے انگریزی بھی مکمل کیا، جو اب سوچتا ہوں تو کوئی معجزہ ہی لگتا ہے۔

1985ء کو میں بھرتی ہوا اور 1989ء میں سب انسپکٹر پروموٹ ہوا۔ کئی تھانوں میں SHO لگا، لیکن میں کتابیں پڑھتا ہی رہا۔ میں نے اس عرصہ میں ملک کی طرف سے UNO کے دو امن مشن کیے، جن کی غرض سے میں افریقا، یورپ، ایشیا گیا۔ میں نے سارا افریقا اور یورپ اپنے پاؤں سے دیکھا۔ میں نے کرکٹ کھیلی۔ UNO کی ٹیم کی کپتانی کی۔ میری چار بہنوں کی شادی 1993ء تک ہو چکی تھی۔ تب میری شادی کا سوچا جانے لگا۔ میں نے اپنا ذاتی گھر بنوانا شروع کر رکھا تھا۔ تبھی جنوری 1993ء میں عائشہ سے میری پہلی شادی ہوئی۔ وہ ایم اے اسلامیات تھیں۔ وہ بہت نیک خاتون تھیں۔ 1992ء میں مجھے ایک دوست الیاس ملا جس سے آج تک دوستی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد میرا کوئی دوست نہیں بنا یا، مجھے دوستوں کی ضرورت نہیں رہی۔

میرے والد اور میں تین سال تک ایک ہی ضلع میں تعینات رہے اور یہ وہ وقت ہے، جب میں اور میرے والد نے اکٹھے خاصا وقت گزارا۔ وہ ریٹائر ہوئے اور ریٹائر ہونے کے ایک سال بعد 1996ء کو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ مجھ سے پیار کا عالم دیکھیے کہ میری والدہ کی

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تقلید میں وہ بھی میری سال گرہ کے دن ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے اور وہ تاریخ تھی 14 جولائی۔ اب خود سوچیے کہ 14 جولائی میرا تاریخ پیدائش بھی ہے اور میری والدہ اور والد کی تاریخ وفات بھی۔ اپنے والد کے فوت ہونے کے چھ ماہ بعد میں سب سے چھوٹی بہن کی شادی کے فرض سے بھی فارغ ہوا۔ میں نے ساری زندگی محنت کی خود اپنا اور بہنوں کا بوجھ اٹھایا۔ باپ کو بھی تنگ نہیں کیا۔ ان کی دوسری شادی سے ایک اور بیٹی ہوئی۔ باپ کے مرنے کے بعد میرا اُن کی دوسری فیملی سے تعلق نہیں رہا۔ میں نے اپنا گھر خود بنایا۔ دوست کی وجہ سے اس کے گاؤں میں زمین خریدی۔ شادی کے اخراجات خود اٹھائے، بہنوں کے فرائض پورے کیے۔ میں کامیاب انسان تھا، لیکن میری شادی کے گیارہ سال تک اللہ نے مجھے کوئی اولاد عطا نہیں کی۔ میں آگے ہی تنہا تھا۔ اب خدا کی طرف سے یہ نیا امتحان تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اپنے دوست کا بچہ لینے کو کہا۔ الیاس کے گھر بھی خدا نے پہلا بیٹا دس سال کے بعد دیا تھا۔ میری بیوی نے کہا کہ نہ تو میں دوسری شادی کرسکتا ہوں اور نہ ہی کوئی بچہ لے سکتا ہوں۔

انہی دنوں میری نوکری کا مسئلہ ہوگیا۔ میں گھر بیٹھ گیا۔ کچھ پیسوں کی تنگی اور کچھ نوکری کی ٹینشن۔ میں اپنا تعلق بچا نہیں پایا اور میری طلاق ہوگئی۔ اس اثناء میں الیاس سے میں اس کا بچہ اللہ واسطے لے چکا تھا۔ وہ بیٹا...... آج میرا بڑا بیٹا اور میری تمام کہانیوں کا ہیرو معاذ ہے۔ اب ماشاء اللہ وہ پندرہ سال کا ہے۔ وہ بچپن سے دل کا مریض تھا، لیکن آپریشن کے بعد خدا نے اسے صحت دی۔ میں زندگی میں کبھی نہیں رویا، لیکن جب اسے آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اللہ نے مجھے دوبارہ معاذ بخش دیا۔ الیاس کے ہاں دو اور بچے ارتکاز اور راغب ہوئے، لیکن خدا کا کرنا دیکھیے...... وہ دونوں گونگے اور بہرے ہیں، لیکن الیاس نے اپنی دوستی کا حق ادا کیا اور اپنا سب سے اچھا اور جسمانی طور پر ٹھیک بیٹا مجھے دے دیا۔

میں نے معاذ سے کوئی بات کبھی نہیں چھپائی۔ میں شاید ساری زندگی معاذ کے سہارے گزار لیتا، لیکن میری بہنوں نے مجھے مجبور کیا اور میری دوسری شادی عروج سے ہوگئی۔ میری دوسری شادی 2005ء کو ہوئی۔ عروج بی اے ہے۔ اس نے معاذ کو بیٹا بنالیا۔ پھر معاذ کے صدقے اور میری بیوی کی اچھی نیت کے صدقے خدا نے مجھے 2005ء میں تزئین دی، جس کے نام پر

کتاب تزئین اور تتلیاں ہے اور 2008ء میں مجھے ایک بیٹا عطا کیا، جس کا نام احمد عریق طارق ہے۔ اب میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میری تنہائیوں ان بچوں نے دور کردی ہیں۔

پھر میری زندگی میں ایک اور موڑ آیا۔ میں 2010ء میں SHO سابیانوالہ تھا۔ میں نے ایک مقدمہ میں مطلوب 5 بندے بے گناہ کر کے تھانے سے چھوڑے، لیکن راستے میں وہ میرے ایک دوست کے ہمراہ...... جس کے حوالے میں نے یہ بندے کیے تھے قتل ہوگئے۔ یہ اتنی سنگین واردات تھی کہ اس کا اثر میری صحت پر بھی ہوا۔ میری کمر میں درد ہوا۔ میں سمجھا شاید "چک" پڑ گئی ہے، لیکن تیسرے دن اس کی شدت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ مجھے آرام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، کیوں کہ میری انکوائری ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میری انکوائری ہوئی اور میں بے گناہ ہوا، لیکن اتنی دیر میں مجھے کمر کے مہروں کا مرض لاحق ہوچکا تھا۔ کمر کے درد کے دوسرے تیسرے دن میں صبح سو کر اٹھا تو میری دائیں ٹانگ سن ہو چکی تھی۔ میں معذور ہو چکا تھا۔ چار پانچ بندے مجھے اٹھا کر باتھ روم لے جانے لگے۔ تکلیف اتنی تھی کہ ذرا سا ہلنے سے یوں لگتا، جیسے میری کمر میں کوئی خنجر گھونپ رہا ہے۔ میں لاہور اپنی بہن امبر کے پاس چلا گیا۔ میرے بہنوئی امتیاز میرے سگے پھوپھی کے بیٹے ہیں، اس لیے ان کا گھر ہمیشہ میرے لیے گوشہ عافیت ہوتا ہے۔

ساری زندگی مجھے وردی پہنے ہوئے اچھی لگتی تھی۔ میں میڈیکل ریپ تھا تو اپنا بریف کیس پکڑے کوئی بڑا بزنس مین لگتا تھا۔ میرے لیے یہ امر کتنا سوہان روح ہوگا کہ شاید دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہو سکوں۔ میرا چھوٹا بیٹا عریق اس وقت صرف ایک سال کا تھا، میں اسے اٹھا نہیں سکوں گا۔ معاذ ہمیشہ میرے ساتھ میرے منہ میں انگلیاں ڈال کر سوتا تھا وہ اب میرے ساتھ سو نہیں سکتا تھا۔ میری بیوی، میری بہنیں...... انہوں نے کبھی مجھے لاچار نہیں دیکھا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی ورزش نہیں چھوڑی تھی۔ ایسا اچنبھا کبھی کسی نے نہ دیکھا نہ سنا۔ مجھے اندازہ تھا کہ خدا نے میری زندگی کا سب سے بڑا امتحان لیا ہے۔ میں نے اس مشکل اور ابتلا کے دور میں اپنے [illegible]ں کا نام لے کر خدا سے معافی مانگی اور رسول پاک ﷺ سے مدد کی استدعا کرتا رہا۔

یہی وہ وقت تھا، جب پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے زندگی میں کچھ نہیں کیا۔ مجھے اس [illegible] اتنی تکلیف تھی کہ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ تب مجھے بچپن کے وہ ناول یاد آئے، کیوں کہ تکلیف

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میں ماں یاد آتی ہے۔ ماں کے ساتھ گزارا ہوا زمانہ یاد آتا ہے۔ یہ بچوں کے ناول اسی زمانے کی یادگار تھے۔ میں نے ایک طرف تو یہ ناول اکٹھے کرنے شروع کیے تو دوسری طرف دنیا بھر کے انگلش اور فرنچ میں چھپنے والا بچوں کا ادب پڑھنا شروع کیا۔ خدا کی طرف سے معجزہ ہوا اور جس بیماری کے بارے میں ڈاکٹروں نے مجھے کہا تھا کہ یہ لاعلاج ہے، اس میں افاقہ ہونا شروع ہو گیا۔ اب میں گاڑی میں بیٹھ کر اپنے بیٹے معاذ اور ڈرائیور کو ساتھ لیتا اور باتھ روم کے لیے ایک پاٹ گاڑی میں رکھتا، کیوں کہ میں عام باتھ روم میں نہیں جا سکتا تھا۔ میری دونوں ٹانگوں پر بے تحاشا پٹیاں بندھی ہوتیں۔ میری کمر پر پلاسٹک شیٹ ہوتی۔ میری گردن سیدھی رکھنے کے لیے کالر بندھا ہوتا۔ اسی حال میں انارکلی بازار میں ہر اتوار کو میں بچوں کی کتابیں ڈھونڈتا۔ پرانے تعلیم و تربیت ڈھونڈے۔ یہ کام میں نے اڑھائی تین سال میں مکمل کیا۔ مجھے وہاں سہیل بٹ ملے، نذیر صاحب ملے، اصغر صاحب ملے۔ یہ سب احباب اب اگر میں لاہور نہ بھی جاؤں تو بچوں کی کوئی کتاب نہیں بیچتے جب تک مجھ سے پوچھ نہیں لیتے کہ یہ آپ کو تو نہیں چاہیے؟

میرا علاج فیصل آباد کے ایک پہلوان نے کیا۔ اس نے اپنے خاص طریقے سے میری ٹانگیں کھینچ کر مجھے دوبارہ قدموں پر کھڑا کیا۔ میں نے پہلی دفعہ قدم فرش پر لگائے تو یہ کام کیے مجھے کوئی دو اڑھائی سال ہو چکے تھے۔ میں ہزاروں دفعہ منہ کے بل گرا۔ پہلی دفعہ قدم اٹھایا تو کسی نوزائیدہ بچے کی طرح سو بار گرا۔ پہلی مرتبہ گراؤنڈ گیا تو صرف گراؤنڈ دیکھ کر واپس آیا۔

بہرکیف آج یہ حال ہے کہ میں کرکٹ نیٹ کرنے جاتا ہوں اور مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ بالنگ کرتا ہوں۔ یہ ہے میرے خدا کا مجھ پر احسان۔ میں نے بیماری میں سوچا تھا کہ اب میں نے زندگی کا کوئی مقصد بنانا ہے۔ جن کتابوں نے مجھے قدموں پر کھڑا کرنے میں میری مدد کی، میں نے ان کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ میں نے جھنگ، فیصل آباد، چنیوٹ، ٹوبہ ٹیک سنگھ اضلاع کے پانچ سو سے زیادہ ہائر سیکنڈری اسکولز کی لائبریریاں اپنے پیسوں سے ٹھیک کروائیں۔ کہیں الماری نہیں تھی تو کہیں تالا نہیں تھا۔ میں اب بھی گاڑی لے کر کوئی شہر منتخب کرتا اور وہاں جا کر پرانی لائبریری ڈھونڈتا ہوں۔ ہوتے ہوتے میرے پاس فیروز سنز اور شیخ غلام علی سنز کے تقریباً سبھی ناول اکٹھے ہو گئے۔ میں نے تعلیم و تربیت پڑھنا جہاں سے چھوڑا تھا، وہیں سے آج تک کے تمام رسائل

پڑھے اور پھر میں نے پروگرام کے مطابق لکھنا شروع کیا۔

میں نے کوئی تیرہ چودہ کہانیاں تعلیم و تربیت میں لکھ کر بھیجیں۔ ان میں سے میری اپنی بھی تھیں اور ترجمہ شدہ بھی، لیکن جب میری دال نہ گلی تو میں لاہور نذیر انبالوی صاحب سے ملنے گیا۔ وہ تو مجھے نہ ملے، لیکن میں ٹیلیفون نمبر بشیر راہی صاحب کے پاس چھوڑ آیا۔ نذیر انبالوی صاحب کا دو تین روز بعد مجھے فون آیا تو میں نے اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر میں ان سے ملا۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ انھوں نے مجھے اپنی کتاب ''فاتح کون'' اپنے دستخط کے ساتھ دی۔

دسمبر 2012ء میں میری پہلی کہانی ''بگڑا ہوا بندر'' چھپی۔ یہ ''کتے'' کے بعد میری چھپنے والی پہلی کہانی تھی، جو چھتیس سال بعد چھپی۔ نذیر انبالوی صاحب نے تعلیم و تربیت چھوڑا تو میرے لیے اس رسالے کے دروازے کھل گئے۔ میری ملاقات آفتاب صاحب اور ایڈیٹر عابدہ اصغر صاحبہ سے ہوئی جنھیں میری تحریریں بہت پسند آئیں اور اللہ کے کرم سے پچھلے دو سال سے تعلیم و تربیت میں کسی مہینے میری چھٹی نہیں ہوئی۔ دو سال تعلیم و تربیت میں مستقل چھپنا وہ اعزاز ہے، جو میں قبر میں ساتھ لے کر جاؤں گا اور میرے بچے اس بات پر فخر کریں گے۔ تعلیم و تربیت کے روح رواں آفتاب صاحب نے میری جتنی پذیرائی کی، میں ان کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ تعلیم و تربیت کے بعد جس رسالے میں تواتر سے چھپا وہ تھا نگٹن۔ میں اس میں اتنی دیر تک مستقل چھپتا رہا، جب تک کہ وہ بند نہیں ہو گیا۔

نگٹن کے بعد بچوں کی کہانیاں، پھر میری ملاقات امان اللہ نیئر شوکت سے ہوئی اور ان کی وساطت سے میں نٹ کھٹ میں مستقل ہوا۔ اب تک میری کوئی کہانی نونہال میں نہیں چھپ سکی تھی۔ میں کوئی دو سال پہلے کراچی کسی کام سے گیا تھا تو فریئر مارکیٹ میں میری ملاقات ارشد صاحب سے ہوئی تھی، ان کی وساطت سے میری ٹیلی فون پر جدون ادیب سے بات ہوئی اور میری ان سے دوستی شروع ہوئی، جو دن بدن پکی ہوتی جا رہی ہے۔ انہوں نے مجھے ماہ نامہ ساتھی میں لکھنے کو کہا۔

میں نے محبوب الٰہی مخمور صاحب سے رابطہ کیا۔ یہ میرے بھائی بھی تعلیم و تربیت میں لکھتے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ تبھی میری زندگی میں میرے محسن و مربی حافظ مظفر محسن

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

آئے، جو بھی ستر کی دہائی میں میرے ساتھ تعلیم و تربیت میں لکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے کہانیاں اکٹھی کر کے مسودہ بنانے کو کہا، جو میں نے شد و مد سے شروع کیا۔ جیسے تیسے میں نے کہانیاں پوری کیں، جو انہوں نے "نستعلیق پبلی کیشنز" کے تحت میری پہلی کتاب "تزئین اور تتلیاں" چھپوائی۔ ان کی وساطت سے میری ملاقات حسن عباس صاحب سے ہوئی جو ماہنامہ ارژنگ کے ایڈیٹر ہیں اور خود بھی بہت بڑے شاعر ہیں۔ میری کتاب چھپی تو وہ اتنی خوب صورت تھی کہ سب کو پسند آئی۔

اس اثناء میں میری تعیناتی جھنگ ہو چکی تھی، وہاں میری ملاقات عبدالرشید فاروقی اور مظہر عباس سے ہوئی اور انہی کی وساطت سے اشتیاق احمد صاحب مجھے ملے۔ سبھی حیران تھے کہ ایک پولیس آفیسر کو بچوں کے ادب کے بارے میں اتنی شناسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ بات میرے حق میں گئی اور لوگوں نے مجھے خاص توجہ دی۔ پھر میری کتاب کی تقریب رونمائی الحمرا آرٹس کونسل میں حافظ مظفر محسن صاحب اور حسن عباس صاحب نے کروائی۔ آپ حیران ہوں گے تب تک میں فیس بک استعمال نہیں کرتا تھا۔ پھر میں نے لیپ ٹاپ خریدا اور فیس بک پر طبع آزمائی شروع کی۔ انہی دنوں کاروان ادب میری زندگی میں داخل ہوا۔ کاروان ادب کی ساہیوال میں تقریب پر میں بھی مدعو تھا مگر کسی وجہ سے میں نہ جا سکا، لیکن مجھے ندیم اختر، کاشف بشیر کاشف، عبداللہ نظامی، وسیم کھوکھر کے ناموں سے واقفیت ہو گئی۔ پھر فیس بک پر میری ان سے شناسائی بڑھتی گئی۔ آج یہ میرے گھر کے افراد ہیں۔ ہم اکثر و بیشتر ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور بچوں کے ادب کے علاوہ اپنے مسائل بھی شیئر کرتے ہیں۔

میری دوسری کتاب "بارش اور گلاب" کی تقریب رونمائی کاروان ادب نے اعتراف انٹرنیشنل کے ساتھ مل کر الحمرا آرٹس کونسل میں کروائی ہے، جس کے بارے میں دوستوں کا یہ خیال ہے کہ پاکستان میں بچوں کے ادب کی یہ سب سے بڑی تقریب تھی۔ اس میں عطاالحق قاسمی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ اشتیاق احمد صاحب، اختر عباس صاحب، حافظ مظفر محسن صاحب، مظہر نواز صدیقی صاحب مہمانان اعزازی تھے اور پنجاب بھر سے نذیر انبالوی کے علاوہ تقریباً سبھی جانے مانے بچوں کے ادیب شامل تھے۔

یہاں میں تذکرہ کروں گا کہ فاروق احمد، جو اٹلانٹس پبلی کیشنز کے مالک ہیں...... خصوصی طور پر

کراچی سے لاہور آئے اور تقریب کے فوراً بعد واپس کراچی چلے گئے۔ فاروق بھائی سے میری فیس بک پر دوستی ہوئی۔ وہ بھی بچوں کے ادب کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میری طرح ان کے پاس بھی تمام بچوں کے ناول لائبریری کی صورت میں جمع ہیں، لیکن انھیں حیرت ہوئی کہ جو کتابیں ان کے پاس نہیں ہیں، وہ میرے پاس ہیں اور مجھے ان سے وہ کتابیں مل گئیں، جنھیں میں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

پاکستان کے سارے بچوں کے جرائد میں آج میں مستقل شائع ہو رہا ہوں۔ ان میں تعلیم و تربیت، نونہال، ساتھی، ذوق و شوق، بچوں کی کہانیاں، نٹ کھٹ، بزم قرآن، شاہین ڈائجسٹ، ہم ہم، جنگل منگل اور انوکھی کہانیاں میں...... میں مستقل چھپ رہا ہوں۔ محبوب الٰہی صاحب میرے بھائی ہیں۔ میری بڑی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بارش اور گلاب کی اگلی تقریب پذیرائی کراچی میں وہ ہی کروائیں گے۔ میری ان سے ہر وقت بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ ان کی وساطت سے میری اب ابن آس محمد صاحب، نوشاد عادل صاحب جیسے کراچی کے رہنے والے رائٹرز سے دوستی ہے۔

جب میری پہلی کتاب تزئین اور تتلیاں چھپ رہی تھی تو میں سمجھتا تھا کہ اب میں اگر زندہ نہ بھی رہوں تو چلیں جہاں یہ کتاب جائے گی مجھے زندہ رکھے گی، لیکن اب دوسری کتاب میں میں نے اپنے دوست جدون ادیب کو دیباچہ لکھنے کے لیے تیار کیا۔ بیک فلیپ پر محترم عطاالحق قاسمی صاحب کے تاثرات، بیٹی راجہ شیخ کے بنائے چھتیس کلر اسکیچز، اس کتاب کی پذیرائی۔ میری جیب میں میری اگلی کتاب تزئین کہانی کا مسودہ، جس کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی میں انشاءاللہ اگر محنت کرتا رہوں تو کئی کتابوں کا رائٹر ہو کر اللہ کے پاس جاؤں گا۔ میں لکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نانی اور دادی بن کر رضائی لوں، اس میں ڈرائی فروٹ لوں اور اپنے بچوں کو کہانیاں سناؤں، جیسے میری ماں مجھ سے کیا کرتی تھی۔

میں چاہتا ہوں کہ بچوں کو اچھا مسلمان بنانے سے پہلے ہی اچھا انسان بناؤں، کیوں کہ دس سال تک کے بچوں کو نماز بھی معاف ہے۔ میں کیونکہ اتنی عمر کے بچوں کیلئے لکھتا ہوں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اتنی دیر میں ان کے کردار کی تعمیر کروں، جب تک کہ ان پر نماز فرض ہو۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اچھے مسلمان تب ہوں گے جب وہ اچھے انسان ہوں۔ کیا کوئی بچہ سوچ سکتا ہے کہ وہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

نماز نہ پڑھے، لیکن یہ کام میں ڈنڈے سے نہیں کروانا چاہتا۔ جو کام میں پیار سے کروا سکتا ہوں، اس میں مار کوئی ضروری نہیں۔

مجھے کہانی لکھنے سے زیادہ کہانی سنانا پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ قصہ گو بنوں جو قصہ خوانی بازار پشاور میں تہوہ پیتے ہوئے لوگوں کو کہانیاں سناتا ہے۔ میں نماز روزہ نہیں بیچتا۔ میں محنت کرتا ہوں۔ بچوں کو ان کی من پسند دنیا میں لے جاتا ہوں۔ پریوں کی دنیا، بونوں کی دنیا، چالاکیوں کی دنیا، رنگین پنسلوں کی دنیا، دائر کلر کی دنیا، کتابوں کی دنیا، تتلیوں کی دنیا، جگنوؤں کی دنیا..... یہ اُن کا حق ہے۔ میں خدا کا شکر گزار ہوں، جس سے مجھے بچوں میں اتنی مقبولیت بخشی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں کاروان ادب کے تحت لکھ رہا ہوں۔ اس سے مجھے دوہرا فائدہ ہے بچوں کا ادب لکھنا اور اس کی ترویج کرنا۔ ندیم اختر میں تمہارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ محنت کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں جہاں میری ضرورت ہوگی، میں حاضر ہوں۔ جو سفر میں نے اکیلے شروع کیا، آج تم میرے ساتھ ہو۔ شکریہ حافظ مظفر محسن صاحب، شکریہ ندیم اختر، شکریہ جدون، شکریہ محبوب بھائی، شکریہ آفتاب بھائی، میری حوصلہ افزائی کا شکریہ۔ بارش اور خدا کی صورت میں میں نے بچوں کی کتابوں کا معیار مقرر کر دیا ہے۔ نئی طرح کی طباعت اور اندر نئے موضوعات پر کہانیاں۔ یہ کتاب کسی بھی لائبریری میں فخر سے رکھی جا سکتی ہے۔ یہ کتا بچہ نہیں کتاب ہے۔ فاروق احمد صاحب کا بارش اور گلاب کی تحریر میں یہ کہنا کہ اشتیاق احمد صاحب کے بعد مجھے احمد عدنان طارق پسند آئے ہیں۔ عطاالحق قاسمی کا کہنا کہ میں سمجھتا ہوں کہ عدنان نے بونگیاں ماری ہوں گی۔ کتاب پڑھی تو پتا چلا کہ کتاب میرے بچوں کو پڑھی چاہیے۔ اشتیاق احمد صاحب کے بیٹے کی شادی دو دن بعد تھی۔ اُن کا میرے لیے لاہور آنا..... یہ نشانیاں ہیں کہ خدا مجھ پر مہربان ہے۔ تعلیم و تربیت میں دو سال مستقل چھپنا..... اے خدا تیری مہربانی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں تیری کس کس نوازش کا شکر ادا کروں۔ آپ نے جہاں مجھے عزت و شہرت دی، وہیں مخلص ترین ادب دوستوں سے نوازا ہے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ڈاکٹر ظفر احمد خان

کراچی کی اندھیری گلیوں سے ابھرنے والے ادب کے ایک روشن ستارے کا احوال۔ شوق نے انہیں بچپن میں ہی ادب سے جوڑ دیا تھا۔ جب قلم ہاتھ میں تھاما تو خوب صورت کہانیوں کی جھڑی لگ گئی اور بچوں کی ادب کے خزانے میں بہت سی شان دار تحریروں کا اضافہ ہوتا گیا۔
خوش نویسی کی جانب توجہ کی تو اپنے کئی دل نشیں خط تعلیق کر ڈالے، مسیحا بنے تو سیکڑوں مریضوں کو صحت یاب کیا، قلم کی طاقت سے اپنا نام بنانے والے ڈاکٹر ظفر احمد خان کی اثر انگیز آپ بیتی، جو نئے لکھنے والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

بڑوں اور بچوں کے ادیب، ماہر صحت و ماہر خطاطی[illegible]

---

itsurdu.blogspot.com

میں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی، وہاں چہار اطراف غربت کا راج تھا۔ حیدرآباد (سندھ) کے علاقہ صدر میں ایک کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ میرے والد درزی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ مجھ سے بڑی ایک بہن بھی تھی۔ اس وقت ہم دو بہن بھائی تھے۔ میرے والد ایک محنتی، ایمان دار اور سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان پڑھ تھے، لیکن وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے اچھی تعلیم و تربیت اور ہنر سے آراستہ ہوں۔ اسی تگ و دو میں وہ مشینی انداز میں پیشہ ورانہ مصروفیت میں لگے رہے۔ میرے چچا، تایا اور پھوپھیاں سب حیدرآباد میں ہی رہائش پذیر تھے۔ اس کے علاوہ میرے نانا، نانی، ماموں اور خالائیں بھی حیدرآباد میں ہی تھے۔ دادا، دادی میری پیدائش سے پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

میری عمر 3 یا 4 سال ہی تھی کہ میرے والد ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔ ہمارے ساتھ ہمارے نانا، نانی اور ماموں، خالائیں بھی کراچی آ گئے۔ ہم لیاقت آباد کے ایک علاقے میں رہائش پذیر ہو گئے۔ یہاں سے میرے اسکول کا زمانہ شروع ہوا۔ میں پڑھنے میں بہت ذہین

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تھا، جس کا تبصرہ میں اپنے بڑے ماموں کی زبانی سنتا، جو کہ تعلیم یافتہ تھے اور سرکاری ملازم تھے۔ میری غیر تعلیمی مصروفیات ایسی تھیں کہ میں دو پنسلیں ملا کر لکھتا تھا، جس سے خطاطی کا رجحان پیدا ہوا، لیکن عمر اتنی کم تھی کہ کسی نے دھیان نہیں دیا اور نہ ہی میرے خاندان میں کسی نے نہ خطاطی کی نہ سمجھی۔ اس کے علاوہ گتے کے خالی ڈبے اور دیگر بے کار چیزوں سے دست کاری کرنے کا رجحان تھا۔ دست کاری کے لیے بڑا اہتمام کرتا تھا۔ باقاعدہ جیومیٹری کے اصول پر پیمائش کر کے نشان لگا کر بناتا۔ میں بحری جہاز، مکان وہ دیگر چیزیں بناتا تھا، جنہیں دیکھ کر سب بہت حیران ہوتے تھے۔

میری والدہ میرے ان مشاغل کی بہت حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ غربت کے باوجود انہوں نے میری ہر فرمائش پر ضرورت کی ہر وہ چیز منگوا کر دی جس کی مجھے ضرورت پڑتی تھی۔

میری مصروفیات دیکھ کر میرے ماموں میرے بارے میں کہتے تھے ''لڑکا بڑا ہو کر بہت نام کمائے گا۔'' وہ میری بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں اکثر اپنے ماموں کے گھر رہنے چلا جاتا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے ماموں مجھے فرمائش کر کے مختلف چیزیں بنواتے اور تعریف کیا کرتے اور سامان بھی مہیا کرتے۔ ہم ماموں بھانجے کی اس اُلفت سے میری والدہ بہت خوش ہوتی تھیں۔

تعلیمی میدان میں بھی میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ میں ہر سال امتیازی نمبروں سے پاس آتا تھا۔ چند سال لیاقت آباد میں رہے۔ اس کے بعد ہم لائنز ایریا منتقل ہو گئے۔ یہاں میرے والد نے اپنا مکان خرید لیا تھا۔ یہ بات ہے تقریباً 1977ء کی..... غالباً بھٹو صاحب کا دور تھا۔ اپنے ذاتی مکان میں رہائش اختیار کر کے ہم بہت خوش تھے۔ یہاں ایک مقامی اور سرکاری اسکول میں میرا چوتھی کلاس میں داخلہ ہو گیا اور یوں زندگی پھر اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ دو کمرے کا یہ مکان کسی جنت سے کم نہیں تھا۔ جب صبر و استقامت ہو، ضروریات زندگی محدود ہوں تو سکون اور شانتی ہی ہوتی ہے۔ ہمارے گھر میں ٹی وی بھی نہیں تھا اور بجلی و گیس بھی نہیں تھی۔ مٹی کے تیل کے چولہے پر کھانا پکایا جاتا تھا اور روشنی کے لیے لالٹین استعمال ہوتی تھی۔ میں لالٹین کی روشنی میں اسکول کا کام کیا کرتا تھا۔

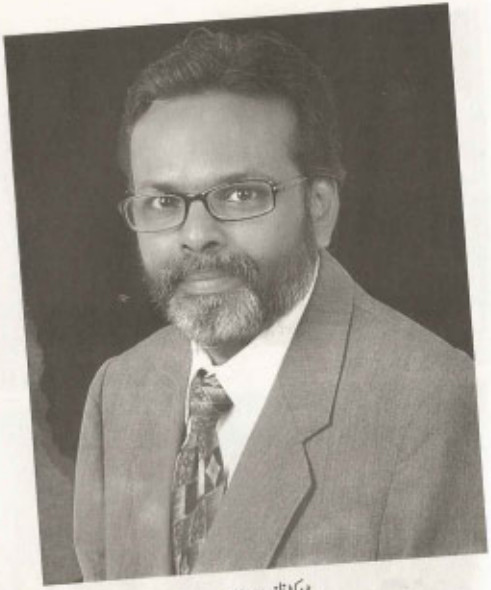

ڈاکٹر ظفر احمد خان

والدہ محترمہ مذر یہ بیگم

والد محترم عبدالجبار خاں صاحب

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

مہمان خصوصی عرفان اللہ مروت سے نوٹ بٹوٹ مصنف ایوارڈ 1990ء وصول کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر ظفر احمد خاں 22 اپریل 1998ء میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔

ڈاکٹر ظفر احمد خاں کے چھوٹے بھائی قمر احمد خاں اپنی فیملی کے ہمراہ

ڈاکٹر ظفر احمد کے لڑکپن کی تصویر

ڈاکٹر ظفر احمد پنڈولم سائنس کے مختلف عملی تجربات کرتے ہوئے۔

ڈاکٹر ظفر احمد خاں کی بڑی بہن اپنی فیملی کے ہمراہ

صاحبزادے جواد احمد خاں اور نصر احمد خاں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میرے والد کالفٹن کے علاقے میں درزی کا کام کرتے تھے۔ وہ کسی ٹیلرنگ کی دوکان پر ملازم تھے۔ جس سے ہماری گذر بسر ہوتی تھی۔ ٹی وی نہ ہونے کی وجہ سے ہم پڑوسی کے گھر ٹی وی ڈرامہ دیکھنے جاتے تھے۔ میری دن بھر کی مصروفیات میں صبح اسکول دوپہر کو تھوڑی دیر کھیل کے بعد اسکول کا کام کرنا پھر رات کو پڑوسی کے گھر ڈرامہ دیکھنا اور کھانا کھا کر سو جانا اور یوں یہ سادہ سی زندگی اپنی سبک رفتاری سے گزر رہی تھی۔

ساتویں کلاس میں پہنچنے کے بعد بچوں کے رسائل پڑھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ جس میں نونہال، بچوں کا رسالہ، بچوں کی دنیا، ہونہار، ٹوٹ بٹوٹ اور تمام روزناموں کے بچوں کے صفحے وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ بچوں کی کہانیاں پڑھنے میں میری دل چسپی بڑھتی گئی۔ میں کہانی کے کرداروں میں کھو جاتا تھا۔ ہر ماہ رسائل کا انتظار کرتا تھا۔ بک اسٹال پر جا جا کر پوچھتا تھا کہ فلاں رسالہ آ گیا۔ مجھے جو جیب خرچ ملتا تھا، وہ میں جمع کرتا تھا اور ہر ماہ رسائل خرید لیتا تھا۔ پھر مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ میں عمران سیریز اور اشتیاق احمد کے ناول پڑھنے لگا۔ میرے علاقے میں ایک لائبریری تھی جہاں سے مجھے یہ تمام ناول کرائے پر مل جاتے تھے۔ جاسوسی ناول پڑھنے کا رجحان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ میں تخیل کی دنیا میں رہنے لگا اور میرے ذہن میں ہر وقت انہی ناولوں کے کردار گردش کرتے رہتے تھے۔

تعلیم کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ میں نویں کلاس میں پہنچ چکا تھا۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے۔ چھ بہنیں اور دو بھائی، لیکن ادبی رجحان صرف مجھ میں ہی تھا۔ میں اپنے تمام بہن بھائیوں میں سب سے جدا تھا۔ ہر وقت اسکول کا کام کرتا یا رسائل و جرائد پڑھنا میری سرگرمیاں تھیں۔ اسکول کا کام میں بڑی دل چسپی اور لگن سے کرتا تھا۔ ایک ایک لفظ بنا بنا کر لکھتا تھا۔ اس کے لیے میں تین رنگ کے قلم استعمال کرتا۔ لال، نیلا اور کالا۔ سوال لال قلم سے، ہیڈنگ کالے قلم سے اور تفصیل نیلے قلم سے لکھتا۔ میری کاپیوں میں ہمیشہ اسکول کا کام مکمل ہوتا تھا۔ اساتذہ بھی میری طرف سے قدرے مطمئن نظر آتے تھے۔ میں ہر سال فرسٹ یا سیکنڈ آتا تھا۔ مجھے اساتذہ تحائف بھی دیا کرتے تھے۔ میرے لیے ایک اور خوشی اور فخر کی بات ہے کہ ہر سال جب میں اگلی کلاس میں جاتا تھا تو مختلف مضامین کے اساتذہ مجھ سے میری کاپیاں مانگ لیتے تھے۔ کہتے تھے کہ تمہارا کام اتنا

ڈاکٹر ظفر احمد خاں کی چھوٹی بہن اپنی فیملی کے ہمراہ

ڈاکٹر ظفر احمد خاں کی چھوٹی بہن اپنی فیملی کے ہمراہ

ٹوٹ بٹوٹ مصنف ایوارڈ 1990ء۔ چیف ایڈیٹر محمود شام صاحب کے ہمراہ گروپ فوٹو

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

''آپ ٹوڈیٹ'' ہے کہ اب ہم تمہاری کاپی سے پڑھا کیں گے۔

لکھنے کا رجحان نویں کلاس سے پیدا ہوا۔ میری کلاس میں جو ہونہار طلباء تھے وہ میرے ہم اثر دوستوں میں شامل تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنی کلاس میں بیٹھا فری پریڈ میں ٹوٹ بٹوٹ پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرا کلاس فیلو آ گیا۔

''بیلو ظفر! کیا پڑھ رہے ہو؟'' اس نے میرے ہاتھ سے رسالہ لے کر ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کہانی پڑھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا

''یار یہ کہانیاں لکھنا بھی بڑی مہارت کا کام ہے۔ ہم تم جیسے لوگ نہیں لکھ سکتے۔'' اس نے کہا

''اتنا مشکل کام بھی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں یار! یہ بہت ذہین لوگوں کا کام ہے۔'' اس نے کہا

''اگر یہ بات ہے تو..... میں تمہیں کہانی لکھ کر دکھاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

اس دن کے بعد میں نے اپنے ذہن کو ٹٹولا کہ آیا واقعی میں کہانی لکھ سکتا ہوں یا نہیں تو جواب آیا ہاں اور یوں میں نے قلم اٹھایا۔

میں ذہن پر زور دے کر مرکزی خیال بنانے لگا۔ پھر کافی دیر کوشش کے بعد ایک مرکزی خیال میرے ذہن میں آ گیا۔ پھر میں نے اس مرکزی خیال کے تحت لکھنا شروع کیا۔ منظر کشی اور مکالمے فرضی طور پر بنائے۔ پھر کچھ کوشش اور جستجو کے بعد ایک مختصر سی کہانی لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ یہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں، بہرکیف میں ایک ڈاک کا لفافہ لایا اور وہ کہانی ٹوٹ بٹوٹ کے پتے پر ارسال کر دی اور اس کے بعد اگلے ماہ کے ٹوٹ بٹوٹ کا انتظار رہنے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں بہت کٹھن ہو گئیں۔ دن گن گن کے گذارنے لگا۔ بک اسٹال کے چکر لگاتا رہا اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ٹوٹ بٹوٹ کا ماہ نامہ آ گیا۔

میں بڑی بے چینی سے رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا اور پھر ایک صفحے پر نظر پڑتے ہی میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ میری کہانی شائع ہو چکی تھی۔ ''وہ رات'' کے نام سے میری پہلی کہانی

ماہنامہ ٹوٹ بٹوٹ میں 1984ء میں شائع ہوئی۔ وہ رسالہ میں نے اپنے اس کلاس فیلو کو دکھایا، جس نے چیلنج کیا تھا۔ وہ میری کہانی دیکھ کر حیران اور خوش ہوا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں اسی وقت اگلی کہانی لکھنے بیٹھ گیا اور یوں ہر ماہ میری کوئی نہ کوئی تحریر ٹوٹ بٹوٹ میں شائع ہونے لگی۔ اس کے بعد میں دیگر رسائل میں بھی لکھنے لگا اور اخبارات میں بچوں کے صفحہ پر بھی لکھنے لگا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ٹوٹ بٹوٹ میٹنگ کا دعوت نامہ میرے گھر کے پتے پر آیا۔ میں بہت حیران اور خوش ہوا۔ اس زمانے میں ٹوٹ بٹوٹ کے چیف ایڈیٹر محمود شام صاحب نو عمر قلم کاروں کو جمع کر کے ٹوٹ بٹوٹ پر تبصرہ کرواتے تھے۔ اس دور میں بچوں کے ادب کے لیے میٹنگ کا اہتمام کرنا شام صاحب کی بچوں کے ادب سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا اور بچوں کے ادب کی ترویج و ترقی میں بہت بڑا قدم تھا۔ شام صاحب کی نو عمر قلم کاروں سے شفقت اور محبت نے آج ہمیں بڑے بڑے ادیب دیئے۔

سلسلہ کلام یہ ہے کہ نوٹ بٹوٹ میٹنگ کا دعوت نامہ پا کر میں بہت خوش تھا۔ مجھے پریس کلب کا پتا بھی معلوم نہ تھا، چوں کہ میں میرٹ میں تھا اور کراچی کے علاقوں سے ناواقف تھا۔ پریس کلب کا پتہ پوچھ پوچھ کر میں وہاں پہنچا۔ میں کافی ڈر رہا تھا۔ جھجک رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ادیبوں کی محفل میں شریک ہونے جا رہا ہوں اور جب میں وہاں پہنچا تو میری جھجک اور خوف جاتا رہا، کیوں کہ وہاں مجھے انتہائی اپنائیت اور حوصلہ افزائی ملی۔ مجھے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پہلی بار آیا ہوں۔ تمام نو عمر ادیبوں نے مجھے محبت اور خلوص سے نوازا۔ میری وہاں جن ادیبوں سے پہلی بار ملاقات ہوئی ان میں محبوب الٰہی مخمور، مصطفیٰ چاند (مصطفیٰ ہاشمی)، کاوش صدیقی، سید عبدالعزیز عزمی (مرحوم) خواجہ وقار احمد، فیصل ملک سلیم، حنیف سحر، آصف مالک، رؤف اسلم آرائیں اور بہت سے۔ ان میں سے بہت سارے ادیب آج بھی آپ کے سامنے ہیں۔ کچھ گمنامی میں چلے گئے۔ چند ایک ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

اس میٹنگ میں مجھے بہت سارے ادبی دوست ملے جن سے میرا رشتہ آج تک اسی خلوص اور محبت سے قائم و دائم ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے سرچشمہ ادب محمود شام صاحب جن کا تذکرہ نہ کرنے میں ادب کی حق تلفی کروں گا۔ شام صاحب میرے اُستاد اور زبردست بارعب شخصیت کے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

مالک ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ میں وہ خوش نصیب شخص ہوں جس نے شام صاحب کی ڈانٹ کھائی ہے جی ہاں!

اُستاد کا درجہ باپ سے بھی بڑا ہے، کیوں کہ باپ پیدا کرنے کا وسیلہ ہے، لیکن استاد وتربیت کرتا ہے۔ اخلاقی اقدار سکھاتا ہے۔ معاشرے میں جینے کا انداز سکھاتا ہے۔ میری ادبی ساکھ بنانے میں شام صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ادبی دوستوں میں میں حنیف سحر سے بہت متاثر ہوا۔ پہلی بار جب وہ مجھ جیسے ایک غریب آدمی کے گھر آئے تو میں بہت خوش ہوا۔ یہ ان کی ادیبوں سے حوصلہ افزائی کرنا۔ ان کے گھروں پہ جا کر انہیں تلاش کر کے منظر عام پر لانا۔ محفلوں، ادبی نشستوں میں لانا، حنیف سحر کی اس روش نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کے علاوہ جتنے بھی ادبی دوست ملے، سبھی نے انتہائی خلوص و محبت کا مظاہرہ کیا۔ ادیبوں کی دنیا مجھے ایک نئی دنیا میں لے گی۔ مجھے یہ دنیا بہت اچھی لگی۔ بہت بھلی اور منفرد۔ میری عام زندگی سے یکسر مختلف اس کا مزہ ہی الگ تھا۔ میں جب ادبی دنیا میں داخل ہوا تو لکھنے کا مزہ آنے لگا۔ مختلف ادیبوں کے مختلف انداز تھے۔ کوئی سسپنس و جاسوسی لکھتا تھا، کوئی معاشرتی انداز میں لکھتا تھا۔ کوئی سفر نامے لکھتا تھا تو کوئی تاریخی انداز لکھتا تھا۔ اسی طرح ہر ادیب کی ایک شخصیت اور باتوں اور مزاج کا انداز تھا۔ ادب تو اپنی جگہ، لیکن ادیبوں کی آپس کی گفتگو کا بھی ایک الگ انداز اور مزہ تھا۔ مجھے اس گفتگو میں بہت لطف آتا تھا۔ ادبی انداز کی گفتگو، ادبی مزاج، ادبی خفتہ کا اظہار ہوتا۔ میں اس وقت بہت محظوظ ہوتا تھا۔ جب میں ادبی نشستوں میں جاتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ یہ لمحات کبھی ختم ہی نہ ہوں۔

میرا ایک ادبی دوست محبوب الٰہی مخمور جس سے میری پہلی ملاقات 1984ء میں ٹوٹ بٹوٹ میٹنگ میں پریس کلب میں ہوئی۔ اس شخص کے خلوص و محبت میں آج تک رتی برابر فرق نہیں آیا۔ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تو محبوب الٰہی سے مل کر ایسا لگا جیسے ہم برسوں سے آشنا ہیں۔ میٹنگ برخاست ہونے کے بعد بھی ہم صدر کے علاقے میں گھومتے پھرتے رہے۔ ہوٹل چائے پی۔ ایک دوسرے سے روابط کے تبادلے کیے اور رخصت ہوتے وقت دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ہم گھر جائیں۔ محبوب الٰہی مخمور سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ کبھی میری اس سے ملاقات ہونہار کے دفتر میں ہو جاتی، کبھی ٹوٹ بٹوٹ کے دفتر میں ہوتی، غرض یہ کہ اکثر میں محبوب الٰہی سے

ملنے اس کے دفتر چلا جاتا۔ کبھی ہم ملاقات کسی مقررہ جگہ کر لیتے۔ اپنی ادبی سرگرمیوں سے متعلق ایک دوسرے کو باخبر رکھتے۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی رسالہ و اخبار ہو جس کا ہمیں نام معلوم نہ ہوا اور ہم نے وہاں لکھنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ہمارا ادبی گروپ بالکل منفرد اور قابلیت پر مشتمل تھا۔ ایسا کوئی ادبی گروپ بچوں کے ادب کے حوالے سے سرگرم نہیں تھا۔

میری پہلی ملاقات جب مصطفیٰ چاند (مصطفیٰ ہاشمی) سے ہوئی۔ یہ شخص جتنا چلبلا اور شرارتی نظر آتا تھا، اتنا ہی پر خلوص اور محبت سے پر تھا۔ پہلے تو مجھے لگتا تھا۔ کہ میری اس سے نہیں بنے گی، لیکن جب قریب ہوئے تو مجھے یہ شخص بہت پر خلوص اور بے لوث نظر آیا۔ شرارتی اور چلبلا ہونے کے علاوہ خلوص و محبت کا پیکر بھی تھا۔ مجھ سے اس کی دوستی گہری ہوتی گئی۔ اکثر ہم ساتھ گھومتے پھرتے۔ اکثر مختلف ادیبوں کے گھروں پر ادبی نشستیں ہوئیں۔ جہاں ہماری ملاقاتیں ہوتیں۔ لکھنے میں بہت تیز تھا۔ اس کی ہر کہانی کا موضوع منفرد ہوتا۔ لکھنے کا انداز بہت حقیقت سے پر تھا۔ اس کا تجربہ اس کی عمر سے زیادہ تھا۔ اپنا معاشرہ ہو، غربت ہو، امارت ہو، مغربی معاشرہ ہو، وہاں کا تہذیب و تمدن ہو اس کی تحریریں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے لکھنے کے معیار نے ہی اسے آج ترقی کی منازل پر پہنچایا۔

سید عبدالعزیز عزمی (مرحوم) سے دوستی کے تجربات بڑے منفرد تھے۔ وہ ایک اچھا ادیب تو تھا ہی، لیکن اس کے مذاق سب سے اچھوتے اور منفرد تھے۔ اس کا مذاق کرنے کا انداز سب سے الگ تھا۔ وہ اپنے مذاق سے حیران و پریشان کر دیتا تھا۔ بہرحال اس سے میری نشستیں اور ملاقاتیں بہت کم رہیں۔ لیکن افسوس کہ وہ شخص اپنی یادیں چھوڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

ابن شہباز خان (جاوید الرحمن خان) بہت اچھا ادیب ہے۔ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو سب سے پہلے میں اس کی خوش خط لکھائی سے متاثر ہوا۔ یار باش آدمی رہا۔ اس کے ساتھ میں نے بہت اچھا وقت گزارا اور ہنوز دوستی برقرار ہے۔ اس کا باتیں کرنے کا انداز مجھے بہت پسند تھا۔ اپنے مخصوص ادبی انداز میں گفتگو کرتا تھا۔ اسی انداز میں مذاق کرتا۔ ابن شہباز جب گفتگو کرتا تو میں بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتا۔ اس کی باتیں سننے میں مجھے بہت مزہ آتا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تھا۔اس کا لکھنے کا انداز بہت اچھا تھا۔یہ شخص ہر موضوع پر لکھ لیتا تھا۔جاسوسی و سسپنس ہو،معاشرتی ہو،تاریخی ہو یا پھر مضمون ہو۔ابن شہباز اچھا صحافی بھی تھا۔مختلف اخبارات و رسائل میں کام بھی کرتا رہا۔پھر اپنا رسالہ بھی نکالا تھا۔ماہ نامہ"لوٹ پوٹ" کے نام سے۔اپنا اخبار بھی شائع کرتا رہا اور اب تک صحافت کے میدان میں ہی ہے۔

علی حسن ساجد بھی میرے ہم عصر دوستوں میں شامل تھا۔اچھا ادیب اور اچھی شخصیت کا مالک تھا۔اسی زمانے میں علی نیوز کاسٹر بھی بن گیا اور پی ٹی وی پر شام پانچ بجے کی خبریں پڑھتا تھا۔مختلف جگہوں میں سفر کرنے لگا۔ادب، کمپیئرنگ، نیوز کاسٹر، پبلک ریلیشنز و یلفیئر، پروگرام ارینج کرنا وغیرہ وغیرہ۔علی حسن ساجد سے میری دوستی آج تک اسی آب و تاب سے زندہ و تابندہ ہے۔

ایک ایسا ادیب بھی تھا اس سے میری قلمی دوستی ہوئی۔زاہد حبیب قریشی جس کا تعلق حیدرآباد سندھ سے تھا۔پہلی بار قلمی دوستی کے کالم میں اس سے تعارف ہوا،لیکن جب خط و کتابت ہوئی تو پتا چلا کہ وہ مجھ سے سینئر ادیب ہے اور پوری ادیب برادری کو جانتا ہے۔اس سے قربت کی وجہ ہمارا ہم خیال ہونا تھا۔وہ بھی میری طرح جاسوسی اور سسپنس لکھا کرتا تھا۔کئی ماہ تک ہم خط و کتابت کے ذریعے الجھے رہے۔پھر ایک بار میرا حیدرآباد جانا ہوا۔تو میں زاہد سے ملنے گیا۔اس کا گھر تلاش کیا۔اور یہ نفس نفیس ملا۔تصاویر کے ذریعے ہم نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔پھر ملاقاتوں سلسلہ چل نکلا۔میں جب بھی حیدرآباد جاتا اور زاہد جب کراچی آتا تو مجھ سے ضرور ملتا تھا۔ہم نے کافی عرصہ ایک ساتھ لکھا۔پھر رفتہ رفتہ زاہد لکھنے کے میدان سے غائب ہو گیا،لیکن میری اس سے آج بھی دوستی ہے۔وہ ایک بہت اچھا ادیب ہے اور اگر وہ اپنے اس فن کو استعمال کرے اور ادب کے میدان میں واپس آئے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔

ایسے بہت سے ادیب تھے جن میں خواجہ وقار احمد، کاوش صدیقی، سعید عباس، مجیب ظفر انوار، ابن آس، نوشاد عادل، خلیل جبار، وغیرہ وغیرہ جن سے میری دوستی رہی،لیکن وہ قربت نہیں ملی جو مذکورہ ادیبوں کے ساتھ رہی۔

لکھنے کا سلسلہ چلتا رہا۔میں جاسوسی کہانیاں اور ناول لکھنے میں ماہر ہو چکا تھا،لیکن پھر میں اس یکسانیت سے بور ہونے لگا۔اور تب میں نے معاشرتی اور متفرق موضوعات کو بھی اپنایا۔اس

میٹرک کر چکا تھا۔انٹر میں تھا۔ایک بار ایسا ہوا کہ میرے گھر محمود شام صاحب کا خط موصول ہوا۔انہوں نے مجھے بلوایا تھا۔میں لوٹ پوٹ کے دفتر پہنچا۔وہاں جا کر پتہ چلا کہ شام صاحب نے لوٹ پوٹ کی ادارت کی ذمہ داری مجھے سونپ دی ہے۔مجھے ادارت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔لیکن شام صاحب نے میری حوصلہ افزائی کی اور میری ہمت بندھائی۔تب میں 1987ء میں لوٹ پوٹ میں بطور معاون ایڈیٹر کے کام کرنے لگا۔جب کام کرنے لگا تو شعبۂ ادارت کے علاوہ تکنیکی شعبہ یعنی چھپائی کے رموز سے بھی آشنا ہوا اور جب شعبۂ کتابت میں گیا تو باقاعدہ کتابت دیکھی۔میں چوں کہ یہ شوق رکھتا تھا۔لہٰذا لوٹ پوٹ کی ادارت کے ساتھ ساتھ کتابت سیکھنے لگا۔میری جستجو دیکھ کر خوشنویس مشتاق صاحب اور ایوب صابر صاحب نے مجھے بطور شاگرد قبول کیا اور بڑے شوق سے کتابت سکھائی۔میں لکھ کر ان سے اصلاح لیتا۔میرا لکھا دیکھ کر میرے استاد حیران ہوتے تھے میں بہت تیزی سے کتابت سیکھ رہا تھا۔

میری کتابت سیکھنے کے عمل کو محمود شام صاحب نے بھی پسند کیا اور حوصلہ افزائی کی اور کچھ ہی عرصہ میں میرا کتابت کا کام لوٹ پوٹ میں بھی نظر آنے لگا۔مجھے کتابت سے اتنا لگاؤ ہوا کہ میں نے ادارت کو ترک کر کے کتابت کو اپنا کر باقاعدہ پیشہ بنالیا۔اس سلسلے میں ہر طرف سے حوصلہ افزائی ملی۔مصطفیٰ ہاشمی جو بچوں کا رسالہ کی ادارت کر رہے تھے۔مجھے اپنے پاس بلا لیا اور کتابت کا کام میرے سپرد کیا۔اس زمانے میں "ان پیج" کمپیوٹر پر نہیں آیا تھا،لہٰذا ہر ایک میٹر بھی ہاتھ سے ہی لکھا جاتا تھا۔میں چوں کہ ہیڈنگ نت نئے انداز میں لکھنے کا شوقین تھا۔اس لیے مجھے سرخیوں کا کام مل گیا۔

کتابت کے شعبہ میں میں بیک وقت کئی اداروں میں کام کرنے لگا۔لوٹ پوٹ، بچوں کا رسالہ، چائلڈ اسٹار، ٹی وی ٹیمپو، سپر اسٹار ڈسٹ، شو بزنس، رابطہ، دوشیزہ، سچی کہانیاں، انتخاب، میگزین، وغیرہ وغیرہ۔کتابت کے حوالے سے جب شوق اور روزگار دونوں میں تقویت ملی تو گھر والے بھی خاصے خوش ہوئے۔معاشی طور پر کمزوری نے میری کتابت کے شعبے میں پیش قدمی کو قبول کیا اور یوں میری اس سرگرمی میں تیزی آتی گئی۔تعلیمی میدان میں میری توجہ میں کمی آگئی۔ویسے تو میں ڈاکٹر بننا چاہتا تھا،لیکن انٹرمیڈیٹ کے دوران میں میری توجہ تعلیم پر سے ہٹنے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

لگی۔ پیشہ ورانہ مصروفیات حد سے زیادہ بڑھ گئیں۔ مجھے پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا، یہاں تک کہ میں انٹر سے آگے نہ بڑھ سکا۔ میں اپنی اس روش کو کیا نام دوں۔ اس کا موجب غربت کو ٹھہراؤں یا..... اپنے آپ کو الزام دوں۔ بہرحال! جو میرے نصیب میں تھا وہ تو ہونا ہی تھا۔

کتابت میں میری مشق اور خداداد صلاحیت نے قبل از وقت مجھے وہ مقام دے دیا جس کا مستحق تھا۔ اس کے پس منظر میں میرے خیر خواہ دوستوں کا بہت عمل دخل تھا۔ بچوں کا ادب کے حوالے سے تقریباً ہر ادارے میں میرا کوئی نہ کوئی دوست نکل آتا تھا۔ جس کے بل بوتے پر مجھے کام مل جاتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مجھے خود میرے دوست بلا کر کام دیتے تھے۔ اپنے ان تمام خیر خواہ دوستوں کے درمیان رہ کر مجھے یہ دنیا جنت سے کم نہ لگی۔ سیکھنے کا عمل بھی جاری تھا۔ کتابت کے حوالے سے میرے استاد ایک سے زیادہ تھے۔ میں جس کے خط سے متاثر ہوتا۔ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا۔ کہیں کچھ لکھا ہوا دیکھتا۔ اس جیسا لکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے علاوہ آرٹ کے حوالے سے نت نئے انداز میں ہیڈنگ بناتا۔ جس کی وجہ سے میری انفرادیت بڑھنے لگی۔

کتابت کے علاوہ اسکیچز بنانا بھی میرا ایک شوق تھا۔ یہ فن مجھے میرے والد صاحب نے سکھایا تھا۔ میرے والد شوقیہ اسکیچز بناتے تھے۔ انہوں نے کبھی اس کام کو پیشہ نہیں بنایا۔ وہ زندگی بھر درزی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ میرا شوق اور میری جستجو کے پیش نظر میرے والد نے مجھے مصوری کے بنیادی نکات بتائے۔ جب پہلی بار میں نے اسکیچ بنایا تو میں خود حیران رہ گیا اور یوں یہ شوق بھی بڑھا۔ پھر میں مختلف لوگوں کے گھر والوں کے دوستوں کے اسکیچز بنانا اور یہ کام میں صرف شوقیہ کرتا۔ اس شعبے میں فرمائشی طور پر بہت پذیرائی ہوئی اور میری مشق نے مجھے ماہر بنا دیا۔ اس دوران میری ملاقات مومن رحیم آرٹسٹ سے ہوئی۔ یہ نوجوان بہت اچھا آرٹسٹ تھا اور دوشیزہ بچی کہانیاں، بچوں کا رسالہ، شوبز نس کے ادارہ میں اسکیچ بناتا تھا۔ میری وہیں اس سے ملاقات ہوئی۔ اس کے کام سے میں بہت متاثر ہوا۔ اس کے کام میں نفاست اور فطرت جھلکتی تھی۔ میں نے اس کے کام کو قریب سے دیکھا اور اس کا انداز بھی اپنایا۔ پھر بھی مومن رحیم ایک بڑا فن کار ہے۔ میں اس جیسا نہیں بن سکا۔ ویسے بھی اس کی اور

میری پریکٹس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسکیچز بنانا اس کا پیشہ بھی تھا اور شوق بھی میں چوں کہ کبھی کبھی کسی فرمائش پر اس کا اسکیچ بنا دیتا تھا۔ میں نے اسکیچز بنانے کے فن کو پیشہ نہیں بنایا۔ صرف کتابت کو ہی بطور پیشہ اپنایا۔

1990ء میں ریڈیو پاکستان سے شائع ہونے والے ماہ نامہ "آہنگ" سے وابستہ ہو گیا۔ وہاں بھی میں کتابت کے شعبہ میں ہی تھا۔ اس زمانے میں معروف ادیب "قمر عباسی" صاحب آہنگ کے چیف ایڈیٹر تھے۔ بہت منفرد اور با اخلاق شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے بھی بچوں کے ادب کے لیے بہت لکھا۔ بہرحال، میں وہاں کتابت کے فرائض انجام دیتا رہا۔ بچوں کے ادب میں لکھنے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا۔ فکرِ معاش نے اس جذبے کو سلانا شروع کر دیا اور یوں میں بچوں کے ادب سے دور ہونے لگا۔ احباب کا اصرار ہوتا رہا اور میں بہت اصرار پر ایک آدھ تحریر لکھ دیتا۔ میرے دوست محبوب الٰہی مخمور نے ماہنامہ "انوکھی کہانیاں" شروع کیا اور اس کی کتابت کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی اور یوں میں انوکھی کہانیاں میں کتابت کرنے لگا، لیکن میرا دوست اصرار کرتا رہا کہ میں کچھ لکھوں کتابت کی معاشی مصروفیت اجازت نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی میرے دوست نے میری پرانی تحاریر کو اپنے رسالے کی زینت بنایا۔ اس کے اس عمل میں یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ کہیں میں گم نام نہ ہو جاؤں۔ میں اپنے دوست کے خلوص و محبت کی قدر کرتا ہوں۔

ریڈیو پاکستان میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد میں نے وہاں سے بھی رخصت لی۔ کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر میں نے وہ ادارہ چھوڑ دیا۔ ویسے تو میں متعدد رسالوں کا کام "کمپوزنگ" پر کر رہا تھا۔ میری مصروفیت میں چنداں فرق نہیں آیا تھا۔ کچھ عرصہ اسی صورت حال میں رہا۔ ذہن میں تھا کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ پھر ایک دن میں نے سوچا کہ کتابت اور آرٹ کے کام کو کمرشل بنیادوں پر کیا جائے..... اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے میں نے پاکستان چوک پر ایک آفس کرائے پر لے کر وہاں "ظفر آرٹس" کے نام سے کتابت اور ڈیزائننگ کا کام شروع کر دیا۔ اس کام میں میرا شوق اور دل چسپی بھی بہت تھی کوئی بھی تخلیقی کام میرے پاس آتا تو میں بڑے شوق اور دل چسپی سے کرتا۔ جب میں اس طرح کام کرنے لگا تو میں اپنے نام سے مقبولیت

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

حاصل کرنے لگا۔ جب لوگ مجھے میرے نام سے ڈھونڈ کر مجھ تک پہنچتے تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔

بچوں کا ادب میں لکھنے کا رجحان بہت کم ہو گیا۔ میرے دوست محبوب الٰہی مخمور، مصطفیٰ ہاشمی، حنیف سحر، علی حسن ساجد وغیرہ مجھے بہت کہتے کہ لکھا کرو، لیکن میری مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں کتابت اور ڈیزائننگ کا کام گھر لا کر بھی کرنے لگا۔ کمرشل کے علاوہ دوستوں کا کام بھی کرتا۔ میرے بیشتر ہم عصر دوستوں نے اپنے رسالے بھی شائع کر لیے۔ بہت سے دوست مختلف رسائل وجرائد میں ملازمت کرتے تھے اور سب یہ چاہتے تھے کہ میں ان کے لیے کام کروں، لیکن میں ننھی سی جان اور دوستوں کی محبت بیش بہا تھی۔ ایسی پرخلوص محبت مجھے ادیبوں سے ملی۔ نہ جھوٹ فریب نہ سیاست۔ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ میرے سارے دوست مجھ سے ملنے پاکستان چوک میرے آفس آتے تھے۔ میری مصروفیت زیادہ تھی، لہٰذا میں ان سب سے ملنے نہیں جا پاتا تھا۔ اس پر بھی انھیں کوئی شکایت نہیں تھی وہ سب خود ہی مجھ سے ملنے آ جاتے تھے۔ اس بہانے مجھے ادیبوں کی سرگرمیوں کی خبریں بھی ملتی رہتی تھیں۔ میں نے کتابت کے فن میں اپنی شناخت بنائی اور مختلف خط ایجاد کیے اور ان کے نام رکھے۔ میرے یہ خطوط (Font) بہت مشہور ہوئے لوگ میرے ان (Font) کو بہت پسند کرنے لگے۔ خوش نویسی کے حوالے سے فارسی کا شعر ہے ؎

گر می چاہی تو خوش نویس
می نویس وی نویس وی نویس

لہٰذا میں نے اتنا لکھا کہ مجھے خود بھی یاد نہیں۔ میرا کام اخبارات ورسائل وجرائد کے علاوہ مختلف اشتہارات اور مصنوعات میں بھی نظر آنے لگا۔ یہ میری خداداد صلاحیت تھی کہ میں نے اس فنی شعبے میں جدت پیدا کی اور میری اس جدت کو احباب نے بہت پذیرائی دی۔ خطاطی کے علاوہ ڈیزائننگ اور اسکیچ کا کام بھی کیا، لیکن میرے پاس خطاطی کا کام زیادہ تھا۔ پوری ادیب برادری مجھے جانتی تھی۔ کسی سے کم، کسی سے زیادہ ملاقات سبھی سے تھی۔

چوں کہ میں بنیادی طور پر ایک فن کار تھا اور فن کار طبعی طور پر کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل ہوتا ہے حساس ہوتا ہے۔ مثبت سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ شاعر بنتا نہیں،

شاعر پیدا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح فن کار پیدا ہوتا ہے اور فن کسی کی میراث نہیں۔ فن کسی ایک شعبے کا نام نہیں۔ ایک فن کار جب معاشرتی ناآسودہ حالات کو دیکھتا ہے۔ انھیں اپنے نوک قلم سے ادب کے شعبے میں جلوہ گر کرتا ہے۔ کینوس پر اپنے رنگوں اور برش سے عکاسی کرتا ہے۔ اداکار اپنے فن سے معاشرہ کی عکاسی ڈرامہ اور فلم کے ذریعے کرتا ہے۔

لیکن فن کار تو فن کار ہوتا ہے۔ ہم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ دراصل فن کار بنیادی طور پر انتہائی حساس ہوتا ہے اور یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہوتی ہے، چوں کہ یہ اللہ کا تحفہ ہوتا ہے اور ہر کسی کو عطا نہیں ہوتا۔ گنے چنے مخصوص لوگوں کو عطا ہوتا ہے اور جنھیں عطا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے انسانیت کی بھلائی کے حوالے سے کام لینا چاہتا ہے۔ وسیع النظری یعنی سوچ کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ بہت دور اندیش ہوتا ہے۔ دوسرے کے درد کو اپنے اندر محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہ فن کار اپنی اسی صلاحیت کی بنیاد پر اپنے فن پارے میں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور یہ فن پارہ مصوری، خطاطی، تحریر، ڈراما یا فلم کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

فن کسی کی میراث نہیں، لیکن یہ پیدائشی ہوتا ہے۔ کسی دنیاوی مدرسے سے حاصل نہیں ہو سکتا، البتہ اس خداداد صلاحیت کو اس دنیا میں پالش کیا جا سکتا ہے۔ فن کار ہزاروں میں ایک ہوتا ہے۔ ہمیں فن کار کی عزت اور قدر کرنا چاہیے، کیوں کہ فن کار اپنے فن کے ذریعے معاشرے کے مسائل اجاگر کرتا ہے۔ فن کار دلیر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے خوف کے باوجود معاشرتی مسائل اجاگر کرتا ہے۔ وہ کام نفع نقصان سے بالاتر ہو کر کرتا ہے۔

میرے اندر بھی ایک فن کار ہے، جو مختلف حوالے سے مجھے کچوکے دیتا ہے کہ انسانیت کی بھلائی کے لیے کچھ کرو۔ اپنے فن کار کو جگاؤ۔ میں نے بچوں کے ادب کے حوالے سے تقریباً سنیاس لے لیا تھا اور فن خطاطی میں اپنے آپ کو غرق کر دیا تھا۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، اوڑھنا بچھونا صرف خطاطی تھا۔ یہ فن میرے فن کارانہ جذبے کی تقویت کا باعث بھی تھا اور میرا ذریعہ معاش بھی تھا۔

اس کے باوجود کہ میں بچوں کے ادب سے بے عمل ہو گیا تھا۔ پھر بھی میرے ادیب دوست میرا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری وساری تھا۔ مختلف پروگرامز میں شرکت اور

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

دیگر ادبی سرگرمیاں اپنی آب و تاب سے جاری تھیں۔ خطاطی کے حوالے سے بھی میری بڑی قدر و منزلت تھی۔ یہ ایک ایسا فن تھا کہ اس کے بغیر کبھی ادب نامکمل تھا۔ ادبی تخلیق کے بعد اس کی کتابت کا مرحلہ ہوتا تھا۔ کتابت کے بعد اس کی پرنٹنگ یعنی چھپائی ہوتی جس کے بعد اشاعت کا مرحلہ مکمل ہوتا۔ لہٰذا فن خطاطی کے ذریعے بھی میرا بچوں کے ادب اور ادیبوں سے رابطہ رہا۔

خطاطی، مصوری اور ڈیزائنگ کا دور چلتا رہا۔ اسی اثناء میں کئی سال بیت گئے۔ وقت کا پنچھی اُڑتا رہا اور یوں ایک دن 22 اپریل 1998ء کو بچوں کے ادیب ظفر احمد خاں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ میری زوجہ مہتاب جہاں گو کہ ادبی ذوق نہیں رکھتی تھی، لیکن میری سرگرمیوں سے بہت خوش ہوتی تھی۔ میری تحاریر بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی اور میری خطاطی اور مصوری بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ میری زوجہ گریجویٹ تھی اور بہت سنجیدہ طبع اور امور خانہ داری کی ماہر، تفریح کی دلدادہ، سیاست اور فیشن سے دور بھاگتی تھی۔ ہم دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بہت تھی۔ نوک جھوک اور چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی۔ غصہ اور تلخ کلامی بھی ہو جاتی تھی۔ اگر یہ تمام لوازمات زندگی میں نہ ہوں تو جینے کا مزہ نہیں آتا۔ ایک ہی موضوع پر زندگی یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ سب رنگ کی مٹھائیاں ضروری ہیں۔ ہر ایک کا اپنا مخصوص ذائقہ ہے۔ یہ سب محبت کے روپ ہیں اور محبت کا یہ سلسلہ اللہ اور اس کی مخلوق سے بڑا دلچسپ ہے۔ جسے اپنے رب سے محبت ہے اسے پھر اس کی مخلوق سے بھی لازمی محبت ہو گی۔ جسے مخلوق سے محبت نہیں تو پھر اس کی رب سے محبت میں بھی شک ہے۔

اس دنیا میں جتنی ایجادات ہوئی ہیں وہ تمام موجدوں کی انسان سے محبت کا نتیجہ ہیں۔ دنیا کی ہر ایجاد انسان کی سہولت کے لیے ہے۔ اور اس میں سب سے مقدم چیز سائنسدان کی انسان سے محبت ہے اور اس حقیقت کو آپ اپنے چہار اطراف دیکھ سکتے ہیں اور آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ موجد کی نسبت آنے والے انسان نے اس ایجاد کا فائدہ اٹھایا اور جب تک انسان اس ایجاد سے فائدہ اٹھاتا رہے گا اس کا ثواب اس کے اکاؤنٹ میں جاتا رہے گا۔ ادیب بھی جو کچھ لکھتا ہے وہ اس کی تخلیق کہلاتی ہے جو کہ انسان کے لیے اصلاحی پہلو رکھتی ہے۔ اسے سبق دیتی ہے اور ٹھوکر کھانے سے پہلے خبردار کر دیتی ہے۔ کہانیوں، افسانوں،

شاعری، فلموں اور ڈراموں میں ہمارے گرد و پیش کے واقعات قلم بند کیے جاتے ہیں۔ جسے انسان دماغی طور پر قبول کرتا ہے۔ کسی بھی کہانی میں برائی اور نیکی دونوں پیش کی جاتی ہیں۔ معاشرتی جرائم اور جرائم پیشہ افراد کے کردار مع طلیہ پیش کیے جاتے ہیں۔ پھر ایک نیک شخص جو کہانی کا ہیرو ہوتا ہے۔ وہ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے اور ہمیں تقریباً ہر کہانی سے ایک سبق ملتا ہے، لیکن اب یہ اور بات ہے کہ کوئی منفی سوچ کا حامل شخص اس کہانی میں سے جرائم کے طریقے ہی سیکھتا ہے اور جرائم کی شاہراہ پر چل پڑتا ہے۔ نفس اور ضمیر کی جنگ تو ہر شخص کے اندر ہوتی ہے۔ دنیا میں انسان سے انسان کا رشتہ اور برتاؤ انسانیت کے درجے پر فائز کرتا ہے اور پھر انسانیت کے درجے پر فائز ہوئے بغیر مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ اس دنیا میں جتنے بھی شعبہ ہائے زندگی ہیں۔ تقریباً سبھی لوگ اپنے اپنے شعبے میں انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں اور اسی جذبے کے تحت ویلفیئر کے ادارے دنیا بھر میں کام کر رہے ہیں اور یہ ادارے عوامی اعتماد حاصل کیے بغیر کام نہیں کر سکتے۔ جب تک لوگوں کو یہ اعتماد نہ ہو جائے کہ واقعی یہ انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ تب تک وہ مالی اعانت نہیں کرتے۔

یہ بھی انسانیت کی خدمت ہے کہ معاشرتی برائیاں شعبۂ ادب میں اُجاگر کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچا کر انہیں برائی سے بچنے کا سبق دیں۔ فلم، ڈرامے، اسٹیج شو، تھیٹر ان میں ناظرین کو محظوظ کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو ضرور مقدم رکھا جاتا ہے۔ ایک ادیب بہت وسیع النظر ہوتا ہے۔ وہ اپنے چہار اطراف معاشرہ پہ نظر رکھتا ہے۔

بہ حیثیت بچوں کا ادیب..... سب سے پہلے تو یہ کہ مجھے بچوں سے بہت محبت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی اس دور سے گزر کر اس مقام پر پہنچا ہوں۔ میں نے اپنے بچپن میں کیا کیا شرارتیں کیں، کیا سرگرمیاں کیں، مجھے کیا مسائل درپیش ہوئے۔ کس قسم کے سوالات ذہن میں آتے اور ان کے جوابات پانے کے لیے میں کیا کیا جستجو کرتا تھا۔ بچوں کے اذہان کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے شعور و آگہی کے لیے ایسی تحاریر لکھنے کی کوشش کرتا تھا کہ جس کے پڑھنے سے وہ مثبت پیغام ان تک پہنچ جائے اور یہی میرے فن کا قطعی حاصل تھا۔

میری شادی کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا۔ میں ان دنوں اپنے اندر ایک تشنگی محسوس کر رہا تھا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ایک انجانی تشنگی، شاید اس تشنگی کی وجہ یہ تھی کہ بچوں کے حوالے سے میں بالکل لاتعلق ہو گیا تھا۔ میرے اندر سویا ہوا ادیب بہت بے چین تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور جذبہ تھا جس کے سبب میں بے چینی اور بے کلی کا شکار تھا اور وہ جذبہ تھا۔ دکھی انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا۔ میں ہنوز اس "انجانی تشنگی" میں مبتلا ہی تھا کہ اللہ رب العزت نے میرا یہ مسئلہ حل کرتے ہوئے میری رہنمائی فرمادی۔ ایک دن اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک اشتہار پر نظر پڑتے ہی دماغ میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ وہ اشتہار تھا، ہومیو پیتھک کالج میں "داخلے جاری ہیں" کا بس پھر کیا تھا۔

میں اگلے ہی دن اپنے کوائف کے ساتھ کالج پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے مجھے داخلہ مل گیا اس لمحے مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہی اس انجانی تشنگی کا حل تھا اور پھر ہوا بھی یہی۔ میری تشنگی یکسر دور ہو گئی اور مجھے ایک نئی جستجو کے لیے راہ مل گئی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی زوجہ محترمہ اور احباب سے مشورہ کیا تو بہت حوصلہ افزائی ملی اور یوں میں پوری تن دہی سے ہومیو پیتھی کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ ایک طرف میری شادی شدہ زندگی اور اس کی ضروریات تھیں۔ پھر تعلیمی اخراجات تھے، جنہیں پورا کرنے کی غرض سے میں شعبۂ خطاطی میں بھی سرگرم رہا اور ہومیو پیتھی کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔ اس نئے شعبہ میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد میری جستجو مزید بڑھ گئی، لہٰذا میں کالج کی کتب کے علاوہ غیر نصابی طور پر ہومیو پیتھی کی مزید کتب اور ادویات لے آیا اور یوں میں نے پہلے ہی سال تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر پر ہی ہومیو پیتھک پریکٹس بھی شروع کر دی۔ میرے ہمسائے اور احباب میرے پاس علاج کی غرض سے آنے لگے۔ میرے اندر خوشی طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ بے کلی کی کیفیت ختم ہو چکی تھی۔ چند دنوں میں ہی اس پروردگار نے بھی تصدیق کر دی کہ میں مستقبل میں لوگوں کی مسیحائی کروں گا۔ دراصل ان ہی دنوں چند ایک پیچیدہ کیس بھی میرے پاس آ گئے۔ میں تھوڑا سا گھبرا جاتا تھا، لیکن میں نے ہمت اور صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان مریضوں کا علاج کیا اور حیرت انگیز طور پر اس مالک دو جہاں نے انہیں شفاء سے ہم کنار کیا۔ ان مریضوں کی شفایابیوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح طب کے شعبے میں میری دل چسپی مزید بڑھ گئی۔ میں نے معالجہ اور مطالعہ میں مزید اضافہ کر دیا۔ ان شفایاب مریضوں کے طفیل مزید مریضوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میرے گھر

پر مریضوں کی آمد و رفت تیز ہونے لگی۔

21 اکتوبر 1999ء کو میرے یہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ میں نے اس کا نام جواد احمد رکھا۔ بیٹے کی ولادت نے تو جیسے میری قسمت کا دروازہ ہی کھول دیا۔ میرا بیٹا بہت بھاگوان ثابت ہوا۔ میرے گھر مریضوں کی آمد و رفت رہنے لگی۔ لوگ مجھے بہت ذہین ڈاکٹر گمان کرنے لگے۔ یہ قدر و منزلت اس باری تعالیٰ کا عطیہ تھی۔ وہ جسے چاہے عزت دی۔ میں اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت شکر بجالاتا کہ وہ رب العزت بھی یہی چاہتا ہے کہ مستقبل میں اس کی مخلوق کی مسیحائی کروں۔ میں نے قبل از وقت ہی بڑے ڈاکٹرز کی کتب پڑھ ڈالیں، جو کہ نصابی کتب سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ میں پہلے سال بھی امتیازی نمبروں سے پاس ہوا۔

میری والدہ اور دیگر اہل خانہ میری اس سرگرمی سے خاصے خوش اور مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ میری والدہ میری خوشی کو دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ وہ دن رات میری کامیابی کے لیے دعائیں کرتیں۔ ایک دل جب میں سو کر اٹھا تو میری والدہ نے مجھے ایک تحفہ دیا اور وہ تحفہ تھا "کھرل" جس میں دوا پیستے اور کمپاؤنڈ بناتے ہیں، لیکن وہ بہت خوب صورت سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ وہ تحفہ میری ماں کے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔ مجھے بھی ان کا وہ تحفہ بہت پسند آیا، جو کہ آج تک میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔

2002ء میں میرے دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ جس کا نام نصر احمد رکھا۔ میرے اس دوسرے بیٹے نے میری کامیابی پر مہر لگا کر تصدیق کر دی۔ میرا ہومیو پیتھی کا ڈپلومہ مکمل ہو گیا۔ اس عرصے میں میرے مریضوں کی تعداد اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ اب میرا باقاعدہ مطب کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ لہٰذا 2003ء میں میں نے باقاعدہ عقب جیکب لائن کے علاقے میں مطب شروع کیا۔ اس زمانے میں میں 5 روپے یومیہ کی دوا دیتا تھا۔ صرف ایک سال میں ہی میرے مریضوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مجھے چھوٹا مطب ترک کر کے بڑا مطب کرنا پڑا۔

لیکن اسی سال 2003ء میں میری ماں ہم سب کو سوگوار کر گئی۔ والدہ کی وفات کا دکھ میرے لیے ناقابل برداشت تھا، لیکن اس ربّ کائنات نے مجھے صبر دیا اور مریضوں کی خدمت نے مجھے ایک نیا حوصلہ دیا۔ میں آج جس مقام پر بھی تھا اپنی والدہ کی محبت اور دعاؤں کے طفیل

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تھا۔ساری زندگی والدہ نے میری مثبت سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔غربت کے باوجود میری مدد کی اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی مجھے نا اُمید نہیں ہونے دیا۔آج میں جس قابل بھی ہوں اپنی ماں کی بدولت۔میرے والد بہت محنتی اور نیک طبیعت انسان تھے۔زندگی بھر سخت محنت کرکے اولاد کی پرورش کی۔خود نا خواندہ تھے،لیکن اپنی تمام اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔میرے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بننے پر میرے والد بہت خوش تھے۔ان کا چہرہ دیکھ کر ایسا لگتا کہ جیسے انہیں ان کی محنت کا ثمر مل گیا۔وہ اپنے تمام دوستوں کو بڑے فخر سے بتاتے کہ میرا بڑا بیٹا ڈاکٹر بن گیا ہے۔بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ میں بہت شفا بھی دی ہے۔پھر یوں ہوا کہ خطاطی کا کام اور رات کو چند گھنٹے مطب کرنا میری روزمرہ کی مصروفیت بن گئی۔مطالعہ اور جستجو کا عمل جاری و ساری تھا۔مجھے مشکل ترین امراض پر کام کرنا اچھا لگتا تھا اور جب وہ مریض میرے وسیلے سے شفا یاب ہوتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔خطاطی کا کام رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔اس کی وجہ کمپیوٹر کی ترویج تھی۔اب خطاطی کا کام کمپیوٹر پر بھی ہونے لگا۔میں مستقل مزاجی سے کام کرتا رہا اور جتنا کام بھی ملتا صبر شکر سے کرلیتا۔بہ حیثیت طبیب میری قدرومنزلت بہت بڑھ گئی تھی۔اب شہر کے دور دراز علاقوں سے بھی میرے پاس مریض آنے لگے،چوں کہ ادبی حلقہ میں اچھی شہرت کے باعث اور دوستوں کی حوصلہ افزائی نے مجھے ادیب ہونے کے ساتھ اچھا ڈاکٹر بھی بنادیا۔

itsurdu.blogspot.com

ہومیو پیتھک پریکٹس کرتے ہوئے مجھے چند سال گزرے کہ مجھے دیگر علوم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا اور یوں میں نے مطالعہ شروع کردیا۔ہومیو پیتھی کے علاوہ میں نے ریڈیس تھیسیا (پنڈولم سائنس) ریکی ،ایکوپریشر ،مائنڈ سائنس ،ہپناٹزم ،ٹیلی پیتھی ، سائیکو تھراپی ، علم نفسیات حاصل کیے اور یہ تمام علوم طب کے شعبہ میں میرے معاون تھے۔میں امراض کی تشخیص اور علاج میں ان علوم سے بھی مدد لیتا ہوں۔میں نے ان علوم کے حصول پر کبھی غرور نہیں کیا۔میری طبیعت بڑی فقیرانہ ہے۔میں نمود ونمائش پسند نہیں کرتا۔اسراف پسند نہیں کرتا۔لوگ مجھ سے مل کر میری اپنائیت والی طبیعت سے متاثر ہوتے ہیں۔جو شخص مجھ سے ایک بار مل لیتا ہے وہ زندگی بھر کے لیے میرا دوست بن جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میرے دوستوں کی فہرست بہت طویل ہے۔میرے اسکول کے زمانے کے دوست آج تک میرے

ساتھ ہیں۔پھر میرے ادبی دوست اور طب کے حوالے سے بننے والے دوست۔غرض یہ کہ میں خود نہیں جانتا کہ میرے کتنے دوست ہیں۔

میرے دونوں بچے پرائمری اور سیکنڈری اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں۔میرے دونوں بچوں میں فن کارانہ صلاحیتیں ہیں،جو کہ تراش خراش کی متقاضی ہیں۔2011ء میں ،میں نے خطاطی کے کام کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی مکمل توجہ صرف طب کی طرف مبذول کرلی۔میری طب اور علوم کی جستجو بھی جاری ہے۔میں ابھی مزید علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔اب دیکھتے ہیں کہ آنے والی زندگی میں کون کون سے علوم میرے منتظر ہیں۔

ایک بار میں نے اپنے دوست محبوب الٰہی مخمور کو فون کیا اور مدعا بیان کیا کہ آیا میں صحیح فیصلہ کرنے جارہا ہوں یا نہیں۔محبوب الٰہی نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ میں ہومیو پیتھک ڈپلومہ ضرور کروں۔میں خلفشار کا شکار ہورہا تھا کہ کیا کروں۔تب میں اس مقصد کے تحت محبوب الٰہی کے دفتر پہنچ گیا۔

”یار محبوب اس فیصلہ نہیں کرپارہا ہوں کہ ہومیو پیتھک ڈپلومہ کروں یا نہیں،اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔تم مشورہ دو......کیا کروں؟“میں نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

”تم ڈپلومہ ضرور کرو۔کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم میں ذہانت وصلاحیت ہے۔مجھے لگتا ہے کہ تم ایک اچھے ڈاکٹر ثابت ہوگے۔کیوں کہ تم بہت حساس طبیعت کے حامل ہو۔“محبوب الٰہی نے کہا۔

”لیکن میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں میرا وقت اور روپے ضائع نہ ہوجائیں۔“میں نے کہا۔

”ارے نہیں! تم پہلی فرصت میں داخلہ لے لو اور یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔میں تمہارے ساتھ ہوں۔اگر تم کہو تو میں کالج تمہارے ساتھ چلوں گا اور تمہارے داخلے میں مدد کروں گا۔“محبوب نے گرمجوشی سے کہا۔

محبوب الٰہی کی بات سن کر میں قدرے مطمئن ہوا اور فیصلہ کرنے قابل بھی ہوگیا۔میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ ہومیو پیتھک ڈپلومہ ضرور کروں گا۔محبوب الٰہی نے اس بار بھی سچے دوست ہونے کا حق ادا کردیا اور میری اتنی حوصلہ افزائی کی کہ میرے ذہن کے تمام خدشات جل کر خاک

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہو گئے۔ اگلے دن میں اور محبوب الٰہی کالج پہنچ گئے۔

زندگی ہنوز گذر رہی ہے اور میری آپ بیتی میں اضافہ کر رہی ہے۔ میری عمر 2013ء تک 43 سال ہو چکی ہے اور اب تک کی آپ بیتی حاضر خدمت ہے۔ آنے والی زندگی میں کیا حالات و واقعات درپیش ہوں گے۔ کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ یہ آپ بیتی لکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا، کیوں کہ اپنی معروفیات میں سے وقت نکال کر لکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس آپ بیتی کے لکھوانے میں ایک شخص کا بہت بڑا ہاتھ ہے اور وہ ہے نوشاد عادل ...... یہ میرا بہت پیارا قلم کار دوست ہے، جس کی محبت بھری فرمائش میں رد نہ کر سکا۔ اس شخص نے پیار کے ہنٹر مار مار کے یہ آپ بیتی لکھوا کر ہی دم لیا۔ میری آپ بیتی آپ نہیں پڑھ سکتے تھے اگر نوشاد عادل نہیں ہوتا۔ اس موقع پر میں اپنے اس دوست کا خاص طور سے ذکر کروں گا، کیوں کہ پچھلے اوراق میں اس کا ذکر نہ کر سکا۔ نوشاد عادل ایک باصلاحیت نوجوان ادیب ہے۔ یہ میرے سامنے ادبی دنیا میں وارد ہوا۔ اس نے بہت کم وقت میں اچھی شہرت حاصل کی۔ بچوں کے ادب میں اس کی تخلیقات قابل قدر ہیں اور بچوں کے لیے دل چسپی کا سامان ہیں۔ اس کی تحاریر قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔

اس کے علاوہ موصوف ڈراما نگار بھی بن چکا ہے۔ اس کے چند ڈرامے مختلف ٹی وی چینلز پر آ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ موصوف بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے بہت کام کر رہا ہے، جیسا کہ پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ میں بحیثیت سینئر نائب صدر اس کی خدمات آپ کے سامنے ہیں۔

جب میں بچوں کے ادب سے وابستہ ہوا تھا۔ اس دور میں نوجوان قلم کاروں میں ادبی تنظیمیں بنانے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس وقت میرے دوست محبوب الٰہی مخمور نے "علامہ اقبال رائٹرز ایسوسی ایشن" بنائی اور اس کے تحت بہت پروگرام کیے۔ جس کی رپورٹ مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہوتی تھی۔ وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا اور بہت سے لوگوں کا "بچوں کے ادب کے فروغ" کا شوق زندگی کی دیگر مصروفیات کی نذر ہو گیا، لیکن محبوب الٰہی مخمور کا یہ جذبہ اب تک جاری ہے۔ پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ کی صورت ہیں۔

ماضی میں جو ادبی تنظیمیں بچوں کا ادب کے حوالے سے بنائی گئی تھیں۔ ان میں نوعمر ادیبوں کا ایک

نیا جوش ولولہ تھا، جو کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماند پڑ گیا۔ اب زیادہ تر ادیب اپنی اپنی مصروفیات کا شکار ہو گئے۔ اب چوں کہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ پرنٹ میڈیا پر لوگوں کا رجحان بھی کم ہے۔ ایسی صورت حال میں بچوں کے ادب کے فروغ کے لیے کام کرنا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ ایسی صورت حال کے باوجود "پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ" بچوں کے فروغ ادب کے لیے جس تن دہی سے کام کر رہی ہے، شاید ہی کوئی تنظیم اس طرح کام کر رہی ہو۔ اب معاملہ بچوں کا ہے۔ یہ مخلوق چوں کہ مستقبل کے معمار کہلاتے ہیں، لہٰذا ان کے مستقبل کے حوالے سے "ادب کے فروغ" کے لیے کسی چٹانی حوصلہ مند شخصیات کی ضرورت تھی۔ اللہ رب العزت نے اس حساس معاملے کے لیے جن شخصیات کو چنا، وہ واقعی اس کے اہل ہیں۔ یہ بھاری ذمہ داری ایسے ہی اشخاص کے کاندھوں پر ہونی چاہیے۔

پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ نے بچوں کے فروغ ادب کے لیے اب تک جو کام کیا ہو قابل ستائش ہے۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے ادیبوں کے اعزاز میں استقبالیہ دینا۔ پہلی بار گائیڈ کی جانب سے حیدرآباد میں دو ادیبوں عارف شین روحیلہ اور غلام حسین میمن کے اعزاز میں استقبالیہ دیا گیا۔ ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی ضروری ہے، کیوں کہ ادب کے فروغ کی ذمہ داری ادیبوں کے کاندھوں پر ہی ہے۔ اگر چند افراد باہم مل کر یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ادیبوں کو فراہم کریں تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ اس کے علاوہ گائیڈ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ادیبوں کی تحریریں شائع ہوں۔ ویسے تو سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ادیب ہیں۔ اس کے علاوہ ادیبوں کے ناول اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ہے۔ گائیڈ کے تحت مشہور ادیبوں کی کتابیں اور ناول شائع کر کے ان کی تقریب رونمائی کرانا......

میں 1984ء میں شعبۂ بچوں کا ادب میں وارد ہوا۔ اسکول لائف سے ہی ادبی ذوق کے حامل تھا۔ چند سال میں ہی ادبی حلقوں میں پہچانا جانا لگا۔ میں نے بچوں کا ادب کے حوالے سے معاشرتی، جاسوسی، سسپنس اور مزاح میں طبع آزمائی کی اور خوب نام پیدا کیا۔ پاکستان بھر کے تقریباً تمام اخبارات و رسائل و جرائد میں لکھا۔

ادب کے حوالے سے تین رائٹرز ایوارڈ ملے۔ جس میں دو ایوارڈ دو ناولوں پر نیشنل بک

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

فاؤنڈیشن حکومت پاکستان کی جانب سے دیے گئے۔ ادب سے وابستگی ہنوز جاری وساری ہے۔

1988ء میں شعیب فن خطاطی کا آغاز کیا اور جوش جنون نے جلد ہی اس شعبہ میں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ میرا کام دیکھ کر احباب انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ اپنے اس شوق کو ذریعہ معاش بھی بنایا اور یوں کئی اخبارات ورسائل وجرائد میں کام کیا۔ میرا کام آپ کے نام سے جانا جانے لگا، یہاں تک کہ کئی ٹی وی چینلز پر بھی اپنے جوہر دکھائے۔ فن خطاطی کے حوالے سے دو ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔

1999ء میں شعبہ طب اختیار کیا اور ہومیو پیتھک ڈپلومہ کر کے مسیحائی کی داغ بیل ڈالی۔ میرے خلوص اور شفقت نے اس شعبہ میں بھی عزت افزائی کی اور یوں شفایابیوں کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔ طب کے حوالے سے میرے مضامین اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ متعدد جہتوں کا مسافر محو سفر ہے۔ نہ جانے اس میں کتنے جوہر پوشیدہ ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محمّد ندیم اختر

لیہ سے تعلق رکھنے والے ایک سیدھے سادے سچ لکھنے، سچ بولنے اور سچ سننے والے سچے ادیب کی سچی کہانی، جنھیں بچپن ہی سے مطالعہ کا شغف تھا۔ وقت کے ساتھ شوق بھی جوان ہوتا چلا گیا۔ ادب کی محبت سے سرشار ہو کر وہ وادیِ ادب میں آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ راستے کی اونچ نیچ بھی اس کی راہ مسدود نہ کر سکی۔ دوستوں کی عزت کرنے والے لائق عزت۔

خوب صورت دل کے مالک ندیم اختر کی سیدھی سچی داستان

---

itsurdu.blogspot.com

زندگی میں حالات و واقعات انسان کو بہت کچھ سکھاتے ہیں اور وہی لوگ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں جو لوگ ان حالات و واقعات سے سیکھ کے لیے لائحہ عمل بناتے ہیں۔ زندگی گزارنے کا مقصد بناتے ہیں، تاکہ ان مقاصد کو حاصل کر کے وہ لوگ اس منزل تک جا پہنچیں جس منزل کا خواب وہ بچپن سے دیکھتے آتے ہیں جیسے کہ وہ اس دنیا میں نمایاں نظر آئیں، لوگ عزت کریں، معاشرے میں انھیں نمایاں مقام دیا جائے وغیرہ وغیرہ اور جو لوگ مقاصد کا تعین نہیں کرتے تو اس مطلب وہ لوگ بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ بے مقصد زندگی تو جانور بھی گزارتے ہیں۔ میرے بھی کچھ خواب تھے، جنھیں میں نے ایک لائحہ عمل کے ذریعے پورا کیا اور آج میرے پاس باعزت نوکری کے ساتھ خوب صورت گھر، میرا خاندان اور خوش گوار شادی شدہ زندگی ہے۔

شاید زندگی میں برے حالات نہ آتے تو میں بھی اچھے حالات سے نہ گزر رہا ہوتا۔ یہ وہی برے حالات تھے جنھوں نے مجھے جینا سکھایا اور پھر میں زندگی کو ایک لائحہ عمل کے ذریعے گزارنے کا فیصلہ کیا۔ امید ہے کہ اگلے صفحات میں ان حالات و واقعات کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محمد ندیم اختر کا کل اثاثہ اس کے ابوجان محمد اصغر (ریٹائرڈ حوالدار ہیں آرمی سے) امی جان کوثر پروین، چھوٹا بھائی شکیل اختر، دو بہنیں شکیلہ کوثر اور نبیلہ کوثر، زوجہ محترمہ رضوانہ مصطفیٰ اور ندیم اختر کی گڑیا بیٹی عبیرہ ندیم، گھر میں بکھری ہوئی کتابیں، پرانے خطوط کی فائلیں، اخبارات، رسائل اور رسائل میں چھپی ہوئی محمد ندیم اختر کی کہانیاں ہیں۔

مجھے اتنا تو یاد نہیں کہ پہلی بار چلنا کب شروع کیا، کب بولنا شروع کیا، کب پہلا لفظ بولا، کب توتلے الفاظ میں امی یا ابو کہا اور نہ یہ یاد ہے کہ کب پہلی بار قلم اپنے ہاتھ میں پکڑا اور کسی کاغذ، کسی کاپی، کسی کتاب پر کوئی لکیر کھینچی۔ کچھ یاد نہیں مجھے، بس اتنا یاد ہے کہ امی جان کی آغوش میں روتا کب تھا، ابو کے سامنے ضد کب کرتا تھا اور اتنا بھی یاد ہے کہ ابو اپنے ہاتھ سے قلم پکڑ کر مجھے تختی پر لکھنا سکھایا کرتے اور گھر میں آنے والے اخبار جہاں سے کبھی کبھی میری ضد سے مجبور ہو کر مجھے اخبار جہاں میں چھپنے والی کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہم نوشہرہ کینٹ میں تھے، کیوں کہ ابوجان (محمد اصغر) آرمی میں تھے، میری پیدائش 6 جولائی 1979 کو جمعۃ المبارک کی صبح ضلع لیہ (پنجاب) کے ایک گاؤں چک نمبر 152 ٹی ڈی اے میں ہوئی، جہاں میرے ننھیال بستے تھے۔ دادا جان کا گھر فیصل آباد سے آگے چک جھمرہ کے نزدیکی گاؤں ڈیڑھ میں تھا، دیکھا تو میں نے نہیں ہوا تھا صرف سنا تھا کہ ہمارا آبائی گھر یہاں پر ہے۔ لیکن امی جان کی شادی کے بعد میری سوتیلی دادی سے آئے دن کے جھگڑوں کی وجہ سے ابوجان اور امی جان کو شادی کے کوئی ایک سال بعد ہی یہ گھر چھوڑنا پڑا تھا اور وہ گھر چھوڑنے کے بعد ابوجان امی کو لے کر میرے ننھیال آگئے۔ انھیں ننھیال چھوڑ کر وہ واپس نوشہرہ چلے گئے اور پھر کچھ عرصہ بعد امی جان بھی نوشہرہ میں آرمی کی طرف الاٹ کیے گئے ایک کوارٹر میں چلی گئیں۔

میں پانچ سال تک ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ امی ابو اور ننھیال کو کچھ زیادہ ہی لاڈلا رہا اور یہ لاڈلا پن پندرہ سال رہا۔ ویسے تو مجھ سے پانچ سال بعد میری چھوٹی بہن شکیلہ پیدا ہوئی اور اس کے تین سال بعد نبیلہ کا وجود اس دنیا میں آیا اور 1992ء میں ابوجان کی ریٹائرمنٹ کے بعد 1994ء میں شکیل اختر پیدا ہوا۔

ہاں تو میں اپنے بچپن کی بات کر رہا تھا۔ مجھے آج بھی اپنے اسکول کا پہلا دن یاد ہے، جب ابوجان مجھے نوشہرہ کینٹ میں موجود گورنمنٹ پرائمری بوائز اسکول میں چھوڑنے گئے۔ ابوجان مجھے کلاس میں بٹھا کر واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے اور جب وہ گھر پہنچے تو میں ان سے پہلے ہی گھر میں پہنچ چکا تھا اور فیڈر ہاتھ میں پکڑے امی جان کی گود میں لیٹا ان کی گھتیں سمیٹ رہا تھا۔ ابوجان نے حیرت سے مجھے گھر میں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے میں کچھ کہتے امی جان نے پیار سے مزید اپنے سینے سے چمٹا لیا اور ابوجان خاموش ہو گئے اور نزدیک پڑی چارپائی پر بیٹھ گئے اور سمجھانے لگے کہ اگر اسکول نہیں جاؤ گے تو دنیا میں کامیاب کیسے ہو گے۔ انھوں نے مجھے ہمسایوں کے بچوں کی مثالیں دیں کہ دیکھو فضل صاحب کے بچے بھی تو تمہاری عمر کے ہیں وہ تو اسکول جاتے ہیں۔ تم ان کے ساتھ اسکول جایا کرو۔

قصہ مختصر کہ میں اس شرط پر اسکول جانے پر راضی ہوا کہ جب بھی مجھے بھوک لگے گی تو اسکول میں استاد مجھے اسی وقت چھٹی دے گا اور میں گھر آ کر فیڈر میں دودھ پی پھر اسکول چلا جایا کروں گا۔ اس وقت میری عمر پانچ سال ہو چکی تھی اور میں پانچ سال کی عمر تک فیڈر میں دودھ پیتا تھا اور میرے لیے امی جان، فیڈر اور گھر میں پالے گئے خرگوشوں سے دور رہنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسکول جانے لگا۔ کبھی ضد کر کے چھٹی بھی کر لیتا، لیکن سکول جانے لگا تھا کیوں کہ اسکول میں بہت سے بچوں کے ساتھ دوستی جو ہو گئی تھی۔ جس میں فضل سرفہرست تھا۔ اس اسکول میں ملایشین وردی اور سر پر ملایشین ٹوپی پہننا ہوتی تھی اور ہمارا قاعدہ پشتو زبان میں تھا۔ نوشہرہ سے ابوجان کی ریٹائرمنٹ کے کئی سال تک مجھے پشتو میں گنتی اور پشتو زبان آتی تھی، جو ایک عرصہ گزرنے اور پنجابی والے ماحول میں آ کر بھولتی گئی اور آج میں پشتو کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں یہی کوئی 1985ء کا دور تھا ابوجان غالباً سپاہی رینک میں تھے اور ان کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپے تھی (یہ بنیادی تنخواہ ہوتی اس علاوہ الاؤنس ہوتے) اس کے علاوہ پاک فوج کی طرف سے کوارٹر اور ماہانہ راشن کارڈ ملا ہوا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس دور میں یہ پانچ سو روپے ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ ہم لوگ ہر مہینے کے آخر پر جب تنخواہ ملتی تو نوشہرہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

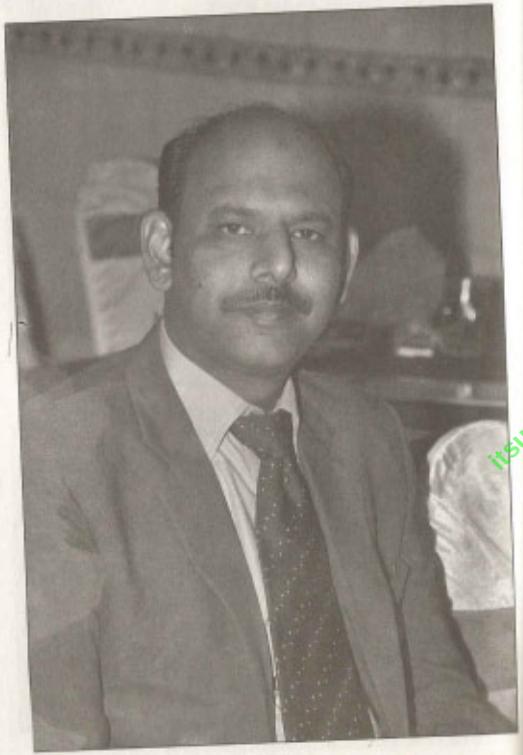

ندیم اختر

شہر میں جاتے اور وہاں ابو اور امی جان کے ساتھ گھر کی ضرورت کی چیزیں، جن میں کبھی کبھار جوتے اور کپڑے بھی شامل ہوتے وہ خریدتے اور اس طرح تقریباً ہر دو ماہ بعد ہم سب لوگ نوشہرہ کے نزدیک کاکا صاحب کے دربار (قاضی حسین احمد مرحوم سابق امیر جماعت اسلامی بھی کاکا صاحب کے رہنے والے تھے ان کی تدفین بھی کاکا صاحب کے احاطے میں ہوئی ہے) جایا کرتے اور وہاں پر مجھے سب سے زیادہ چپل کباب اور خمیرے آٹے کی روٹی جسے غالباً ڈوڈا کے نام سے پکارا جاتا ہے، پسند تھی۔

حسب معمول وہ بھی کوئی سال تھا، جب مہینے کی ابتدا پر ابو جان کو تنخواہ ملی تو ہم سب گھر والے نوشہرہ سٹی گئے۔ بازار میں شاپنگ کرنے کے دوران میری نظر ایک کتابوں والی دکان کے باہر سجے ہوئے بک اسٹال پر پڑی گئی اور میں نے ضد کر کے کوئی پچیس پیسے کا ایک ٹارزن والا رسالہ خریدا۔ مجھے یہ تو نہیں پتا تھا کہ اس کتاب میں کیا ہے پر اس کے سرورق پر خوب صورت جنگلی، نیکر پہنے ہوئے ایک خوب صورت نوجوان کی تصویر جس کے کندھے پر ایک بندر بیٹھا تھا، جب کہ سرورق کے ایک طرف ایک ندی تھی، جس کے کنارے بڑا سا مینڈک بیٹھا ہوا تھا یہ سرورق مجھے اتنا بھایا کہ میں نے ابو جان کا پچیس پیسے کا خرچہ کروا دیا۔

مجھے ٹارزن کی وہ کہانی آج تک یاد ہے، جو میں نے پڑھی۔ وہ کہانی کچھ یوں تھی کہ کچھ اسمگلر مینڈکوں کے ذریعے سونا ندی کے اس پار پہنچایا کرتے تھے اور ٹارزن نے انہیں پکڑا تھا۔ بس کچھ اسی طرح کی کہانی تھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے پہلی کہانی پہلی جماعت میں ہی پڑھ ڈالی تھی۔

بچپن میں اسکول سے واپسی پر بہت سے کھیلوں میں سے لکن چھپائی ابھی تک یاد ہے، کیوں کہ یہ لکن چھپائی کسی جھاڑی یا دیوار کی اوٹ میں نہیں کھیلی جاتی تھی، بلکہ نوشہرہ کینٹ میں ایک مقام ایسا تھا جو یو (U) شکل میں بنا ہوا تھا اور اس کی دیواروں پر مختلف نقش و نگار کے ذریعے جنگ 65ء کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اس مقام پر پرانے ٹینک، پرانی گاڑیاں، جو تباہ شدہ حالت میں کھڑی رہتی تھی اور ان کی ایک بڑی تعداد تھی، جن کے زنگ آلودہ دروازے اور کھڑکیاں اس وقت بھی کام کرتے تھے اور یہ گاڑیاں ہی ہمارے لیے چھپنے کا کام دیتے تھے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

1985 نوشہرہ میں اپنے ابو جان، امی جان اور چھوٹی بہن کے ساتھ

ندیم اختر فیملی کے ہمراہ

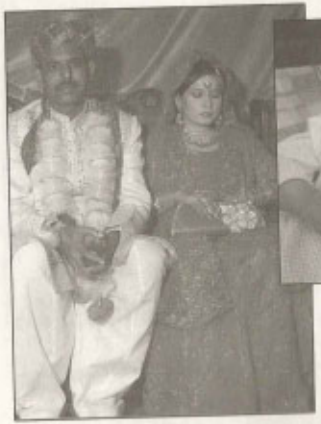

ندیم اختر کی گڑیا..... عمیرہ ندیم اختر

شادی کے موقع پر

کاروانِ ادب کی تقریب میں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ایک دفعہ پوچھنے پر ابو جان نے بتایا کہ یہ وہ گاڑیاں ہیں جو جنگ کے دوران تباہ ہوئیں اور انہیں متعلقہ سکواڈن میں اثاثہ کے طور پر محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس کھیل کے علاوہ ہمارا مشغلہ گدڑے اور گڈی کے کھیل کھیلنا تھا۔ اس کھیل میں صوبیدار فضل صاحب کی دو صاحب زادیاں شازیہ اور آسیہ سمیت ان کے بیٹے امجد اور پھر ایک اور صوبیدار صاحب تھے۔ ان کی بیگم کا نام گوری تھا، غالباً ان کے گول مٹول سے بچے کا نام تو اب یاد نہیں۔ وہ ہمارے ساتھی ہوتے اور ہم سب مل کر گدڑے گڈی کی شادی کا کھیل کھیلا کرتے تھے۔

نوشہرہ کینٹ کے جس علاقے میں ابو جان کو کوارٹر الاٹ ہوا تھا، اسے اسٹوری کوارٹر کہا جاتا تھا، کیوں کہ یہ کوارٹر ٹرپل سٹوری پر مشتمل تھے اور ان کوارٹروں کے سامنے سے ریلوے ٹریک گزرتا تھا، جس پر سے دن میں کوئی تین بار ریل کار اور ریل گاڑی گزرا کرتی تھی اور شام کے وقت ہمارا مشغلہ ریلوے ٹریک پر بڑے بڑے پتھر اور دس آنے یا پانچ آنے کے سکے رکھنا تھا۔ جیسے ہی ریل گاڑی ان پر گزرتی تو ریلوے لائن پر پڑے ہوئے سکے لائن پر چپک جاتے اور پتھر ریزہ ریزہ ہو کر ختم ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ریلوے لائن سے ذرا دور اونچی پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، جو اوپر کی جانب اٹھتا ہی جاتا تھا اور ہم سب دوست کبھی کبھار گھر والوں کو بتائے بغیر ان پہاڑوں پر چلے جاتے اور گولیوں کے خول اکٹھے کرتے تھے۔ شاید رات بھر جو فائرنگ کی آواز آیا کرتی تھی، یہ خول انہی گولیوں کے ہوتے تھے۔ گرمیوں کے دنوں میں پہاڑی بیریوں کے چھوٹے چھوٹے جو مٹھاس بھرے بیر ہوا کرتے تھے، انھیں توڑ کر کھایا کرتے تھے۔

مختصر تعارف

نام: محمد ندیم اختر

پیدائش: 06 جولائی 1979

لکھنے کا آغاز 1995ء

پہلی کہانی کا نام: چھٹیوں کا کام (پھول اور کلیاں..... روزنامہ نوائے وقت ملتان)

کاروان ادب کا نفرنس ساہیوال 2013ء
اختر عباس ایڈیٹر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ سے
بیسٹ پرفارمنس ایوارڈ لیتے ہوئے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

شعبہ: نثر

ایوارڈ:

1۔ نورادب ایوارڈ

2۔ جنوبی پنجاب کا بہترین لکھاری سنہ 1999

3۔ حقوق اطفال نمبر 1999 مضمون جنگ جاری رہے گی (مطبوعہ ماہ نامہ تعلیمی ڈائجسٹ لاہور) پاکستان بھر میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

4۔ ساتھی رائٹرز ایوارڈ 2000ء

5۔ ساہیوال سنگت رائٹرز ایوارڈ

6۔ بیسٹ پرفارمنس ایوارڈ بدست اختر عباس برائے کاروان ادب کانفرنس ساہیوال

کہانیوں کی تعداد: 300 سے زائد

رسائل جن میں لکھا:

ماہ نامہ آنکھ مچولی کراچی، ماہ نامہ نونہال کراچی، ماہ نامہ پھول لاہور، ماہ نامہ آنکھ مچولی لاہور، ماہ نامہ مجاہد راولپنڈی، ہفت روزہ فیملی میگزین، ماہ نامہ ذہین لاہور، ماہ نامہ تعلیم و تربیت لاہور، ماہ نامہ ساتھی کراچی، ماہ نامہ گوگو کراچی، ماہ نامہ نٹ کھٹ حیدر آباد، ماہ نامہ انوکھی کہانیاں کراچی، ماہ نامہ پیغام ڈائجسٹ لاہور، ماہ نامہ پیغام اقبال راولپنڈی، ماہ نامہ شاہین پشاور، ماہ نامہ شہباز کوئٹہ، ماہ نامہ مہک، ماہ نامہ بچوں کا پرستان لاہور، ماہ نامہ تعلیمی ڈائجسٹ لاہور اور دیگر اخبار و میگزین۔

کتابیں:

ذرا الوبیہ نمک (بچوں کے لیے سفرنامہ) ناشر ادارہ علم و دانش لاہور

مکھی جیسا (غیر مطبوعہ) 06-2005 نیشنل بک فاؤنڈیشن سے سند یافتہ قرار پائی

شرارت کی چالاکی (رابعہ بک ہاؤس لاہور میں اشاعت کے مراحل میں ہے)

ایڈیٹر شپ:

1۔ ماہنامہ تعمیر ادب لیہ

2۔ ماہ نامہ دوآبہ گزٹ (یہ پاکستان کے دریائی علاقہ کا پہلا اور واحد اخبار ہے جو ملتان، مظفر

گڑھ، لیہ، جھنگ، بھکر اور ڈیرہ غازی خان کے اضلاع سے ایک ہی وقت میں شائع کیا جاتا ہے)

3۔ ماہ نامہ کاروان ادب لیہ

3۔ ماہ نامہ گل افشاں لیہ، ماہنامہ ہونہار لیہ (گل افشاں اور ہونہار اب بند ہو چکے ہیں)

4۔ نونہال اردو (بچوں کا پہلا انٹرنیٹ میگزین)

ادبی تنظیمیں:

منتظم: کاروان ادب پاکستان

ضلعی جنرل سیکرٹری: گائیڈ پاکستان

کتابیں جن میں کہانیاں شائع ہوئیں:

۱۔ ماں بن آنگن سونا (ناشر مشتاق بک کارنر لاہور)

۲۔ سن 2004ء کی بہترین کہانیاں مرتبہ: نذیر انبالوی (ناشر، غلام علی اینڈ سنز لاہور)

وہ بچپن تھا یا خوشیوں کا ایک جہاں آباد تھا، آج تک نہیں بھولا۔ کتنی ہی یادیں ہیں، جو چونتیس سال گزرنے پر بھی ہوا کے تر و تازہ جھونکوں کی طرح تازگی دے رہی ہیں۔ نوشہرہ کینٹ میں ایک بار ابوجان کو کوارٹر الاٹ نہ ہوا تو ہم پرائیویٹ کوارٹروں میں شفٹ ہو گئے۔ یہ بدرشی کا علاقہ تھا۔ بدرشی کا علاقہ اونچی پہاڑوں کے درمیان واقع تھا، جو کینٹ کے بالکل نزدیک ایک مقام تھا۔ ابوجان نے بہت عرصے بعد بتایا کہ وہاں پر جس کرایے کے مکان میں ہم رہائش پذیر تھے، وہ مکان ارباز خان فلم سٹار کے دادا جان کا مقام تھا اور ارباز خان کے والد آصف خان کئی بار کرایہ وصول کرنے آیا کرتے تھے۔ بدرشی کی یادیں کچھ دھندلا گئی ہیں، کچھ خواب سی لگنے لگی ہیں، بس اتنا یاد ہے کہ بدرشی جو ایک گاؤں نما جگہ تھی۔ اس گاؤں کے عین درمیان میں سے ایک برساتی نالہ گزرا کرتا تھا اور بارش کے دنوں میں بہنے والا پانی اپنے شور کی وجہ سے ہیبت ناک ہو جاتا تھا اور اس دوران گھر والے ہم سب بچوں کو اس نالے کے قریب جھانکنے سے بھی منع کرتے تھے۔

ایک بار ہم غلطی سے بارش میں نہاتے ہوئے نالے کے قریب پہنچ گئے۔ برساتی نالے میں بڑے بڑے پتھر بہنے لگے، جو دھپ سے نالے میں گرتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ گاؤں کے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ایک مرد نے جب یہ دیکھا تو گھر والوں کو بتایا کہ اپنے بچوں کو منع کریں، کہیں نالے کی نظر ہی نہ ہو جائیں؟ اس دن گھر والوں نے منع کیا کرتا تھا کہ امی جان نے پٹائی کر دی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ امی جان کی مار کے بعد میں خوب رویا کہ اتنا رویا کہ امی جان بھی میرے ساتھ ہی رونے لگیں اور اپنی آغوش میں لے لیا۔ امی جان کو روتے دیکھ کر مجھے اپنا رونا بھول گیا۔ یہ کوئی 1990ء بات ہے جب مجھے لیہ میں اپنے ننھیال میں زبردستی بھیج دیا گیا کہ 1991ء کے مارچ کے قریب ابو جان کی ریٹائرڈ منٹ ہوگی تو اس دوران اگر میں نوشہرہ میں پڑھتا رہا تو اسکول میں امتحانات نہ دے سکوں گا۔ اس لیے ایک سال پہلے ہی مجھے لیہ آنا پڑا تا کہ جیسے ہی ابو جان کی ریٹائرڈ منٹ ہو تو میری پڑھائی کا حرج نہ ہو اور اس طرح ابو جان کی ریٹائرڈ منٹ کے ایک سال پہلے ہی مجھے نوشہرہ سے دور کر دیا گیا۔

نوشہرہ کے اسکول اور لیہ کے نواحی گاؤں چک نمبر 152 ٹی ڈی اے کے سکول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نوشہرہ کے اسکول میں کرسیاں اور بینچ ہوا کرتے تھے، جب کہ اس اسکول میں گھر سے پولی تھین بیگ لے کر جانا پڑتا تھا اور درختوں کے نیچے ان بوریوں اور پولی تھین بیگوں کو بچھا کر پڑھا کرتے تھے۔ نوشہرہ کے اسکول میں ملائیشیا کی وردی اور یہاں پر خاکی وردی ہوا کرتی تھی۔ وہاں پر بازار سے ریڈی میڈ بستہ تھا۔ اسکول میں آتے ہی کپڑے کے تھیلے میں کتابیں ڈال کر دی جاتی تھیں، جو کندھے پر لٹکائے ہوئے ہم اسکول پہنچتے۔ لیکن ایک بات تھی کہ دوسری کلاس تھی اور اسکول میں کسی کو ڈھب سے اردو بولنا تو در کنار پڑھنا بھی نہیں آتی تھی، چوں کہ میں نوشہرہ میں رہا تھا جہاں پر پشتو، پنجابی اور اردو زبان بولی جاتی تھی تو مجھے اردو فر فر آتی تھی، اس لیے اسکول میں داخلہ ملتے ہی میں اپنے اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بن گیا اور کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا۔ مجھے یاد ہے، جس دن میرا اسکول میں پہلا دن تھا، اسی دن ہمارے استاد سرفراز صاحب کا بھی اسکول میں پہلا دن تھا، کیوں کہ اس دور میں پی ٹی سی ٹیچر کے طور تعیناتی ہوا کرتی تھی اور سرفراز صاحب نے پی ٹی سی کیا ہوا تھا۔ استاد اور شاگرد دونوں کا ایک ہی دن اسکول میں داخل ہونا ایسا یادگار رہا کہ آج استاد شاگردی سے نکل کر ہم اچھے دوستوں کی طرح ملتے ہیں۔ میں آج بھی ان کی اسی طرح عزت و احترام کرتا ہوں، جیسے پہلے دن کرتا تھا۔ وہ کہتے ہیں ندیم مجھے آپ پر فخر ہے۔

اس طرح چوتھی کلاس تک میں لیہ کے اس گاؤں میں پڑھتا رہا۔ گاؤں میں میرے بہت سے دوست بنے جن میں امجد جو چھوٹے قد کی وجہ سے دیگر کلاس فیلوز کے مذاق کا نشانہ بنتا رہا۔ شاہد علوی جو پڑھاکو ہونے کی وجہ سے ہمیشہ میرے ساتھ کلاس میں مقابلہ کیا کرتا تھا۔ شاہد پرویز میرا سب سے پیارا دوست گاؤں میں ہمارا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، کھانا پینا سب اکٹھے ہوا کرتا تھا۔ شاہد عرف شادو گاؤں کے بہت ہی غریب گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا باپ اسحاق جولاہا گرمیوں میں برف کے گولے بیچا کرتا اور اس کی امی جان خالہ ثریا کھیتوں میں مزدوری وغیرہ کر کے اپنا پیٹ پالا کرتے تھے۔ گاؤں میں خلیل لوہار عرف خیلا اور عمران مسیح عرف مانی میرے بہت ہی عزیز دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ غالباً چوتھی کلاس میں شاہد پرویز نے سکول کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے ماموں کے ساتھ فرنیچر کے دکان پر فرنیچر بنانے کا کام سیکھنے لگا اور پھر کچھ عرصہ بعد وہ لوگ اپنے آبائی گاؤں کھرال، قلعہ کالر والا ضلع نارووال میں چلے گئے اور پھر دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔

کوئی پندرہ سال بعد اسلام آباد میں ایک تربیتی ورکشاپ کے دوران سال 2008ء کے دوران سر راہ ملاقات ہوئی تو ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ کتنا حیران کن لمحہ تھا۔ کیسے پہچانا کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا پتا چلا کہ یہ تو میرا دوست شادو ہے۔ ہم ایک دوسرے کے گلے ملے۔ گلے ملتے ہی میں اور شادو خوب روئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے یا ایک لمبی جدائی کے ملاپ تھا۔ یہ شاہد پرویز عرف شادو تھا۔ وہ مجھے اپنے کرایے کے مکان میں لے گیا۔ اس نے پنڈی میں ایئر پورٹ کے ساتھ ہی ایک آبادی میں ایک مکان کرایے پر لیا ہوا تھا، جہاں پر اس کے ساتھ کوئی دس کے قریب دیگر نوجوان بھی مقیم تھے۔ پتا چلا کہ شاہد عرف شادو جو کارپینٹر کا کام سیکھنے کے بعد کوئی پانچ سال قبل لاہور اور پھر راولپنڈی شفٹ ہو گیا اور یہاں پر بننے والی کوٹھیوں میں لکڑی کی آرائش و زیبائش کا کام کرنے لگا تھا اور وہ شاہد عرف شادو جو میرا سب سے غریب دوست تھا، آج لاکھوں کے ٹھیکے لیتا تھا اور معقول آمدنی سے گزر بسر کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں سے ہجرت کے بعد حالات وہی رہے اور غربت نے ان کے خاندان کی جان نہیں چھوڑی، لیکن آہستہ آہستہ ان سب بھائیوں نے کمانا شروع کر دیا۔ اس کا چھوٹا بھائی آصف عرف آشو جو درزیوں کا کام کرتا ہے اور گاؤں میں آصف ٹیلر ماسٹر مشہور ہو گیا ہے۔ بڑا بھائی وسیم جو پہلے پیٹی پر حجام کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

شاہد کے ساتھ راولپنڈی شفٹ ہو گیا اور چھوٹے بھائی کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

بات بچپن سے جوانی میں جا پہنچی۔ دوبارہ بچپن کی طرف لوٹتا ہوں کہ چوتھی کلاس میں تھا تو ابو جان نے لیہ کے مشہور قصبہ چوک اعظم میں نیا گھر خریدا اور اس طرح ہم ننھیال سے نکل کر چوک اعظم شفٹ ہو گئے۔ جب ابو اور میرے بڑے ماموں جان چوک اعظم میں مختلف گھروں کا معائنہ کر رہے تھے کہ معقول گھر کہاں پر مل سکتا ہے تو اس دوران ایک بار میں ان کے ساتھ چوک اعظم آیا تو وارڈ نمبر 10 میں کسی نے بتایا کہ محمد بخش گارڈ کا وہ سامنے والا گھر ہے اور وہ اپنا گھر فروخت کرنا چاہتا ہے۔ ہم متعلقہ گھر پہنچے تو وہاں محمد بخش گارڈ کا بیٹا خدا بخش ناصر موجود تھا۔ (خدا بخش ناصر، ناصر ملک ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں جی ہاں وہ ہی ناصر ملک جو ملک کے سب سے بڑے پبلشرز جاسوسی ڈائجسٹ کے ساتھ منسلک ہیں اور اس وقت ماہ نامہ سسپنس میں ایک طویل سلسلہ ''مسافر'' لکھ رہے اور ناول نگار میں اپنے خوب صورت اسلوب کی وجہ سے کامیاب ناول نگار کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ مزید اگلے ابواب میں ناصر ملک کا ذکر آئے گا کہ کس طرح ناصر ملک سے پہلی ملاقات آج ایک گہری دوستی میں تبدیل ہوئی) چوں کہ ان کے والد محترم موجود نہیں تھے تو گھر کے حوالے سے ان سے مزید بات نہ ہو سکی اور اسی محلے میں ایک نیا گھر تعمیر ہو رہا تھا وہ گھر ہمیں پسند آ گیا اور دوران تعمیر ہی مالک مکان نے گھر فروخت کرنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا اور اس طرح 1992ء میں پانچ مرلے کا یہ گھر ہمارا گھر ہو گیا۔ پانچ مرلے کے اس گھر میں دو کمرے، صحن اور ایک بیٹھک تھی۔ اور اس طرح ہم ننھیال کو چھوڑ کر چوک اعظم آ گئے۔

اسی دوران ابو جان نے محلے میں نصر اللہ خان کریانہ سٹور خرید لیا اور اپنے بزنس کا آغاز ہو گیا اور مجھے بھی سرٹیفکیٹ لے کر چوک اعظم کے گورنمنٹ مڈل سکول میں داخلہ مل گیا۔ تعلیمی سال کا اختتام ہو رہا تھا، اس لیے بڑی مشکل سے داخلہ ملا اور چہارم کلاس کے سیکشن سی کے آخری رول نمبر جو کہ 63 تھا میں طالب علم کی حیثیت سے کلاس کے آخر پر بیٹھنے لگا۔ مجھے یاد ہے اس کلاس میں جہانگیر خاقان اور قلب سجاد کلاس کے سب سے لائق طالب علم تھے جو ہر سال پہلی اور دوسری پوزیشن لے کر نمایاں تھے۔

کوئی نومبر کا مہینہ تھا جب میں اس کلاس میں آیا اس کے ایک ماہ بعد دسمبر ٹیسٹ تھے، جس

میں خاطر خواہ نمبر نہ لے سکا اور میرا نام کلاس کے باقی طالب علموں کی طرح کوئی خاص پہنچان نہ بنا سکا وہ تو اسکول کے سالانہ امتحانات میں ہماری کلاس کے استاد منظور صاحب رزلٹ والے دن ندیم اختر نام کے طالب علم کو ڈھونڈ رہے ہوں کہ یہ کون ہیں۔ کسی طالب علم نے بتایا کہ وہ سامنے والا طالب علم ندیم اختر ہے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا جب انہوں نے مجھے بلوایا تو میں خوف کے ہاتھوں کانپ رہا تھا کہ پتا نہیں کون سی غلطی سرزد ہو گئی کہ گزشتہ چار ماہ میں کبھی استاد صاحب نے احوال تک نہیں پوچھا اور آج مجھے بلوا رہے ہیں۔ بہر حال میں ڈرتے ڈرتے استاد صاحب کے سامنے حاضر ہو گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ کلاس میں میں نے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے اور دو گھنٹے بعد مڈل اسکول کے ایک بڑے میدان میں رزلٹ کا اعلان ہونے والا ہے۔ اس وقت میری خوشی دیدنی تھی اور میں رزلٹ سے پہلے ابو جان کے پاس دکان پر پہنچا اور انہیں آگاہ کیا۔ اس دور میں کلاس میں پوزیشن لینے والے طالب علم اپنے اساتذہ کو مٹھائی کا ڈبا اور ہار پہنایا کرتے تھے اور ابو جان نے میرے ساتھ مٹھائی اور ہار کی خریداری کی۔ رزلٹ آؤٹ ہوا اور اس کلاس میں اول پوزیشن کا حق دار مجھے ٹھہرایا گیا۔ اور اس طرح پانچویں کلاس میں آخری رول نمبر والا طالب علم پہلے رول نمبر پر آ گیا۔ پھر پانچویں کلاس میں سنٹر کا امتحان پاس کیا اور اسکول میں لائق طالب علموں کو وظیفے کے امتحان کے لیے منتخب کیا گیا جس میں سرفہرست تھا اور اس طرح ضلع کی سطح پر وظیفے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر کے اسکول کی پہچان میں اضافہ کیا۔

اول آنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس اسکول میں داخلے کے بعد کوئی بھی میرا دوست نہیں تھا، لیکن پوزیشن لینے کے بعد کلاس اور اسکول کی دیگر کلاسوں کے طالب علموں کی خواہش ہوتی تھی کہ میری ان سے دوستی ہو۔ دوستیاں تو ہو گئیں، لیکن جہانگیر خاقان اور قلب سجاد میرے سب سے گہرے دوستوں میں شمار ہونے لگے اور اس طرح ہم تین دوستوں کی ٹولی اسکول میں مشہور ہو گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ ہماری دوستی توانا ہوتی گئی۔ مضبوط دوستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری طرح جہانگیر احمد خاقان عمران سیریز پڑھنے کا دلدادہ تھا وہ تارزن، عمر عیار، آنگلو بانگلو کی کہانیاں پڑھا کرتا تھا۔ ہم دونوں مل کر بہت سی کہانیاں خریدا کرتے اور ایک دوسرے کو پڑھنے کے کہانیاں دیا کرتے تھے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

پانچویں کلاس کے بعد لڑکپن میں قدم رکھ چکا تھا، لیکن یوں لگتا تھا کہ ابھی بچپنا گیا نہیں اور یہ سوچتے سوچتے وقت گزرتا گیا جس نے زندگی کے نئے در وا کیے جو خوب صورت مستقبل کی شکل میں آج میرے سامنے ہیں۔ چوں کہ پانچویں کلاس کا سنہرا دور گزر رہا تھا، جس میں جہانگیر احمد خاقان اور قلب سجاد جیسے خوب صورت دوست میسر آئے تھے۔ ہم اسکول سے واپسی پر شہر کے اکلوتے بک اسٹال سے پاکٹ سائز کہانیاں خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک بار جہانگیر نے بتایا کہ ملک نیوز ایجنسی پر ایک رسالہ ملتا ہے، جس کی قیمت سات روپے ہے اور اس رسالے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ہر مہینے نیا آتا ہے جس میں بہت سی کہانیاں ہوتی ہیں۔ بس پھر کیا تھا میں نے جیب خرچ میں سے پیسے بچانے شروع کر دیے اور مہینے کے ابتدا پر جا کر وہ رسالہ خریدا۔ اس رسالے کا نام "پھول" تھا۔ واقعی سات روپے میں اتنی ساری کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور وہ بھی مزے مزے کی ۔ اور اس طرح پاکٹ سائز کہانیوں کے ساتھ ساتھ "پھول" سے ایسی گہری دوستی ہوئی کہ 2010ء تک یہ دوستی برقرار رہی۔ میرے پاس 1992ء سے 2010ء تک کے تمام پھول کے شمارے موجود تھے۔

ماہ نامہ پھول پڑھنے سے یہ فائدہ ہوا کہ جہاں میرے علم میں اضافہ ہوا وہاں بہت سے ادیبوں کے نام سے بھی واقفیت ہونے لگی۔ اختر عباس کی ہیڈ ٹائم اسٹوری کے ساتھ ساتھ نذیر انبالوی اور کاشان جعفری کی کہانیاں مجھے بھاتی تھیں۔ اسی دوران چوں کہ عمران سیریز بھی پڑھا کرتا تھا۔ اتنا کچھ پڑھ پڑھ کے لکھنے کو دل کرنے لگا، لیکن لکھا نہ جاتا۔ ایک بار جہانگیر نے مجھے کہا کہ میں عمران سیریز لکھ سکتا ہوں تو میں نے اسے کہا کہ وہ میرے نام سے عمران سیریز لکھے تو اس نے کہا کہ پانچ روپے میں ایک عمران سیریز لکھ کر دے سکتا ہوں اور میں نے اس کی شرط مان لی۔ اس طرح اس نے مجھے تین عمران سیریز لکھ کر دیے، جو میں یوسف برادرز پاک گیٹ ملتان کے پوسٹل ایڈریس پر شائع ہونے کے لیے ارسال کیے، لیکن وہ آج تک شائع نہیں ہوئے۔ آج بھی جہانگیر کبھی ملتا ہے اور میری کہانیوں کو دیکھ کر وہ وقت یاد دلاتا ہے تو بچپن کی وہ باتیں ہنسا دیتی ہیں۔

ایک بات بتانا بھول گیا کہ جن دنوں میں پھول پڑھا کرتا تھا تو میرے لیے پھول اور دیگر کہانیاں لکھنے والے کسی اور دنیا کی مخلوق ہوا کرتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ انسان کا کام نہیں ہے۔

اسی دوران پھول نے اپنے سال نامے میں اپنے لکھنے والوں کی تصاویر کے ساتھ تعارف شائع کیا تو میں نے پھول والوں کو خط لکھا، جس میں لکھا کہ اس بار سال نامے میں کاشان جعفری اور دیگر ادیبوں کی تصویریں اور تعارف دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کہانیاں لکھنے والے بھی ہم میں سے ہی ہیں کوئی دوسری مخلوق کا نام نہیں ہے۔ میرا یہ خط شائع ہو گیا۔

اس طرح پھول میں پہلی بار میرا نام شائع ہوا۔ اپنا نام دیکھ کر میں اتنا خوش ہوا کہ اپنے ہر جاننے والے کو یہ شائع ہونے والا خط دکھایا۔ اسی دوران روز نامہ پاکستان میں بچوں کا پاکستان ہر ہفتے شائع ہوتا تھا، جس میں نذیر انبالوی کی ایک حدیث ایک کہانی پڑھا کرتا تھا اور روز نامہ نوائے ملتان سے ہفتہ بچوں کے لیے "پھول اور کلیاں" شائع ہوتا جو میرے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ غالباً چھٹی کلاس یا ساتویں کلاس تھی جب گھر والوں نے میرے رسائل پڑھنے کو بڑا جرم سمجھنا شروع کر دیا کہ ان رسائل کی وجہ سے میری پڑھائی پر اثر پڑ رہا ہے، لیکن مطالعہ کا شوق اتنا پروان چڑھ چکا تھا کہ مجال کہ گھر والوں کی باتوں کا اثر ہوتا۔

اگست 1995ء گرمیوں کی چھٹیوں کا موسم تھا۔ اسکول کے کام کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ رسالے تھے اور دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی، کرکٹ میچ تھا اور گھر والوں سے چوری چھپے ویڈیو گیم کھیلنا ہوا کرتا تھا۔ جب میں اپنی پہلی کہانی لکھی۔ "چھٹیوں کا کام" اور ڈرتے ڈرتے "پھول اور کلیاں" کے ایڈریس پر ارسال کر دی۔ اس ہفتے ارسال کی اور اگلے ہفتے کے "پھول اور کلیاں" کے صفحات پر شائع بھی ہو گئی۔

یہ میرا لکھنے کی باقاعدہ ابتدا تھی۔ کہانی کیا شائع ہوئی کہ گھر والے، محلے دار اور کرکٹ کے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے والے میرے دوست سب کو ہی وہ کہانی دکھائی۔ کافی دن وہ پھول اور کلیاں میرے ہاتھ میں رہا۔ میں دن میں ہزار ہا بار اپنی کہانی دیکھتا اور پھر پھول اور کلیاں کو جیب میں ڈال لیتا۔ وہ خوشی اور پہلی بار زمین پر پڑے ایک روپے ملنے والے روپے کی خوشی ایک جیسی تھی۔

اس دور میں میرے زیر مطالعہ جہاں بہت سے رسائل تھے، وہاں ماہ نامہ آنکھ مچولی کراچی، ماہ نامہ پیغام ڈائجسٹ لاہور اور ماہ نامہ ہمدرد نونہال بھی رہتے تھے۔ ان دنوں ماہ نامہ آنکھ مچولی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا۔ اس میں ہر ماہ نت نئے سلسلے اس کی مقبولیت کی وجہ تھے۔ میں نے پہلی کہانی کے بعد اپنی دوسری کہانی ''پیاری ماں'' اور پاگل آنٹی لکھی اور یہ دونوں کہانیاں ماہ نامہ آنکھ مچولی کے پتے پر ارسال کر دی۔ غالباً دسمبر 1995ء کا شمارہ تھا۔ اس شمارے میں یہ دونوں کہانیاں شائع ہوئی تھیں اور اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا کبھی پھول اور کلیاں، کبھی آنکھ مچولی اور دیکھتے دیکھتے 1995ء میں میری چھ کہانیاں شائع ہوگئیں۔ نیا نیا لکھنے کا شوق تھا تو اگلے سال تک لکھنے میں اتنی روانی آ چکی تھی کہ ہر مہینے چار پانچ کہانیاں کسی نہ کسی رسالے میں شائع ہو ہی جاتی تھیں۔

ان دنوں پہلی بار مجھے پھول کلب ملتان کی ایک تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خواجہ مظہر نواز صدیقی جو کہ اس کلب کے صدر تھے، انھوں نے کمال محبت سے مجھے دعوت دی اور میں اس تقریب میں شمولیت کی لیے ملتان گیا۔ شیراز ان ہوٹل کی وہ تقریب جہاں میں پہنچ تو گیا، جس تقریب کے مہمان خصوصی ایڈیٹر بھیا اختر عباس تھے، لیکن ہوٹل کے اس ہال میں جانا داخل ہوتے ہوئے میرے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ یہ میرے اعتماد کی کمی تھی۔ (یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ سال 2012 میں گائیڈ کی نیم نے بڑی محبت سے میری چائے کی دعوت قبول کی اور اسی ہوٹل جہاں کسی دور میں میرے پاؤں ڈگمگا رہے تھے، وہاں اُن کے اعزاز میں ٹی پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں ایم مجاہد، عبدالصمد مظفر، حاجی لطیف کھوکھر، محمد علی، کمال ایوب صدیقی، عاطر شاہین اور جنوبی پنجاب کے بچوں کے ادیبوں نے شرکت کی) پھر اسی سال پھول کلب کے زیر اہتمام ملتان میں رائٹر کنونشن کا اہتمام ہوا تو خواجہ مظہر نواز صدیقی کی دعوت پر میں اس کنونشن میں گیا۔ یہ پہلا رائٹرز کنونشن تھا، جس میں..... میں شریک ہوا۔

کنونشن میں ایک رات پہلے پہنچنا تھا اور رات رہنے کے لیے کسی اسکول کا ایڈریس دیا ہوا تھا۔ میں دعوت نامے پر دیے گئے پتے پر پہنچ گیا وہاں تو میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ جن لوگوں کو میں پڑھا کرتا تھا۔ وہ لوگ وہاں موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ کاشان جعفری، کمال ایوب صدیقی، خالد حمید (عاطر شاہین) شعیب مرزا، نذیر انبالوی، عدنان جہانگیر (مرحوم) محمد حسین سندھو (مرحوم)، عبدالرشید فاروقی، شہر یار بھروانہ، ذوالفقار

باری، طارق سمرا، عارف عثمان، رانا راشد علی خان، عطاالغفار راشد، ڈاکٹر افتخار کھوکھر اور بھی بہت سے لکھاری تھے کچھ کے نام یاد نہیں ہیں۔ اس تقریب میں جانے کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اس تقریب میں معلوم ہوا کہ اسلام آباد میں شعبہ بچوں کا ادب ہے، جو ہر سال لکھنے والوں کے لیے تربیت کا اہتمام کرتا ہے اور لاہور میں نذیر انبالوی، شعیب مرزا اور عارف عثمان پاکستان ینگ رائٹر فورم کے نام سے پنجاب کے لیے لکھنے والوں کے لیے صوبائی کیمپ کا انعقاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پتا چلا کہ فیصل آباد سے رانا راشد علی خان کڈز کلب کے نام پندرہ روزہ صفحہ ترتیب دیتے ہیں اور ارباب بزمی ماہ نامہ بوئے چنبیلی موڑ ایمن آباد سے نکالتے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ یہ رائٹر کنونشن ہی تھا جس نے میرے سوچوں کے کینوس کو وسیع کیا اور میں چوک اعظم سے نکل کر پاکستان کے مختلف کونوں میں رہنے والے لکھاریوں سے رابطے میں رہنے لگا۔

یہ موبائل فون کا دور نہیں تھا، بلکہ خط وکتابت کا دور تھا۔ اسی خط وکتابت کے دور میں عبداللہ نظامی جو میرے ضلع لیہ میں میرے شہر سے کوئی پچاس کلو میٹر دور کوٹ سلطان میں رہتا تھا۔ اس سے قلمی دوستی ہوگئی اور ہماری قلمی دوستی تین سال تک چلتی رہی، لیکن ہم ایک دوسرے سے مل نہ سکے۔ 1996 میں قلمی دوستی سے ہونے والی ابتدا غالباً 1999 میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات سے یہ اندازہ نہیں تھا کہ عبداللہ نظامی سے پہلی ملاقات پاکستان میں بچوں کے ادب میں کیا بچل مچائے گی۔ یہ دن اور آج کا دن ہمارا یارانہ ایک مثال بن گیا اور ہم گزشتہ دس سالوں سے ماہ نامہ تعمیر ادب کی شکل میں ہر مہینے اہل ادب کے دلوں کی دھڑکن بنتے ہیں۔ ہماری دوستی سے خائف بہت سے لوگوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے ہمیں ایک دوسرے سے دور کرنے کی کوشش کی، لیکن ہم دونوں ایک بات طے کر کے بیٹھے ہوئے ہیں کہ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے ہم نے کسی کی بات پر دھیان نہیں دینا اور یہی وجہ ہے کہ سب کوششیں ناکام ہوگئیں۔

اسی طرح ناصر ملک جنھیں میں اپنا استاد مانتا ہوں، ان سے میں نے کہانی لکھنا سیکھی کہ اچھی کہانی کیسے لکھی جاتی ہے جیسے میں نے شروع میں ذکر کیا کہ جب چوک اعظم میں پہلا قدم رکھا تھا تو چوک اعظم میں پہلی ملاقات ناصر ملک صاحب سے ہوئی تھی اور وہ ملاقات اور آج کا دن..... ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا ایسے ہی ہے جیسے دونوں کے گھر ایک ہی ہوں۔ ناصر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ملک پاکستان کے نامور محقق، شاعر بانی اردو سخن ڈاٹ کام اور سب رنگ کے ساتھ ماہانامہ جاسوسی اور ماہ نامہ سسپنس کے آخری صفحات پر چھپتے ہیں۔ حال ہی میں ان قسط وار ناول "مسافر" جو سسپنس میں جاری ہے۔ اس نے پڑھنے والوں سے خاصی داد وصول کی (آپس کی بات ہے یہ ناول میں نے شائع ہونے سے پہلے پڑھ لیا تھا، بلکہ اکثر جب لکھ رہے ہوتے تھے تو اس میں بہت سے واقعات میں بھی بتایا کرتا تھا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ناول پاکستان میں اپنا الگ سے ایک مقام بنالے گا۔)

1997 میں میں نے سکول کے بچوں کے لیے ماہ نامہ گل افشاں اور ماہ نامہ ہونہار لیہ کے نام کے نام سے دو رسائل شائع کرنے کی ابتدا بھی کی، لیکن ایک ایک شمارہ شائع ہونے کے بعد یہ رسالے دوبارہ منظر عام پر نہ آسکے۔ ماہ نامہ ہونہار میں میرے ساتھ بطور معاون مدیر احسن بٹ تھے، جی ہاں احسن بٹ جو پاکستان میں ترجمے میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اور کے اشاعتی ادارے نگارشات سے ستر سے زائد معروف کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے، جو پاکستان میں ریکارڈ فروخت ہوئے۔ آج کل روز نامہ دنیا میں ان کے انگریزی سے اردو میں کیے گئے کالموں کے ترجمے شائع ہوتے ہیں۔ زندگی یونہی رواں دواں تھی اور میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ مطالعہ اور لکھنے کی مشق میں مسلسل جستجو کر رہا تھا۔

اسی دوران گھر کے حالات نے پلٹا کھایا اور ہمارا کاروبار زیادہ اُدھار دینے کی وجہ سے ختم ہو گیا اور نصر اللہ خان کریانہ اسٹور جو اس محلے کا سب سے بڑا کریانہ اسٹور تھا، خالی ہو گیا اور گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال لیا۔ ان حالات میں ابو جان نے ہمت نہیں ہاری اور شہر کے بڑے بزنس مین...... جو شیخ فیملی تھی، جہاں سے ہم کریانہ کا تقریباً تمام سامان ہول سیل میں اٹھایا کرتے تھے۔ وہاں پر پندرہ سو روپے پر نوکری کر لی اور اس طرح گھر کے اخراجات پھر چلنے لگے۔ اس دوران میں مڈل پاس کر چکا تھا۔ اور گھر کے حالات کی وجہ میں بہت زیادہ پریشان تھا۔ کیوں کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی پیسے کی ریل پیل دیکھی تھی، کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح خواہشات بھی مرتی ہیں اور صرف دو وقت کا کھانا ہی صرف خواہش بن جاتی ہے، لیکن اس دوران ابو نے ہم بہن بھائیوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی، مگر دن بدن بڑھتی ہوئی مہنگائی نے جینا دو

بھر کر دیا تھا۔

اس پریشانی میں لکھنے کا شوق ماند پڑنے لگے اور مظفر گڑھ کی ایک سپننگ ملز (انڈس سپننگ) میں چلا گیا اور 18 سو روپے پر مل ورکر بن گیا، لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور آٹھویں کا نتیجہ آنے تک میں اس مل کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ آٹھویں کا رزلٹ آ گیا اور میں جو لائق فائق طالب تھا، حالات کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہ دینے کی بنا پر انگلش میں استار لگا کر پاس کیا گیا تھا۔ اب اگلا مرحلہ میٹرک کا تھا اور نہم کلاس میں بیٹھنے سے پہلے نئی کلاس کی کتابیں خریدنا تھیں، لیکن ابو جان کے پاس میری کتابیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھی، مگر پھر بھی پتا نہیں کہاں سے پیسے لے کر میرے لیے آدھی کتابیں خریدی گئیں اور میں نئی کلاس میں آ گیا۔ اب ان کتابوں کو جلد کرانا ضروری تھا، کیوں کہ پورا سال انہی کتابوں کے ساتھ گزارا کرنا تھا، لیکن پہلے ہی بڑی مشکل سے کتابیں خریدی تھی۔ اب جلد کروانے کے لیے پیسوں کا انتظام مشکل تھا۔ بس جوں توں مشکل حالات میں نہم، دہم کا امتحان شروع ہو گیا۔

حالات نے ایسا نچوڑ کہ لائق فائق کی جہنم میں اور میں ریاضی اور انگریزی میں فیل ہو گیا۔ ان دو مضامین میں دو سال تک پاس نہ کر سکا اور پھر فیل ہو گیا۔ اگلے سال پھر امتحان دیا۔ اس بار صرف ایک مضمون ریاضی اس میں پھر کمپارٹ تھا اور چوتھی بار اللہ اللہ کر کے میں پاس ہو گیا۔ میٹرک کے بعد ایسے حالات نہیں تھے کہ میں کالج میں پڑھ سکتا اور ابو کے جاننے والے کے توسط سے شیخوپورہ میں ایک کپڑے کی فیکٹری میں چلا گیا اور وہاں ٹیکنکل کام سیکھنے لگا۔ ہمارا ایک فورمین تھا۔ دو کاریگر اور باقی ہم تین سیکھنے والے پچیس سو روپے ماہوار پر یہ نوکری کوئی ایک ماہ بمشکل چلی اور میں گھر والوں کو بتائے بغیر شیخوپورہ سے لاہور چلا گیا، چوں کہ پچھلے پانچ سالوں میں بہت سے لکھنے والوں سے رابطے ہو چکے تھے تو میں سیدھا شام کے وقت اچھرہ لاہور میں حسن کلاتھ ہاؤس پر پہنچا، جہاں نذیر انبالوی بیٹھتے تھے۔

ان سے بات کی انہوں نے کہا کہ ان کے ایک جاننے والے ہیں اردو بازار میں...... نواز پبلشرز کے نام سے ایک پبلشنگ ادارہ چلا رہے ہیں، بلکہ انہوں نے بتایا کہ وہ طارق سرا کے کزن ہیں اور اس طرح نذیر انبالوی کے توسط سے میں نواز پبلشر میں سیلز مین کے طور پر مبلغ دو

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہزار روپے پر ملازم ہو گیا۔ اب اگلا مسئلہ لاہور میں رہائش کا تھا تو وہ مسئلہ بھی نذیر انبالوی صاحب یوں حل کروایا کہ ارباب بزمِ یادگار چوک میں ایک فوٹو سٹوڈیو میں کام کرتے ہیں۔ ان کے فلیٹ پر ایک بندے کی گنجائش تھی۔ مجھے کہا کہ میں ان سے مل لوں۔ اس طرح ارباب بزمی کے ساتھ میں بیگم روڈ پر شفٹ ہو گیا۔

یہ سن 2000 کا دور تھا۔ کوئی تین ماہ تک میں لاہور میں رہا۔ اس دوران اکثر پھول کے آفس چلا جاتا، جہاں اختر عباس اور ماہ نامہ ذہین کے چیف ایڈیٹر ظہور الدین بٹ اور ماہ نامہ رنگ رنگ کے دفتر میں شعیب مرزا سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جن دنوں میں لاہور میں تھا تو اس دوران قاسم گورایہ (سابق صدر پھول کلب گوجرانوالہ) ایم اے کر رہے تھے۔ ان سے اچھرہ میں ملاقاتیں ہوتیں۔ گھر کے حالات اپنی جگہ، لیکن ادبی دوستوں سے ملاقاتوں نے حالات کی ستم ظریفی کو بھلا دیا اور میں ذہنی طور پر خوش رہنے لگا اور پھر ایک دن لاہور کو خیر باد کہہ کر کراچی روانہ ہو گیا اور کراچی میں اپنے بچپن کے دوست آصف کے پاس کیماڑی ڈاک خانے پہنچ گیا۔

آصف عمران تو ڈاکیارڈ نیوی میں ابھی الیکٹریکل کا کورس کر رہا تھا، جب کہ اس کا چاچا یہاں ایک گارمنٹس فیکٹری میں کام کرتا تھا اور میں گارمنٹس فیکٹری میں شعبہ پریس میں گارمنٹس پریس کرنے لگا۔ لاہور جانے سے پہلے میں دعوۃ اکیڈمی شعبہ بچوں کے ادب کے زیر اہتمام ساتویں اسلامی تربیتی کیمپ میں شریک ہو چکا تھا تو وہاں کراچی سے قاسم بن نظر (قاسم بن نظر اب ہم میں نہیں ہیں) اور راحیل یوسف جو کہ ماہ نامہ ساتھی کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، یہ دونوں بھی اسی کیمپ میں شریک تھے اور طرح کراچی میں قیام کے دوران ماہ نامہ ساتھی کے دفتر میں راحیل یوسف سے ملنے اکثر جایا کرتا۔ ساتھی رائٹر ایوارڈ کی ایک تقریب میں جانے کا اتفاق بھی ہوا، جہاں پر کراچی کے بہت سے ایسے چہرے جن نام صرف پڑھ رکھے تھے..... ان سے ملاقات خوب یاد ہے، جیسے الطاف حسین، آر۔ ایم راہی، جدون ادیب، فرید بروہی، کاشان جعفری کے چھوٹے بھائی اور بھی بہت سے ایسے نام، جو اب یاد نہیں آ رہے ہیں۔

پھر کراچی کو خیر باد کہہ دیا اور واپس چوک اعظم لوٹ آیا، لیکن حالات تھے کہ قابو میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ جب میں چوک اعظم لوٹا تو ان دنوں امتحانات کے بعد نئی کلاسیں لگ رہی تھیں اور

میں نے ایک فیصلہ کیا اور شاہین بک ڈپو جو میرے پیارے دوست ہیں اور میرا خط و کتابت کا پتا بھی ہے، ان سے اجازت لے کر شاہین بک ڈپو کے سامنے جلد سازی کا آغاز کر دیا اور میں بچوں کی کتابوں کی جلدیں کرنے لگا۔ حالات جیسے بھی تھے، لیکن میں اپنے گھر والوں کے لیے چھوٹی سی عمر میں ہی کمانے لگا تھا۔ اگر گھر میں کچھ کما کر نہیں بھی دیتا تھا تو ان سے لیتا بھی نہیں تھا۔ جلد سازی کا سیزن ختم ہو گیا اور ایک بار پھر بے روزگاری نے ڈیرے ڈال لیے اور محلے کے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کے ساتھ ساتھ لکھنے کا آغاز پھر ہو چکا تھا۔

سن 2002 میں نویں اسلامی تربیتی کیمپ (الیکٹرانک میڈیا) خانس پور (یہ الیکٹرانک میڈیا کے حوالے سے پہلا کیمپ تھا جو شعبہ بچوں کا ادب منعقد کیا تھا اور میں اس کیمپ کا حصہ تھا۔) مجھے یاد ہے اس کیمپ میں شریک ہونے کے لیے جیب خالی تھی اور گھر میں میری ضد تھی کہ میں نے اسلام آباد ہر حال میں جانا ہے۔ ابو نے بڑی مشکل سے ایک ہزار روپے کہیں سے ادھار لے کر میرے خرچے کا بندوبست کیا۔ پھر 2004 میں بھی ایک کیمپ میں بلایا گیا، لیکن مصروفیت کی وجہ سے نہ جا سکا۔ پھر 2006 والے تربیتی کیمپ میں شریک ہوا۔

ہاں تو بات چل رہی تھی حالات کی سختی کی اور ہم ان برے حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ہماری محنت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے آسانیاں پیدا فرمائیں اور ایک دن بیٹھے بٹھائے ایک این جی او میں انٹرویو دینے چلا گیا، جہاں چار سو سے زائد امیدوار ان بیٹھے تھے اور میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ انہوں نے پہلے درخواست دی تھی اور انھیں اسی درخواست کی بنا پر بلایا گیا تھا، جب کہ مجھے اسی دن پتا چلا تھا کہ لیہ میں تو انا پاکستان پروگرام کے نام سے کوئی پروجیکٹ شروع ہو رہا ہے اور آج اس پروگرام کے لیے انٹرویو ہو رہے ہیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے رات کے گیارہ بج گئے۔ تمام امیدواروں کے انٹرویو ہو چکے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ بھی انٹرویو دینے آئے ہیں تو میں نے فوراً سے ہاں کہہ دیا اور مجھے کمرہ انٹرویو میں بلا لیا گیا، جہاں ایک خاتون اور دو مرد بیٹھے تھے۔ انہیں پتا چلا کہ میں نے تو اس نوکری کے لیے درخواست ہی نہیں دی، مگر میں نے انھیں سب سچ سچ بتا دیا کہ مجھے پتا نہیں تھا کہ انٹرویو دینے کے لیے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آج ہی علم ہوا تو میں بھی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

امیدواروں کی قطار میں کھڑا ہو گیا اور صبح سے انٹرویو کا انتظار کر رہا تھا۔ میڈیم ذکیہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ انہوں نے باقی پینل کی جانب دیکھا اور میرے انٹرویو کا آغاز ہو گیا اور میں آدھے گھنٹے تک ان کے مختلف سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ سوالات ایسے تھے کہ شاید اچھا خاصا پڑھا لکھا بندہ بھی بات کرنا بھول جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا مطالعہ اتنا زیادہ تھا کہ میں نے ان کے ہر سوال کے تسلی سے جواب دیا۔

آخری سوال تھا۔ ''ندیم آپ نے کس سبجیکٹ میں ماسٹر کیا ہے؟''

میں نے اعتماد سے جواب دیا۔ ''جی میں نے میٹرک پاس کیا ہے۔ اس کے بعد حالات نے کچھ پڑھنے ہی نہیں دیا۔''

''کیا؟'' پورا پینل حیرانی سے میرا منہ تکنے لگا۔

مجھے نام یاد نہیں پینل کے ایک ممبر نے کہا۔ ''صبح سے جتنے مرد و خواتین کے ہم نے انٹرویوز کیے، اُن میں سب سے کم تعلیم یافتہ گریجویٹ تھے اور آپ نے صرف میٹرک کیا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سر مجھے کیا پتا کہ آپ کو اسناد والے چاہئیں۔''

بس یہ ہی ایک پوائنٹ تھا کہ چار سو لوگوں میں سے 36 لوگ انٹرویو میں پاس ہوئے، جن میں ایک میں بھی تھا اور اس طرح 2003 مارچ میں تو اانا پاکستان پروگرام میں بطور فیلڈ ورکر کام کا آغاز ہو گیا۔ بڑے عرصے بعد گھر میں معقول آمدنی آنے سے حالات بدلنے لگنے اور پھر دن بدن حالات بگڑنے کی بجائے بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔ اس دوران میں نے ایف اے بھی کر لیا اور کوئی ایک سال بعد تو اانا پاکستان پروگرام ختم ہو گیا۔ نوکری ختم ہونے کے بعد ایک سال تک پھر بے روزگاری، لیکن یہ سلسلہ کوئی تین ماہ تک رہا۔ اس دوران ایک ادارے غریب سنز میں..... یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا، سات ہزار روپے پر نوکری مل گئی اور پھر 2005ء میں.....

میں نے پنجاب کے مختلف اضلاع کے دریائی علاقہ جات میں کام کرنے والے ایک ادارے دوآبہ فاؤنڈیشن میں بطور سوشل آرگنائزر کام کا آغاز کیا اور آج تک اسی ادارے کے مختلف منصوبہ جات میں کام کرتا چلا آ رہا ہوں۔ یہاں پر پہلے پہل دس ہزار سے آغاز ہونے والی تنخواہ ہزاروں میں جا پہنچی اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں لاکھوں میں کمانے لگا۔

جوانی کب آئی کچھ پتا نہیں کیوں کہ حالات نے ایسا جھنجوڑا تھا کہ بس حالات سنوارنے کے چکر میں جوانی کی اٹکھیلیاں ہی بھول گیا۔ عمر بیس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ حالات ٹھیک تھے۔ اب لکھنا آسان تھا، لیکن دفتر میں کام کا اتنا بوجھ تھا کہ کچھ لکھنا ناممکن ہو چکا تھا، مگر پھر بھی مہینے بھر میں ایک آدھ کہانی لکھ مارتا۔ پھر نئے گھر کی تعمیر میں نے اپنے گھر کی تعمیر اپنی خواہشات کے مطابق کی اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے ایک خوب صورت دو منزلہ گھر بنوانے میں کامیاب ہو گیا۔

اسی دوران میری شادی بھی طے پا گئی اور 11 اپریل 2011 کو رضوانہ مصطفیٰ میری شریک حیات بن کر میری زندگی میں آئی۔ ویسے میں جہاں میرے بہت سے دوست اور رشتہ دار مدعو تھے، وہاں میرے خاص مہمانوں میں شیخ سلیم ناز انچارج پھول اور کلیاں، شاہد حفیظ میسی، سلمیٰ فیصل اپنے میاں سمیت (انہوں نے اپنے دور میں خوب لکھا)، عرفات ظہور، زبیر ارشد، عبداللہ نظامی، ناصر ملک اور دیگر مقامی صحافی اور دانش ور بھی تھے۔

عبداللہ نظامی بڑا سیانا بندہ ہے۔ مجھے ادب کی طرف مائل کرنے کے لیے ہر ماہ ماہ نامہ تعمیر ادب کے کام میرے ذمے لگا دیتا اور میں آفس کے کاموں کے ساتھ ساتھ تعمیر ادب میں بطور ایڈیٹر بہت سے کام بھی کرتا رہتا اور آج اگر میں بچوں کے ادب میں زندہ ہوں تو وہ عبداللہ نظامی کی وجہ سے ہوں، کیوں کہ اس نے حالات کے بکھیڑوں میں بکھرے ہوئے ندیم اختر کو سمیٹا اور ماہ نامہ تعمیر ادب کی شکل میں سب کے سامنے پیش کر دیا۔

جب بندہ ایسے کاموں میں آتا ہے تو پھر مخالفین کی تعداد میں بھی اضافہ دیکھنے میں آتا ہے۔ سو پاکستان میں ہمارے اس کام سے خائف ہو کر بہت سے لوگ ہمارے مخالف بھی ہو گئے۔ عبدالرشید فاروقی کو پتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ اگر میری آپ بیتی ایک سال پہلے شائع ہوتی تو اس میں بہت سے ایسے راز افشاں ہوتے، جو پڑھنے والوں کو حیران کر دیتے کہ بچوں کے ادب میں ایسے چہرے بھی ہیں، جو اپنے چہروں پر بے عیب نظر آتے ہیں، لیکن اتنی لیٹ آپ بیتی بھیجنے کا مطلب ہے کہ اس ساری آپ بیتی کو ختم کر کے نئے سرے سے اسے لکھا گیا ہے اور دوستوں کے عیبوں کو صفحۂ قرطاس سے مٹا دیا ہے۔ اس سوچ کے پیش نظر کہ وہ ذات جو خالق ہے جس نے ہمارے عیب چھپا رکھے ہیں۔ اگر ہم اس کے بندوں کے عیب چھپائیں گے تو وہ ذات کتنی خوش

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہوگی۔

ہاں تو بات چل رہی تھی ندیم اختر کی زندگی کی...... !میری زندگی کا تیسرا دور لکھنے سے زیادہ بچوں کے ادب کے فروغ کی کوششوں میں زیادہ صرف ہوا۔ اس دور میں میری بہت سے ایسے چہروں سے ملاقات ہوئی، جن کے صرف نام پڑھ رکھے تھے، لیکن ان سے ملنے کی ہمیشہ سے طلب رہی تھی...... جیسے محبوب الٰہی مخمور بھائی۔

ایک بار محبوب بھائی ایڈیٹر کیمپ میں تشریف لائے۔ وہاں ان کی کتاب امن مشن کی رونمائی بھی تھی۔ میں ان کی محبت میں ان کی کتاب پر مقالہ پڑھنے کے لیے شعبہ بچوں کا ادب پہنچ گیا۔ وہاں اتنے سارے ایڈیٹر صاحبان سے ملاقات میری زندگی کی یادگار ملاقات ہے۔ عرفات ظہور میرا جگری یار ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ تھا۔ اس نے بھی محبوب الٰہی مخمور بھائی کی کتاب پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ ایسے ہی عمران یوسف زئی، ساجد حسن، خلیل جبار، ایم مجاہد، صفدر رضا رضوی، ایم ترک، نوشاد عادل (بڑا کمال کا بندہ ہے، کمال لکھتا ہے) نوشاد عادل کو میں بابا سمجھتا تھا، لیکن وہ تو پھرتیلا نوجوان واقع ہوا۔

ایک دور تھا جب پھول اور کلیاں میں لکھنے والوں کی آپس میں ملاقاتیں ہوتی تھیں، لیکن سن 2000 کے بعد ہر لکھنے والے مختلف حالات اور مصروفیت کی بنا پر لکھنے سے دور ہوتا چلا گیا۔ ایک بار میں نے اور عرفات ظہور نے پروگرام بنایا کہ کیوں نا پھول اور کلیاں کے پرانے لکھنے والوں کو تلاش کیا جائے اور تلاش کرنے کے بعد ان کے تقریب بہر ملاقات کا انعقاد کیا جائے۔ پھر ہم نے اللہ کا نام لے کر پھول اور کلیاں (روزنامہ نوائے ملتان) کے پرانے لکھاریوں کی تلاش جاری کی۔

جان جوکھم کا کام تھا، کیوں کہ جس دور میں سب مختلف تقریبات میں ملا کرتے تھے۔ اس دور میں خط و کتابت کا سلسلہ ہوا کرتا تھا اور آج کل انٹرنیٹ اور موبائل کا دور ہے۔ میں نے اور عرفات ظہور نے مل کر تلاش کا آغاز کیا۔ آنے والے بیس دنوں میں کوئی پچاس سے زائد سینئر لکھاریوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح 2011 میں رضا ہال ملتان میں تقریب بہر ملاقات کا انعقاد کیا۔ یہ ایک ایسی تقریب تھی، جس میں وہ لکھنے والے شریک تھے، جو بچپن میں ایک دوسرے سے بچھڑے تھے اور بارہ سال بعد ایک دوسرے کو دیکھ اور گلے مل رہے

تھے۔ مجھے اور عرفات ظہور کو دعائیں دے رہے تھے۔ یہ تقریب اس حوالے سے انوکھی تھی اس تقریب میں لکھاری خواتین و حضرات کے بچے بھی شامل تھے، جنھوں نے پورے ہال میں اودھم مچا رکھا تھا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔

شادی کے ایک سال بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹی کی شکل میں خوشیاں دیں، لیکن قسمت کو شاید یہ منظور نہیں تھا اور میری بیٹی پیدائش کے وقت ہی فوت ہو گئی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اولاد کے دکھ کا معلوم ہوا، لیکن اللہ کا رضا جان کر خاموش ہو گیا۔ کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ یہ دنیا فانی ہے۔ اگر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی چاہتے ہو تو کبھی بھی اس کے ذات کے فرمان کے نافرمانی نہ کرو۔ جب وہ تمھیں فلاح کی جانب بلائے تو سب کام چھوڑ کر سربسجود ہو جانا۔ بیٹی کا دکھ اندر ہی اندر کھا رہا تھا اور میری بیٹی کی پونیاں جو میں نے اپنے دفتر میں اپنے ٹیبل کے ایک دراز میں خرید کر رکھی تھی۔ انھیں روزانہ دیکھتا۔ جب اس کی یاد آتی تو آنکھیں چھلک پڑتیں۔ صبر بھی آ رہا تھا، لیکن دکھ ابھی بھی ویسے ہی تھا اور پھر ایک دن اس ذات سے رجوع کر لیا، جس نے میری زندگی بدل دی ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ صبر بھی آ گیا اور اللہ باری تعالیٰ نے 11 دسمبر 2013 کی رات عمیرہ کی شکل میں اپنی رحمت سے نواز دیا۔

ندیم اختر کی گڑیا اس دنیا میں کیا آئی کہ جیسے رحمت کے سارے در کھل گئے ہوں۔ انہی دنوں اللہ باری تعالیٰ نے مجھے ہمت اور استقامت دی اور میرا سفر نامہ "ذرا الو بیہ تنگ" چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا۔ ساتھ ہی میں نے کاشف بشیر کاشف، وسیم کھوکھر اور عبداللہ نظامی کے ساتھ مل کر پاکستان میں بچوں کے ادب پر طاری جمود کو توڑنے کے لیے "اک نئی دنیا کا قیام ممکن ہے" کا نعرہ لگایا اور "کاروان ادب پاکستان" کا قیام عمل میں آیا، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے پاکستان میں ایک ہلچل مچا دی۔

پہلے مرحلے میں کاروان ادب پاکستان نے پنجاب کے ان لکھاریوں کے لیے کاروان ادب کانفرنس کا انعقاد ساہیوال میں کیا، جو لکھنے والے شعبہ بچوں کا ادب کے تحت مختلف تربیتی ورکشاپس میں شریک ہو چکے تھے، جب کہ پنجاب کے علاوہ خیبر پختونخوا سے اسحاق وردگ، بلوچستان سے اظہر عباس (سابق صدر پاکستان یبنگ رائٹر فورم بلوچستان) اور سندھ سے سعید سعیدی نے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

نمائندگی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بڑی کامیابیوں کے پیچھے میرے والدین کی دعائیں، میری شریک حیات اور میری بیٹی عبیرہ ندیم کا ہے۔

اب اگلے مرحلے میں کاروان ادب پاکستان خیبر سے کراچی تک ٹرین کاروان کے ذریعے تمام ادیبوں کے ساتھ کراچی پہنچ رہا ہے، جس کے لیے خصوصاً کراچی کے دوست تیار ہو جائیں۔ جس میں اس بار شخصیات کی جگہ ادبی تنظیمیں اور پاکستان بھر کے رسائل شامل ہوں گے، جو دنیا میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہوگا۔

یہ تھی میری مختصر سی آپ بیتی..... جو میں گزشتہ دو سالوں وقفے وقفے سے لکھا پایا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ ابھی بہت سے موضوعات تشنہ رہ گئے ہیں۔ بہت سے ایسے حالات..... جن کا بچوں کے ادب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ احاطہ نہیں کر پایا۔ بہت سے ایسے نام جو میرے بہت ہی قریب ہیں، وہ واقعات نہ لکھنے کی وجہ سے رہ گئے ہوں گے، میں ان سے پیشگی معذرت بھی کروں گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

itsurdu.blogspot.com

پاکستان چلڈرن رائٹرز گائیڈ کے زیر اہتمام شائع ہونے والی تاریخ ساز کتاب

"آپ بیتیاں"

کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ندیم اختر..... محمد وسیم کھوکھر

کاروان ادب پاکستان

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محمد طاہر عمیر

کمالیہ جیسے قصبے سے اپنے قلم کا لوہا منوانے والے ادیب کی سحر
مسلسل کی داستان جس کی متعدد کہانیاں آپ کو سوچنے پر مجبور
کردیں گی۔

نوعمری میں ہی سنجیدہ اور اچھوتے موضوعات کو زیر قلم لانے والے کی آپ بیتی۔

اسکول میں اکثر کسی اہم شخصیت کی زندگی پہ مضمون لکھا جاتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ کاش کبھی ایسا وقت بھی آئے جب کوئی ''ہم'' پر اسی طرح کا مضمون لکھے کہ ہمیں ''تم'' کی بجائے ''آپ'' کہے۔ اپنی آپ بیتی لکھنے بیٹھا تو پھر یہی خیال آیا۔ نمونے کے طور پر اپنے ایک دوست کو یہ مضمون پیش کیا:

''آپ کا نام محمد طاہر عمیر تھا۔ آپ 23 مئی کو گرمیوں کے دن شہر کمالیہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم محلے کے اکلوتے انگلش میڈیم اسکول سے حاصل کی اور نہایت شریف اور لائق طالب علم کا خطاب پایا۔ اس کے بعد آپ نے مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ میں داخلہ کیا اور جب آپ نے یہاں سے میٹرک کی سند حاصل کی تو ساتھ میں آپ کو ایک عدد شرارتی اور نالائق طالب علم کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ صوبے بھر میں سب سے زیادہ ہنگامہ آرائی کرنے والے پی ایس ٹی کالج سے آپ نے بی اے کی ڈگری حاصل کی، لیکن یہاں آپ کی اصل کامیابی یہ تھی کہ آپ بغیر کوئی بڑی تڑوائے صحیح سلامت گھر کو لوٹے۔ اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ''فیصل آباد'' تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے ایم اے (سیاسیات) کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور ٹورازم اینڈ ہوٹل مینجمنٹ کے کورسز کیے اور پھر ایک طویل عرصے کے لیے ''بے روزگاری'' جیسے اہم مقام پہ فائز ہوئے۔ اب تک کی اپنی پوری زندگی میں آپ نے کوئی ایسا قابل فخر کارنامہ سرانجام نہیں دیا، جو قوم کے لیے باعث فخر ہو، لہٰذا یہ مضمون

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اس شعر کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے کہ:

''فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔۔۔۔میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے۔''

میرے دوست نے یہ مضمون پڑھ کے صرف اتنا کہا۔ ''یہ آپ بیتی نہیں۔۔۔آپ بیتی ہے۔۔۔مطلب کیے کرائے پہ پانی پھرا ہوا ہے۔۔۔تم محض ''تم'' ہی ہو۔۔۔تم ''آپ'' بننے کی کوشش نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔''

اور میں جواب میں بس یہی کہہ سکا۔''یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی۔۔۔۔دل کو لگتی ہے بات بکری کی۔''

انوکھی کہانیاں نے آپ بیتی کا جو منفرد سلسلہ شروع کیا،اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے،لیکن اپنے محبوب ایڈیٹر محبوب الٰہی مخمور کا شکریہ ادا کرنا تو بنتا ہے۔ مجھے شروع سے ہی کہہ رہے تھے کہ اپنی آپ بیتی بھیجو۔۔یقین مانیے...... میں نے آپ بیتی تقریباً چار بار لکھ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ ہر ماہ جب میں انوکھی کہانیاں میں بچوں کے ادب کی ان قدآور شخصیات کی آپ بیتی پڑھتا تو اپنا آپ اور بھی چھوٹا محسوس ہونے لگتا۔آپ بیتی تو وہ لکھتے ہیں،جن کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہو۔کسی مشن کی تکمیل میں گذری ہو۔۔کوئی نصب العین ہو، جس پر ساری عمر کاربند رہے ہوں،جن کے بارے میں پڑھ کر اور جان کر پڑھنے والے کے دل میں ان جیسا بننے کی تمنا جاگے۔ میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا۔اور اگر محبوب بھائی کے اصرار پر میں اس پلیٹ فارم پر آیا ہوں تو صرف یہ کہنے۔''شکریہ سر۔''

کچھ اپنے شہر کمالیہ کے بارے میں بتاتا ہوں۔شہر سے باہر اکثر جب لوگ مجھ سے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔''کمالیہ؟ یہ کہاں ہے؟''

میں انہیں مختصر جواب دیتا ہوں۔''بھائی آپ گوگل میپ پر دیکھ لیں۔''

کمالیہ پنجاب کے معروف ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل ہے۔دریائے راوی کنارے یہ ایک چھوٹا سا شہر اور کئی دیہاتوں پر مشتمل زرعی علاقہ ہے۔کمالیہ شہر کا ایک سرا ٹوبہ ٹیک سنگھ اور دوسرا چیچہ وطنی سے جا ملتا ہے۔تاریخ کے اعتبار سے یہ بہت پرانے شہروں میں سے ایک شہر ہے ۔یہاں بہت سے تاریخی دور کی عمارتیں اور نہایت قدیم بزرگانِ دین کے مزارات ہیں۔

مجھ سے کسی نے پوچھا تھا۔''کمالیہ کی خاص بات کیا ہے؟''

میں نے جواب میں سچ کہا تھا۔''اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں ''چھوٹا آدمی'' پیدا ہوتا ہے اور جب وہ ''بڑا آدمی'' بن جاتا ہے تو یہ شہر چھوڑ جاتا ہے۔''

کمالیہ دہشت گردی کے عفریت سے دور ایک پرامن شہر ہے جس کی فضا میں گاؤں کی خوشبو ہے مگر مکان سارے پکے ہیں۔کمالیہ اپنے کھدر،پولٹری فارمنگ اور زراعت کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ہجرت کے بعد میرے نانا جی اور سارا خاندان یہیں آ کر آباد ہوئے اور کھدر(ہاتھ سے بنا جانے والا ایک کپڑا) کی صنعت میں شمولیت اختیار کی۔بجائے اس کے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ سابق رکن قومی اسمبلی ریاض فتیانہ،اور خالد احمد خاں کھرل کا تعلق بھی کمالیہ سے ہے۔آپ اگر ماہ نامہ پھول کا کوئی سالگرہ نمبر لے کر اس میں میرا تعارف پڑھ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا جس میں ایڈیٹر بھیا نے لکھا تھا۔کمالیہ کی دو چیزیں مشہور ہیں،کھدر اور طاہر عمیر۔(اپنے منہ میاں مٹھو...... کہہ سکتے ہیں آپ۔)

زندگی ہو یا آپ بیتی شروع ''والدین'' سے ہی ہوتی ہے،مگر سچ تو یہ ہے کہ ساری دنیا کے ''ابو'' اور ساری دنیا کی ''مائیں'' سب ایک جیسے ہوتے ہیں،خیال رکھنے والے،پیار کرنے والے اور مخلص۔۔لہٰذا میں اگر یہ کہتا ہوں کہ میری ماں دنیا کی سب سے پیار کرنے والی ماں ہے تو اسے محض میرا کہا گیا ایک جملہ مت سمجھیے گا۔ایک لمحے کو اپنے دل میں اپنی ماں کو یاد کر کے محسوس کیجیے گا،جتنا وہ آپ سے پیار کرتی ہیں،اتنا ہی میری ماں مجھ سے پیار کرتی ہے۔

چار بہن بھائیوں میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ہم چاروں بہن بھائیوں میں ''آپ جناب'' کا کوئی تکلف نہیں،مطلب ہم چاروں ایک دوسرے کو ''آپا'' یا ''بھائی'' کہنے کی بجائے نام لے کے بات کرتے ہیں۔ہماری مادری زبان ''پنجابی'' ہے۔اردو ہماری ''اسکولی'' زبان تھی۔

دنیا میں جب بھی کسی اسکول کا نام آتا ہے،مجھے اپنا پہلا اسکول ضرور یاد آتا ہے،جو آج بھی میرے گھر سے ایک گلی کے فاصلے پر ہے،ذیشان ماڈل اسکول...... یہ انگلش میڈیم اسکول ہے۔اس اسکول کی اگر میں تعریف کروں تو محض دو لفظ کافی ہوں گے۔یونی فارم اور ڈسپلن۔ان جیسا مکمل اور خوب صورت یونی فارم میں نے کہیں اور نہیں دیکھا اور ڈسپلن جو میں نے یہاں سے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

سیکھا، وہ آج تک میرے ساتھ ہے۔ ہماری کلاس میں محض پندرہ سے بیس بچے تھے اور ہم سب ایک دوسرے کے ایسے دوست بنے کہ اگلے کئی سال بعد جب ہم اسکول چھوڑ رہے تھے تو ہمیں احساس ہوا کہ خزاں رسیدہ درختوں کے پتے جھڑنے سے پہلے کپکپاتے کیوں ہیں۔ وہ ایک تعلق ختم کرنا ایسے لگتا ہے جیسے زندگی ختم ہو رہی ہو، مگر پرانے پتے جائیں گے تبھی تو نئے آسکیں گے۔ یہ زندگی کا وہ پہلا سبق تھا، جو ہمیں کسی نے سکھایا نہیں، بلکہ قدرت نے سمجھایا تھا۔ اسکول میں میں ایک لائق طالب علم تھا اور ہر سال وکٹری اسٹینڈ پر کہیں نہ کہیں جگہ حاصل کر لیتا تھا۔ پھر ہم گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ میں داخل ہو گئے۔ میرے ساتھ میرے اسکول کے صرف دو دوست ہی تھے۔ ہائی اسکول میں میرے ساتھ ایک چھوٹا سا ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے ایک لائق طالب علم سے نالائق طالب علم میں تبدیل کر دیا۔

ہائی اسکول میں یونی فارم کی پابندی تھی، نہ ہی اس بات کی پروا کہ صبح کون منہ دھو کے آتا ہے اور کون نہیں۔ کتابوں پر کور چڑھائے ہیں یا نہیں، پاؤں میں سیاہ بوٹ ہیں یا چپل، لیکن ان سب باتوں کی بجائے جس بات نے مجھے تبدیل کر دیا وہ یہ تھی کہ جب پہلی بار امتحان ہوا تو اس میں ایسے سوال تھے، جنہیں ہم انگلش میڈیم کی دوسری سے تیسری جماعت میں پڑھ چکے تھے۔ بڑی اے بی سی لکھیں۔ چھوٹی اے بی سی لکھیں۔ دو جمع دو کتنے ہوتے ہیں اور ایسے ہی اور دراصل شہر میں صرف دو ہی انگلش میڈیم اسکول تھے ہائی اسکول میں آنے والے زیادہ تر طالب علم اردو میڈیم سکول اور ان سے بھی زیادہ تعداد ان لڑکوں کی تھی، جو گاؤں کے ایسے اسکولوں سے آئے تھے، جہاں انہیں ٹیچر بھی میسر نہیں تھا۔ تو ہائی سکول کی چھٹی کلاس میں سارے رنگ برنگے بچوں کو یکساں نصاب تعلیم پر لانے کے لیے انہوں نے ''اے بی سی'' پڑھانی شروع کر دی۔ جس کا مجھ پر اثر یہ ہوا کہ میں نے پڑھائی میں دل چسپی ہی کم کر دی، کیوں کہ مجھے سبق یاد کیے بغیر ہی سبق آتا تھا، لیکن جب سبق یاد کرنے کی ہی عادت ختم ہو گئی تو پھر میں کیسے ایک اچھا طالب علم بن سکتا تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قصور وار گورنمنٹ اسکول کی انتظامیہ تھی۔ قصور وار میں ہی تھا، جس کا مجھے آج بھی افسوس ہے، کیوں کہ اس واقعے سے میری تعلیمی کارکردگی بہت متاثر ہوئی۔ ویسے بھی وجہ محض یہ بھی نہیں تھی کہ سبق یاد کرنا چھوڑ دیا ایک وجہ اور بھی تھی، جس کا ذکر میں آگے کروں گا۔

محمد طاہر عمیر۔ بچوں کے ادب کا ایک روشن ستارہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

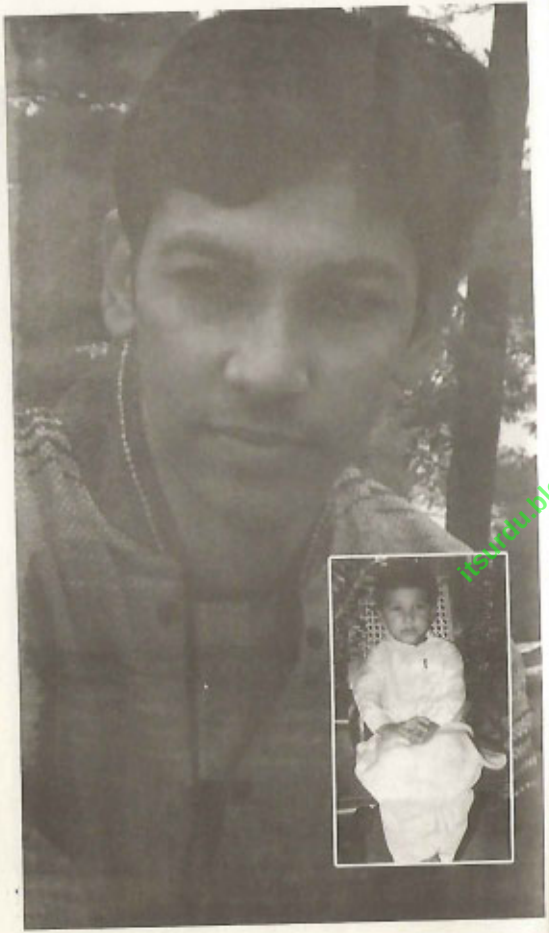

محمد طاہر عمیر بہترین کہانی پر ممتاز ناول نگار مظہر کلیم اور محبوب الٰہی مخمور سے ایوارڈ وصول کر رہے ہیں۔

itsurdu.blogspot.com

علی عمران ممتاز، عمران یوسف زئی، شوکت علی مظفر، فاروق دانش، محبوب الٰہی مخمور، ممتاز رضا بھٹی، رفعت اللہ خان، ڈاکٹر افتخار کھوکھر، ڈاکٹر اسلام شفیر، علی حسن ساجد، محمد علی طفیل، جبار، ممتاز علی بخاری

ممتاز رضا بھٹی، محبوب الٰہی مخمور، محمد علی، علی حسن ساجد

عمران یوسف زئی، علی حسن ساجد، محبوب الٰہی مخمور، شوکت علی مظفر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہائی اسکول سے میں نے میٹرک کیا اور پھر میں پہنچا اس مایہ ناز تعلیمی ادارے میں، جس کا نام ''گورنمنٹ پی۔ایس۔ٹی کالج کمالیہ ہے۔

صوبے بھر میں اس کالج کی وجہ شہرت اس کے وہ طالب علم نہیں ہیں، جو کلاس روم میں پائے جاتے تھے، بلکہ وہ طالب علم تھے جو کبھی آپس میں، کبھی پبلک ٹرانسپورٹ کے ڈرائیوروں سے کبھی کالج انتظامیہ سے، تو کبھی راہ گذرتے کسی بھی شریف آدمی سے لڑائی کیے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے باوجود اس کے کہ اب اس کالج میں ایسا کچھ نہیں ہوتا، لیکن ابھی بھی آپ کمالیہ کے دونوں اطراف سے شہر سے باہر جانا چاہتے ہیں تو بس ڈرائیور ''اسٹوڈنٹس'' سے کرایہ مانگنے کی جرات نہیں کرتا۔ کالج میں میں ان لڑکوں میں شامل تھا، جو کلاس روم میں پائے جاتے تھے تو اس کی وجہ اپنا ''شریف'' ہونا ہرگز نہیں تھا، بلکہ اصل وجہ ''خرابی صحت'' تھی۔ اکثر اوقات تو ہم کسی لڑائی کے قریب سے بھی گذرتے تو لڑنے والے لڑائی چھوڑ کے ہمیں راستہ دے دیتے کہ پہلے ان موصوف کو گزرنے دو، جن کی جان کو پھونک مارنے سے بھی خطرہ ہے۔

بہرحال کالج کی زندگی ہر کسی کی طرح میرے لیے بھی کچھ نیا پن لائی تھی۔ اصل میں تو کالج تعلیم دینے کی بجائے ہمارے کردار کو بہتر کرتا ہے۔ صاف ستھرا لباس، گفتگو میں سلیقہ بلکہ کسی حد تک اوپن مین، غیر نصابی سرگرمیاں، تقاریب، کھیل، ان سب چیزوں سے ہماری اس شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے جس پہ ہم نے اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنی ہوتی ہے۔

ایک اور مزے کا واقعہ سن لیں ۔۔۔ کالج سے پہلے میں بھی سب لڑکوں کی طرح گلیوں، میدانوں، سکولوں میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ کالج میں بھی ایسا ہی کرنے کو سوچا۔ پروفیسر صاحب سے کہا۔ ''جناب ٹیم میں جگہ دے دیں۔''

انہوں نے پہلے چشمے کے پیچھے سے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر چشمہ اتار کر مجھے دیکھا اور گلا کھنکار کر یوں بولے۔ ''یار صحت کے لحاظ سے تم بیٹس مین نہیں لگتے۔ باؤلنگ کراؤ گے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ فاسٹ باؤلر بن سکو۔ ہاں اسپن باؤلر بن سکتے ہو، لیکن اگر اس بات کی گارنٹی دو کہ تمہاری پھینکی ہوئی گیند بیٹسمین تک پہنچ جائے۔''

میں نے اس بات پر تذلیل محسوس کرنے کی بجائے حقیقت حال کو تسلیم کیا اور یوں میں بیڈ

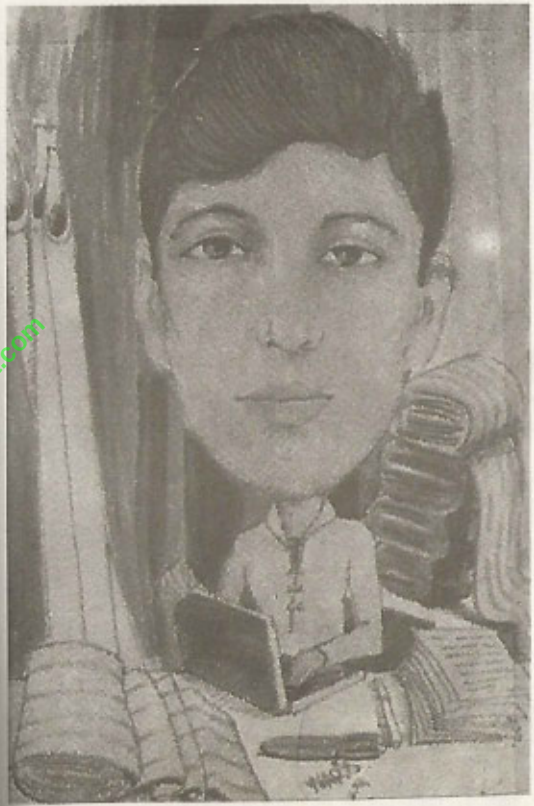

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

منشن فلسفیر بن گیا۔

کالج میں ہمارے روز کے دن کچھ یوں گزرتے تھے۔ صبح جلدی آنا۔ پہلا پریڈ لینا اور پھر کالج کے چھوٹے چھوٹے میدانوں میں سے کسی ایک میں گوشہ تنہائی ڈھونڈ کر (جس کی ہرگز کوئی کمی نہ تھی) سو جانا۔ دراصل پہلے پریڈ کے پروفیسر صاحب بڑے سخت تھے، ورنہ ہمیں وہاں نہ جانے میں بھی کوئی قباحت نہ تھی۔ خیر جب سو کے اٹھتے تو غالباً چوتھا پریڈ چل رہا ہوتا تھا۔ ہم سیدھے لائبریری پہنچتے۔ تازہ اخبار کا مطالعہ کر کے اپنے دوستوں سے ساتھ کینٹین میں سموسے کھا کر۔۔۔ اگر موڈ ہوا تو ایک اور پریڈ لے کر گھر کو روانہ۔

کالج سے پاس آؤٹ کرنے کے بعد میں کمپیوٹر اور ہوٹل مینجمنٹ کے کورسز کرنے اپنے شہر سے باہر نکلا اور اپنے قریب ترین شہر فیصل آباد پہنچا۔ یہ میرا گھر سے دور رہنے کا پہلا تجربہ تھا۔ یہاں رہ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ہاسٹل میں رہنے والوں کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں دو راستے ہوتے ہیں۔ گھر سے دور، بالکل نیا ماحول۔ یہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا، کوئی روک ٹوک نہیں، جو دل میں آئے کر سکتے ہو۔ راتوں کو لمبی سڑکیں ناپو یا سارا دن سو کر گزارو۔۔۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب ہمیں ایسی مٹھی بھر آزادی ملتی ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم اندر سے کتنے اچھے ہیں اور کتنے برے ہیں۔

ہاسٹل کی زندگی آپ کو ایک مکمل پریکٹیکل زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپ اپنے اخراجات کا پہلی بار بجٹ بناتے ہیں، اپنی ترجیحات کی لسٹ بناتے ہیں، اپنے خواہش نفس کا مقابلہ کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آپ ان کاموں کو سرانجام دینے کی کوشش یا ان سے پرہیز کرتے ہیں، جو آپ اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کی وجہ سے نہیں کر سکتے اور جیسا کہ میں نے کہا ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم اندر سے کتنے اچھے ہیں یا کتنے برے۔

میرا تعلیمی دور گراف پیپر پر بنی اس لکیر کی طرح ہے جو کبھی اوپر کو بلند ہوتی ہے تو کبھی نیچے۔ اس دور میں دوست ہیں، یادیں ہیں، آزادی ہے، نئے نئے احساسات ہیں۔ اور وہ سب کچھ ہے جو ایک انسان کو اس کی اخلاقیات کی بنیاد میسر کرتا ہے۔ میں اسکول میں لائق طالب علم تھا، ہائی اسکول میں نالائق۔ کالج میں درمیانے درجے کا طالب علم تھا تو فیصل آباد کے کالج میں میں نے ہر

سمسٹر پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس کر کے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ دوبارہ حاصل کی، لیکن یہ اختتام تھا میرے تعلیمی کیریئر کا جو کہ بہت اچھے انداز میں ہو، مگر اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جیسے زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے ویسے ویسے تعلیم بھی آگے بڑھتی ہے تو اسکول کالج سے فارغ ہو کے بھی یہ مت سمجھو کہ تعلیمی کیریئر ختم ہوا، لیکن یہ دراصل شروعات ہوتی ہے۔ پہلے ہم ایک چار دیواری کے اندر اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اب۔۔۔ اب چار دیواری باقی نہیں رہتی۔۔۔ اب ہم چار سمتوں میں بیٹھ کر قدرت سے زندگی کا سبق حاصل کرتے ہیں اور یہ سبق جہاں بہت سخت ہوتا ہے، وہیں یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی آدھی چھٹی یا پوری چھٹی نہیں ہوتی اور تب ایک حقیقت کھلتی ہے کہ جب ہم اسکول کالجوں میں پڑھ رہے ہوتے ہیں تو پڑھائی ہمیں دنیا کی مشکل ترین شے لگتی ہے، لیکن جب ہم تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ہمیں دنیا کا سب سے آسان ترین کام "پڑھائی" لگتا ہے، مگر گیا وقت...... منہ سے نکلے الفاظ کی طرح کبھی واپس نہیں آتا۔ وہ وقت جو ہماری مٹھی میں ہوتا ہے، ہم اسے ریت کی طرح اپنی انگلیوں کے رستے بہا دیتے ہیں اور پھر جب وہ ماضی کا ایک حصہ بن جاتا ہے تو ہم بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں:

تو مجھے ڈھونڈ میں تمہیں ڈھونڈوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کوئی ہم میں سے رہ گیا ہے کہیں

میرا ادبی سفر کچھ یوں ہے۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب زندگی نئی نئی طلوع ہوئی تھی۔ آسمان پر بہت سے پرندے اڑا کرتے تھے اور رات کو ستارے اتنے قریب محسوس ہوتے کہ ہاتھ سے پکڑنے کو جی چاہتا۔ ایسی ہی ایک رات میں نے اپنی دادی سے اپنی زندگی کی پہلی کہانی سنی، وہی کہانی جو پاکستان میں ہر دوسرے بچے کو سنائی جاتی ہے "چڑیا لائی دال کا دانہ چڑا لایا چاول کا دانہ۔"

پانچویں کلاس تک پہنچتے ہوئے میں "پھول کلیاں" اور عمرو ناز زن کا باقاعدہ قاری بن چکا تھا اور پہلی کہانی میں نے آٹھویں کلاس میں بنی۔ افسوس کہ اسے لکھا نہیں۔ دراصل اپنی کلاس میں میں بے تحاشا کہانیاں پڑھنے والا بچہ تھا، اس لیے اکثر دوست مجھ سے کہانیاں سنتے۔ میں روز ایک روپے کی دو کہانیاں خرید کر پڑھتا اور دوستوں کو سناتا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ میں کہانیاں خرید نہ سکا اور

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

دوستوں کے پرزور اصرار پر میں نے جتنی بھی کہانیاں پڑھی تھیں، ان کو ملا کر ایک کہانی سنانی شروع کی۔ اس کہانی میں عمرو تھا، ٹارزن تھا، کوہ قاف، سامری، شہزادی، بادشاہ، ہلکز ہارا، الہ دین علی بابا، سپر مین، سارے کردار یکجا کر دیے اور یہ کہانی قریباً ایک سال تک چلتی رہی۔

یوں مجھے احساس ہوا کہ میں خود بھی کہانی لکھ سکتا ہوں، لیکن ابھی بھی لکھنا شروع نہیں کیا۔ کہانیاں نہ خریدنے کی وجہ یہ تھی کہ اب میں ''عمران سیریز'' پڑھنے لگا تھا اور ساتھ میں مختلف اقسام کے ڈائجسٹ کا قاری بن گیا، جن میں سالوں پر مشتمل طویل ناول اقساط کی صورت میں ہوتے تھے۔ انہی دنوں میں میں نے پہلی بار ایک کہانی لکھ کر ''پھول کلیاں'' کو بھیجی۔ اور اس پر اپنے نام کے بجائے ایک دوست کا نام لکھا۔۔۔ وہ شائع ہوئی تو میں حالت افسوس میں تھا اور میرا دوست بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ دو ہفتے بعد میری دوسری کہانی میرے اپنے نام سے شائع ہوئی۔

پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ نوائے وقت، خبریں، جنگ، اخبار جہاں میں بچوں کے تمام ایڈیشنز میں میری تقریباً پچاس کے لگ بھگ کہانیاں شائع ہوئیں، جن کی کٹنگ میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ کالج میں پہنچ کر میں ادبی کتابوں کی طرف متوجہ ہوا اور پھر کالج کے چار سالوں میں میں نے اردو ادب کی تقریباً ہر کلاسک، فکشن اور رومانٹک کتاب پڑھ لی تھی۔ کالج کی لائبریری کو چاٹ چکنے کے بعد میری حالت ایسی تھی کہ مطالعہ کے بغیر نہ رات کو نیند آتی تھی نہ دن کو چین۔ ہمارے شہر میں کوئی چھوٹی بڑی لائبریری نہیں تھی، لیکن کہتے ہیں نا کہ تلاش کرنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے اور میں تو پھر بھی محض کتابیں تلاش کر رہا تھا۔ گھر سے دو کلومیٹر دور ایک دکان دار تک جا پہنچا، جو پانچ روپے روز کرایہ پر کتابیں دیتا تھا۔ جب میں دکان میں داخل ہوا تو حیرت کے مارے گنگ تھا۔ چھوٹی سی دکان میں بس کتابیں ہی کتابیں تھیں۔۔۔ دکان دار صاحب دکان سے باہر ایک اسٹول پر تشریف فرما تھے اور ایک ٹیپ ریکارڈر پر فلم مولا جٹ کے ڈائیلاگ ''آڈیو'' سن رہے تھے۔ خیر اپنی اس بندے سے خوب جمی، حتیٰ کہ آج سے کچھ دن قبل ان کی وفات تک یہ سلسلہ جاری رہا تھا۔

کالج دور میں ہی میرا رابطہ ماہنامہ پھول سے ہوا۔ میں نے پہلی بار ماہ نامہ پھول میں کہانی بھیجی۔ اختر عباس صاحب ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ایک خط لکھا'' آج کی موصول

شدہ چار سو کہانیوں میں سے آپ کی کہانی پتا نہیں کیوں اور کیسے ساری کی ساری پڑھ لی کیوں کہ طوالت کے لحاظ سے اس کی باری بہت عرصے بعد آنا تھی۔ کہانی اچھی ہے، لیکن اتنی طویل ہے کہ میں پریشان ہوں کہ اسے کس طرح مختصر کروں۔ تم جتنا مطالعہ کرو گے، اتنا ہی اچھا لکھو گے، لیکن لکھنے سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ہر رسالے کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ تم کہانی اس رسالے کے مزاج کو مد نظر رکھ کے لکھو گے تو کوئی بھی ایڈیٹر تمہاری کہانی ''ناقابل اشاعت'' قرار نہیں دے گا اور ہمیشہ مختصر تحریر لکھو کہ طویل تحریر شائع ہونے میں بہت وقت لگاتی ہے۔''

یہ وہ جملے تھے جنہیں میں نے صرف پڑھا نہیں، بلکہ اپنا نصاب العین بنا لیا۔ چنانچہ 2003، میری پہلی کہانی ''آتنک وادی'' پھول میں شائع ہوئی۔ تب پھول کے ایڈیٹر جناب شعیب مرزا تھے۔ شعیب بھائی بہت مشفق اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ آج اگر کوئی مجھ سے کہتا ہے کہ تمہاری تحریروں میں پختگی ہے تو اس میں شعیب بھائی کا بڑا کردار ہے، کیوں کہ وہ میری تحریروں سے ہر وہ لفظ ختم کر دیتے تھے، جس کا نہ ہونا بہتر تھا اور میں آئندہ سے اس کی اصلاح کر لیتا۔ باوجود اس کے کہ میری ہر تحریر شائع ہوتی وہ بار بار کہتے ''انگلش کے الفاظ مت لکھا کرو'' اور خدا کا شکر ہے کہ یہ عادت بھی بہت حد تک ٹھیک ہو گئی۔

پھول کی ایک ایوارڈ تقریب میں میری ملاقات ان پھول بھائی سے ہوئی جن کے بارے میں شاید ہی کوئی نہ جانتا ہو گا، کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ مجھے اس تقریب میں ایوارڈ ملنا زیادہ اہم بات نہ تھی، بلکہ حقیقت میں عبدالصمد مظفر سے، جنہیں دنیا پھول بھائی اور میں ''ویر جی'' کہتا ہوں...... ملاقات ہونا تھی۔ ماہ نامہ پھول کے علاوہ میں نے جتنے رسالوں میں بھی لکھا، مجھ سے ہر تحریر میرے ویر جی نے ہی لکھوائی ہے۔ پشاور کا شاہین ہو، راولپنڈی کا پیغام، گوجرانوالہ کا زاد الفردوس ہو یا پیا ملتان کا کرن کرن روشنی۔۔۔ یا لاہور میں پنجابی زبان کا پکھیرو...... ویر جی کی بدولت میرا رابطہ بچوں کے دوسرے ادیبوں اور ایڈیٹرز سے ہوا۔ نذیر انبالوی صاحب، کاشف علی نیئر، اسامہ ضیاء یوسف زئی، اشرف سہیل، علی عمران ممتاز، جہیم عالم، لطیف کھوکھر صاحب...... بہت سے نام ہیں۔ حوصلہ افزائی وہ تھپکیاں ہوتی ہیں، جو آپ کی محنت کا پھل ہوتی ہیں اور حوصلہ افزائی ہمیشہ وہ کرتے ہیں، جو آپ سے مخلص ہوں۔ خدا نے مجھ سے کرم کیا کہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

مجھے جو بھی ملا مخلص دوست بن کر ہی ملا۔

کراچی کی رسالوں کے بارے میں ایک بڑا غلط تاثر یہ تھا کہ وہ میگزین سیاست بازی کرتے ہیں۔ اپنے صوبوں کے علاوہ وہ کہانیاں شائع نہیں کرتے اور ایسی ہی کچھ اور باتیں جن کی وجہ سے میں ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا، مگر خواہش بڑے عرصے سے تھی کہ کبھی انوکھی کہانیاں اور نونہال جیسے رسالوں میں لکھوں، جن کا نام ہی معیار کی ضمانت ہوتا ہے۔ نونہال میں لکھنے کا خواب تو پورا نہ ہو سکا لیکن انوکھی کہانیاں میں لکھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور یہیں میرا رابطہ جی ایم ترک اور محبوب صاحب سے ہوا، جن کی حوصلہ افزائی نے میرے اعتماد میں اور بھی اضافہ کیا اور مجھ پر واضح ہوا کہ کراچی والوں کے خلاف کیا جانے والا پروپیگنڈہ درست نہیں ہے۔

کچھ عرصہ بعد جب ملتان میں ایک تقریب کے دوران چلڈرن رائٹرز گائیڈ کے عہدے داروں سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سب کو اپنے تخیل سے سے زیادہ خوش نما پایا۔ کچھ لوگ مسافتوں کے ویران رستوں پر اُگے ہوئے گھنے سایہ دار درخت جیسے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ہیں محبوب الٰہی مخمور صاحب۔

ملتان تقریب میں مظہر کلیم سے ملاقات ایک دیرینہ خواہش تھی، لیکن ساتھ میں علی عمران ممتاز، نعیم احمد سیال، حیات خان نیازی، فہیم عالم، سے ملاقات بھی میری بہت اچھی یادوں کا ایک حصہ بنی ہیں۔ بالکل اسی طرح کچھ سنہرے پل آج بھی ذہن کے افق پر نقش ہیں۔ جب لاہور میں ڈاکٹر مجید نظامی، سابق گورنر شاہد حامد، جسٹس (ر) عظمت شیخ صاحب اور شعیب بھائی سے ایوارڈ حاصل کیے تھے۔ اور پھر اسلام آباد آرٹس کونسل میں حکومت پاکستان کی طرف سے ملنے والا انعام بھی میرے ادبی سفر کا ایک حسین سنگ میل تھا۔ اس کے علاوہ یو ایس ایڈ، ماہ نامہ پھول، الدعوۃ اکیڈمی اور چلڈرن رائٹرز گائیڈ کی طرف سے ''بہترین لکھاری'' کے ایوارڈ بھی ملے اور تقریباً تیس کے قریب کہانیاں مختلف مقابلوں اور میگزینوں میں انعام یافتہ قرار پائی۔۔۔ اور میں اللہ کی بارگاہ میں سجدہ شکر بجالاتا ہوں، جس کے ہاتھ میں عزت اور ذلت ہے۔

میں نے ہمیشہ اپنے لیے لکھا، جب میں اپنی کہانیوں میں کوئی اچھی بات یا اچھی نصیحت کرتا ہوں تو کوشش ہوتی ہے کہ اسے پہلے خود پہ نافذ کر سکوں، کیوں کہ اگر میری کہانی نے میری ہی اچھی

تربیت نہیں کی تو وہ کسی اور کی کیسے کر سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی اچھی بات لکھنا، جو خود لکھنے والے میں نہ ہو، محض ''جھوٹ'' ہوتی ہے، لہٰذا ہمیشہ سچ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر لکھنے والے کو اپنی ہر تخلیق سے پیار ہوتا ہے، لیکن جو کام آپ کا نام بن جائے اس پر خوشی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ مجھے بھی اپنی کہانیوں میں ''دعا''۔۔۔۔۔ ''صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم''۔۔۔۔ ''ساتواں طلسم''۔۔۔۔ ''سفید چھڑی'' اور اکلوتے ناول ''القدس کا جانباز'' پر زیادہ خوشی اس لیے ہوتی ہے کہ یہ کہانیاں لوگوں کو میرے نام سے روشناس کروا گئیں۔

جب بھی کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ لکھنے کے لیے کیا ضروری ہے تو میرا جواب یک حرفی ہوتا ہے۔۔۔ مطالعہ، کیوں کہ ایک چیز جو میں بہت پہلے سیکھ گیا تھا، وہ یہ تھی کہ سو میں سے ننانوے فیصد مطالعہ کرو گے تو ایک فیصد لکھا جائے گا، لہٰذا مطالعہ کبھی کم نہیں ہوا۔ وہ آج بھی میرے ساتھ ہے۔

پسندیدہ کتابوں کے بارے میں لکھنے لگوں تو بات اور بھی طویل ہو جائے گی۔ ہاں مگر اردو ادب میں مجھے منٹو، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، یوسفی صاحب، اور ابن صفی بہت پسند ہیں۔ شاعری میں غالب، اقبال، فیض، جون ایلیا اور گلزار پسندیدہ ہیں۔ غیر ملکی ادب میں خلیل جبران، رسول حمزہ توف، آسکر وائلڈ، او ہنری، ارنسٹ ہیمنگ وے پسند ہے۔ وہ ایک کہانی جسے پڑھ کر میرا دل چاہا کہ کاش میں نے لکھی ہوتی وہ آسکر وائلڈ کی ''ہیپی پرنس'' ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ دنیا بھر میں ''بچوں کا ادب'' اس قدر مقبول ہے کہ چھوٹوں کے ساتھ ساتھ ''بڑوں'' اور ''بابوں'' میں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ آپ سنڈریلا کو لے لیں۔ ہینسل اینڈ گریٹل، ریڈ ہڈ، سویا ہوا محل ہو، آخری پتہ، اور ہیپی پرنس۔ ہر کہانی اپنی جگہ کمال ہے اور ہر کہانی اس قدر مقبول ہے کہ ہر بڑے چھوٹے کی زبان پر ہوگی۔ ان کہانیوں پر کارٹون بنے، فلمیں بنی۔ ہیری پوٹر میں ایسا کیا ہے کہ ساری دنیا اس کی دیوانی ہے؟ ساری دنیا سمیت پاکستان کے بچے بھی ان غیر ملکی بچوں کے کہانیوں کے دیوانے ہیں۔ اور ذرا پاکستان کو دیکھیے...... یہاں بچوں کے کتنے رسائل چھپتے ہیں؟ مجھے تعداد کا صحیح علم نہیں، مگر پچاس کے لگ بھگ بھی ہو اور ہر ایک میں دس کہانیاں شائع ہوں تو تقریباً پانچ سو کہانی ہر ماہ شائع ہوتی ہوگی۔ کیا کوئی ایک کہانی بھی ایسی ہے جسے بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اچھا نہیں لکھتے۔ ایک سے بڑھ کر

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ایک بہترین لکھاری ہمارے پاس ہے۔ بس اگر نہیں ہے تو وہ ہے اتفاق۔ جیسے بحیثیت مسلمان ہم کئی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، بالکل ایسے ہی ہم بچوں کے ادب میں بھی کئی طرح کے گروہوں میں تقسیم ہیں۔ کاش کہ ہم سب ایک پلیٹ فارم پر اس ایک مقصد کی خاطر اکٹھے ہوں کہ دنیا کو اپنا ادب دکھا سکیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا آسکر وائلڈ اور او ہنری کے برابر میں ہمارے لکھاریوں کو کھڑا کر سکتی ہے۔ اگر ہمارے بچوں کے ناول انگلش میں ترجمہ کیے جائیں تو وہ بھی ہیری پوٹر، ایلس ان ونڈر لینڈ، چارلی اینڈ دی چاکلیٹ فیکٹری جیسی مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں۔

آخری بات کہنا چاہوں گا۔ آخری بات کا مطلب یہ نہیں کہ اختتام ہو۔ جب تک زندگی ہے نئے دن طلوع ہوتے رہیں گے، نئے دوست نئے رشتے بنتے رہیں گے، نئی شرارتیں ہوتی رہیں گی، لکھنے پڑھنے کا یہ سفر جاری رہے گا۔

میں نے اوپر کہیں لکھا تھا کہ میں اپنی ہر تحریر اپنے لیے لکھتا ہوں۔ سچ بتاؤں تو یہ آپ بیتی بھی اپنے لیے ہی لکھی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اب تک کی زندگی میں میں نے کیا کھویا اور کیا پایا اور مجھے جون کا یہ شعر یاد آ گیا کہ:

زندگی ایک فن ہے لمحوں کو .... اپنے انداز میں گنوانے کا

سو بجائے اس کے کہ ہم اپنی دسترس میں آئے وقت کے قیمتی لمحوں کو یونہی گنوا دیں، کیوں نہ انہیں ایسی خوب صورت یادوں میں بدل دیا جائے کہ اپنی آپ بیتی ہم خود پڑھیں یا کوئی دوسرا پڑھے، بس پڑھنے والا مسکراتا رہے۔

یقین مانیے...... اپنی پوری زندگی کا اس طرح جائزہ لینے کا موقع شاید مجھے کبھی نہیں ملتا، اس کے لیے میں محبوب صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

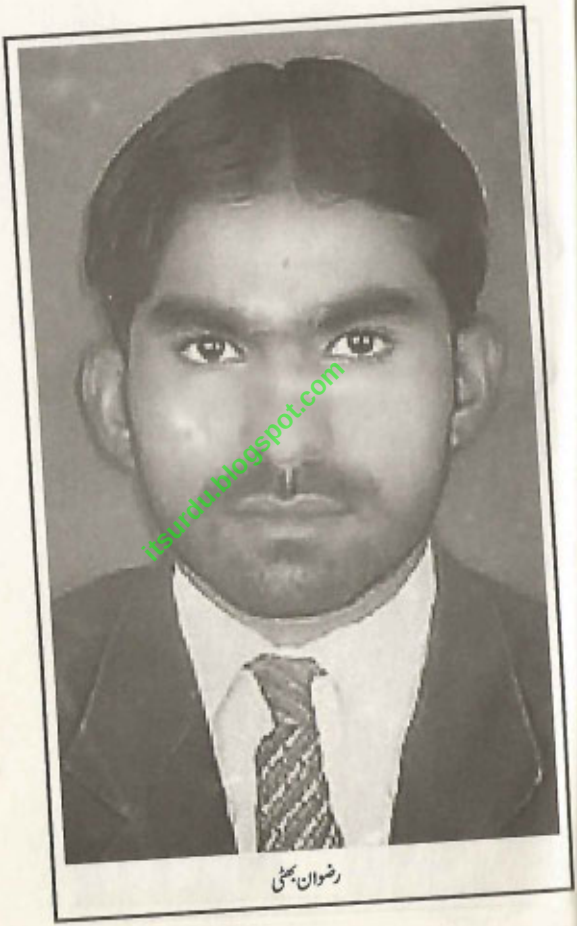

رضوان بھٹی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

رضوان بھٹی

وہ ادیب جس نے ادب کی خاطر بہت سے دکھ سہے اور مشکلات برداشت کیں۔
تاریکی میں قلم کے چراغ بلکہ لہو کے چراغ جلائے۔
مشکلات سے نبرد آزما ادیب کی داستانِ حیات۔

سارا جنون جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔

ذہن کے گوشوں میں، دل کے اُن گداز خانوں میں جہاں ننھے ننھے سے خیالات، احساسات، جذبات ابھرتے تھے۔ اب وہاں صرف ایک ہی بات رواں تھی۔ ''جلا دو یا جل جاؤ!''

میرے ہاتھ میں ماچس کی ڈبیا تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سارا جسم گزشتہ رات ہونے والی پٹائی کی وجہ سے پھوڑے کی مانند دُکھ رہا تھا اور میرے سامنے گزرے ہوئے چار سالوں میں اکٹھے کیے گئے مختلف رسائل، اخبارات اور ردی سے خریدے گئے ڈائجسٹ پھٹی کٹی حالت میں بکھرے تھے۔

میرے ذہن میں صرف دو ہی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں نہایت ہی چھوٹے گھر کا فرد ہوں اور دوسری یہ کہ ادب ادیب کی کھیل کہانی نہ تو ہمارے خاندان میں کسی نے کھیلی ہے اور مستقبل قریب میں نہ ہی کوئی کھیل سکے گا۔

''جلدی کرو..... اب اسے جلا بھی دے..... اگر ایسے انہیں جلتا تو پیٹرول ڈال ان کاغذ کے ٹکڑوں پر۔'' ورکشاپ کے اُستاد نے مجھے بھی کئی القابات سے نوازتے ہوئے کہا۔

ویسے اُستاد کا خیال مجھے مناسب لگا۔ پیٹرول ڈال کر اس سارے ڈھیر کو میں سیکنڈوں میں جلا سکتا تھا۔ تبھی ورکشاپ پر ہی کھڑی ایک موٹر سائیکل کی ٹنکی سے تیل نکالا ڈھیر پر ڈالا اور آخری آنسو آنکھ سے رواں کرتے ہوئے جلتی تیلی ڈھیر پر پھینک دی۔ پل بھر میں میری ادب پر کی گئی

رضوان بھٹی اپنے دوستوں کے ہمراہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

محنت ضائع ہوگئی۔

اس موقع پر میں سمجھ رہا تھا کہ اب ادب میں رضوان بھٹی کا نام روشن ہونے سے پہلے ہی بجھ گیا ہے، ادب ادیب کی دوڑ میں میرا گھوڑا تین درست ثابت نہ ہوا۔ 1999ء سے لے کر 2002ء کے دورانیے میں شائع ہونے والی تمام تحریریں جلا کر میں یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میرے اندر کا ادیب بھی جل گیا ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہوا اور نہ ہوتا ہے۔ میرا ایک دوست کہتا تھا کہ بھوسے کے ڈھیر میں اگر جلتا ہوا کوئلہ پھینک دیں تو ڈھیر یک لخت نہیں بھڑکتا، بلکہ آہستہ آہستہ وہ سلگتا رہتا ہے اور بھڑکنے سے سلگنا خطرناک ہوتا ہے.....

ارے..... اصل بات تو آپ کو بتانا ہی میں بھول گیا اور اپنا بے ربط اور فضول فلسفہ جھاڑنے بیٹھ گیا۔ بات دراصل یوں تھی کہ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد مڈل اسکول میں داخلے ہوئے تو ہم بھی "داخل" ہوگئے۔ مزید تعلیم کے لیے وہاں کلاس میں ہی مجھے ایک دوست ملا۔ بھلا سا نام تھا اُس کا..... ہاں یاد آیا..... محمد عمران ملک۔ موصوف بچوں کے رسائل بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ اُن سے دوستی بڑھی تو اُنہوں نے مجھے "تعلیم وتربیت" دیا پڑھنے کے لیے۔ ٹوٹی پھوٹی اردو میں، مشکل الفاظ جنہوں میں پڑھے۔ آخر تین ماہ کے بعد ایک رسالہ مکمل طور پر پڑھنے کے بعد ہم خوشی سے "دندناتے" پھر رہے تھے کہ عمران ملک نے ٹارزن، عمرو عیار، چھن چھنگلو، چلو سک ملوسک، قاسم، بابدان اور اسی طرح کے فرضی شہزادوں کی کئی چھوٹی چھوٹی "کتابیں" مجھے تھمادیں۔ تو جناب یہاں سے باقاعدہ آغاز ہوا ہمارے "ادب" کا۔

بہت سے چھوٹے موٹے لکھاریوں کی طرح میں نے بھی کبھی والدین، کبھی اساتذہ اور کبھی دوستوں کی نظروں سے چھپا چھپا کر درسی کُتب میں بہت سی کہانیاں پڑھیں..... شوق کی انتہا یہاں تک پہنچی کہ مڈل اسکول سے گھر واپسی پر، بیچ کا سفر بھی پڑھے بغیر نہ گزرتا تھا۔ دو ایک بار سائیکل..... موٹر سائیکل سے ٹکرائی اور ایک بار ایک بڑی بی سے ٹکرائی۔ بڑی بی نے خوب کھری کھری سنائیں۔

ہر انسان کا بچپن ایک فلم کی طرح ہوتا ہے، یہ ذہن پر نقش اس طرح رہتا ہے کہ جب چاہو ذہن کے دریچوں کو کھنگالو اور بچپن کی شرارتیں یاد کر کے ہنس پڑو۔ نادم رہو یا خصہ سے تلملا

جاؤ..... اللہ سب کو ایک طویل یادگار بچپن دے تو کتنا مزہ ہے۔ بدقسمتی سے میرا بچپن صرف ایک سال ہی کا رہا۔ تیسری جماعت سے لے کر پانچویں تک ایک ہیئر کٹنگ والے کے برش دھونے کی وجہ میری ہاتھ صاف ستھرے رہتے تھے، لیکن من..... من ہمیشہ غلاظت سے بھرا رہتا..... نجانے کیوں مجھ جیسے اور بھی کئی بچے (جب میں بچہ تھا) اس ذہنی کرب میں کیوں پلتے ہیں؟ چہرے پر معصومیت سی مُسکان ہوتی ہے، سر ادب سے خم ہوتا ہے۔

پانچویں کلاس "پاس" ہوتے ہی میں نے ہیئر کٹنگ کا کام چھوڑ دیا اور یہاں سے ہی میرے پُرلطف بچپن کا احساس شروع ہوا۔ میں اسے احساس ہی کہوں گا، کیوں کہ صرف ایک سالہ بچپن، بچپن نہیں ہوتا۔ اس ایک سال میں خوب کرکٹ کھیلی، کبڈی کشتی لڑی، پنجابی مشہور کھیل گلی ڈنڈا، بانٹے اور "لکن میٹی" کھیلی، لیکن جیسے ہی میری شرارتوں نے بے جا چھوٹے جھگڑوں نے (وہ جھگڑے جو بچوں کے "بچوں کے" ساتھ ہوتے ہیں) طول پکڑا تو بات "اباحضور" کے کانوں میں آپڑی۔

دو چار دن وہ پریشان رہے، پھر ایک صبح مجھے بڑے اہتمام سے اُٹھایا، نہلایا، کپڑوں میں "پرو سا" اور کلائی پکڑ کر ابا حضور گھر سے رخصت ہوئے۔ وہ تو تب سمجھ آیا جب ابا حضور نے مجھے "باعزت" طریقے سے ایک ورکشاپ میں "بھرتی" کروایا۔

شرارتوں کا سارا شیرازہ بکھر گیا تھا، وہ شرارتیں، ننھی منی جو ننھی کونپلوں کی طرح ابھی سر ہی اُٹھا رہی تھیں، اُنہیں ایک "شاندار مستقبل" کی منفی سوچ سے کچل ڈالا۔

پھر تو ایک نہایت ذمہ دارانہ زندگی بن چکی تھی میری..... صبح فجر کے وقت اُٹھنا، مدرسے جانا، سات بجے چھٹی کر کے سیدھا ورکشاپ آنا، ورکشاپ کھول کر صفائی وغیرہ کے بعد اسپئر پارٹس دُرست کرنا۔ پھر آٹھ بجے ورکشاپ کا "چارج" دوسرے شاگرد (مجھ سے سینئر جو صرف آٹھ بجے ہی آتے تھے) کو دے کر گھر آنا، تیاری کرنی اور سیدھا اسکول۔ نہ مُنہ دھونے کی فکر نہ کھانے پینے کا ہوش۔ ذہن میں بات نقش تھی تو صرف یہ کہ "میرا بیٹا بہت ذمہ دار ہے۔ اسے کسی چیز کی فکر نہیں سوائے پڑھائی کے یا پھر کام کے۔

اسکول سے واپسی پر یونی فارم بدل کر ایک بار ورکشاپ..... تو جناب یہ ہے میرا بچپن

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

.....اپنا بچپن یاد کر کے نجانے کیوں میری آنکھوں کے کونے اب بھی پُرنم ہو جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں، بلکہ بے بہا لوگ ایسے ہیں جو بچپن کو یاد کر کے مسکراتے ہیں۔ اُن لمحوں کی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک میں جھول جاتے ہیں.....اور ایک میں کہ یادوں کے دریچوں کو کھولوں تو سوائے شیونگ کریم کی خوشبو یا پھر پیٹرول و موبل آئل کی بدبو سے ''مہکتا'' ہوں۔

میرا اور عمران ملک کا ساتھ چھارہا۔

وہ مجھ میں چھپے ''احساس کمتری'' کے اُس ''رضوان بھٹی'' کو کھنگالتا رہتا تھا، جو صرف یہ ہی سمجھتا تھا کہ باقی سب خوش ہیں تو میں کیوں نہیں؟ مجھے اپنے اس دوست پر ہمیشہ فخر رہتا ہے۔ وہ اب نجانے کہاں ہے۔ کم از کم مجھ میں ادب ادیب کی سانپ سیڑھی والی پہیلی پروان اسی نے چڑھائی۔

2002ء میں ''جلاؤ گھیراؤ'' کے اگلے دن (مطلب جب میں اپنا ادبی اثاثہ جلا چکا تھا) جب میں اسکول پہنچا تو میرا چہرہ دیکھتے ہی عمران ملک سمجھ گیا کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ دن مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ شاید میرے لیے وہ دو دن زندگی کے بدترین دن تھے۔ گھر سے مار پٹائی، ورکشاپ سے ''ڈھلائی'' کے بعد اب اسکول ٹیچرز نے بھی مجھے ''تبرک'' سمجھ کر ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے خوب ''لطف'' اُٹھایا۔

پوری چھٹی میں عمران ملک سے بات کی۔ پوری کہانی سنائی اور کہا کہ اب میں گھر نہیں جاؤں گا اور واقعی اُس دن میں رات بارہ بجے تک گھر نہیں گیا۔ ننھے سے ذہن میں باغی پن آ گیا تھا۔ نجانے کیسے والد صاحب ڈھونڈتے ڈھانڈتے مجھ تک آ پہنچے۔ میں ایک دیوار سے پشت لگائے سارا دن بیٹھا رہا تھا۔ نہ ورکشاپ نہ گھر.....آگے کی بات خود ہی سمجھ جائیں کہ ''بُرے دنوں'' کی ہیٹ ٹرک ہو ہی گئی۔

نویں کلاس کے امتحانات کی تیاری کے دوران ایک عجیب بات معلوم پڑی کہ اُس وقت کے نوجوان و نام ور ادیب ''شیر محمد رحمانی'' کے بھانجے میرے کلاس فیلو تھے۔ ڈرتے ڈرتے بھانجے سے علیک سلیک کی اور شیر محمد سے ملاقات کا مدعا بیان کیا۔ تین ماہ کے بعد اُن موصوف سے نواب شاہ میں جا کر ملاقات ہو ہی گئی۔ ''اُس وقت'' وہ کافی ملنسار تھے (اُس وقت کا لفظ میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی استعمال کیا ہے۔ آگے آپ کو اصل حقیقت کا علم ہو جائے گا)۔

اسی دوران منور حسین منور سے بھی رابطہ ہو گیا۔ وہ میرا ہم شہر تھا۔ زندہ دفنائے گئے ادب کے ادیب میں سلگتی چنگاری ایک بار پھر ہوا کے زور سے بھڑک اُٹھی تھی۔ شیر محمد نے نٹ کھٹ، آغوش، انوکھی کہانیاں، بھائی جان سے متعارف کروایا۔ کہاں ایک چھوٹا سا رائٹر جو صرف نوائے وقت کے پھول کلیاں (کراچی ایڈیشن) اور چندا کا لکھاری تھا۔ اب ان بڑے رسائل میں لکھنے کی تدبیر میں مصروف تھا۔

ادبی ذوق ایک بار پھر اُبھرا اور 2004ء میں اتنا سر چڑھ کر بولا کہ ''رضوان علی بھٹی'' کی تھوڑی سی پہچان بن گیا۔ اس دوران مجھے اپنا میگزین نکالنے کا شوق ہوا۔ ورکشاپ کے اُستاد سے جھگڑا کیا اور ''ابا حضور'' کے ''کان'' خود ہی بھر دیے کہ وہ استاد ٹھیک نہیں.....کہیں اور کام سیکھوں گا موٹر سائیکلوں کا۔ ابا حضور نے بھی اجازت دے دی۔ اسی دوران ہم نے اپنے پرانے گھر کو الوداع کیا اور نئی آبادی میں ایک نیا گھر خرید لیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہماری سُنی، حالات کچھ بہتر ہوئے اور بڑے بھائی نے مجھے گھر کی بیٹھک میں ہی کریانہ اسٹور کھول دیا، یعنی آزادی کی زندگی ایک بار پھر مجھ سے دور ہو گئی، مگر میں خوش اس لیے تھا کہ یہاں کوئی مجھ پر حاکم نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی کا مالک تھا اور یہی میں چاہتا تھا، کیوں کہ شروع دن سے ضدی، غصیلا پن اور خود غرضی تو تھی ہی مجھ میں، مگر احساس کمتری بھی آن ٹپکی تھی۔

اپنا میگزین نکالنے کے سلسلے میں شیر محمد رحمانی سے رابطہ کیا اور اُنھوں نے محمد وسیم خان (مدیر نٹ کھٹ) سے ملوانے کا دن مقرر ہوا اور میں نواب شاہ جا پہنچا، وہاں سے ''روکھے سوکھے'' ناشتے کے بعد حیدر آباد کو روانہ ہوئے (روکھے سوکھے کا لفظ صرف رحمانی صاحب کے لیے ہے، کیوں کہ اگر وہ یہ آپ بیتی پڑھ رہے ہیں تو سمجھ جائیں گے)۔

کسی مدیر سے ملنے کا میرے لیے یہ پہلا موقعہ تھا۔ وسیم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر صابر فیاض اور اعظم سکندر سے بھی ملاقات ہوئی۔ میرے لیے خوشی کا موقع تھا۔ خوشی کی انتہا کہنا بہتر رہے گا۔

چھوٹے علاقوں میں رہنے والے ادب ادیب کی دوڑ میں شریک لکھاری کچھ زیادہ ہی حساس ہوتے ہیں۔ ہمدردی کے چند فقرے اور اسی طرح کا اور بھی بہت کچھ نجانے کیوں آنکھوں کے

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کو نے نم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ہر بڑھا ہوا ہاتھ انہیں دستِ دوست محسوس ہوتا ہے۔ ہم جیسے چھوٹے لکھاریوں کی اُمیدیں، خواہشیں، سوچیں اُونچی ہوتی ہیں، مگر ان سب کو عملی ''جامہ'' پہنانا بس سے باہر ہوتا ہے۔

2006ء کے اوائل میں دعوۃ اکیڈمی کی طرف سے مجھے بہترین ڈراما نویس دعوۃ اور رینٹ ادبی ایوارڈ دیا گیا اور اسی سال ادبی پرواز میں مزید بہتری آئی۔ دعوۃ اکیڈمی کے ہی صوبائی کیمپ میں کراچی آنا ہوا، خوب موج مستی کی میرے ہمراہ منور حسین منور تھا، کیمپ میں بہت سے نام ور لکھاریوں سے ملاقات ہوئی۔ حیات لاسی، کاشف سومرو، کاشف نازؔ، مشتاق قادری، شوکت شوق اور خالد آزاد سے مل کر خوشی بھی ہوئی، مگر دل رنجیدہ اس وقت ہوا جب سبی کے ایک نہایت خوبرو نوجوان لکھاری محمد پیرل سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے ساتھ کراچی کے بہت سے مقامات گھومے، مگر وہ کیمپ سے بچھڑنے کے بعد ہم سب سے کراچی میں ہی ایک جلسے میں دہشت گردی کی نظر ہو گئے۔ جلسے میں بم دھماکے میں وہ بھی شہید ہو گئے.....

اپنا میگزین نکالنے کا شوق تو تھا، مگر ہر خواب حقیقت نہیں ہوتا۔ ایسے ہی میں میگزین نہ نکال پایا، مگر حوصلہ تھا، ہمت تھی اور سب سے بڑھ کر دوستوں پر بھروسا تھا۔ تبھی منور حسین منور کے ساتھ مل کر ایک میگزین ''سہ ماہی شاہین'' کے نام سے نکالا۔ چار شماروں میں ہی ادبی حلقہ میں میگزین کا اچھا معیار پیدا ہو گیا تھا..... مگر ہائے رے قسمت..... وہ کہتے ہیں ناں کہ شہرت حاصل کرنا عام سی بات ہے، مگر شہرت برقرار رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ منور صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا، شاہین کی پرواز میں وہ مجھے اور میرے دوست عرفان انجم (شاہین کے چیف ایڈیٹر) کو پیچھے چھوڑ کر وہ خود آگے بڑھنے لگے، مگر افسوس کے میگزین کا صرف ایک شمارہ ہی اور لا سکے۔

عمران ملک کے بعد عرفان انجم نے مجھے خوب ذہنی سہارا دیا۔ موصوف نفسیات پڑھنے اور پڑھانے کے شوقین تھے (اب بھی ہیں) ادب دوستی میں اُن کا اچھا ساتھ میرے قلم میں پختگی کا باعث بنا۔

بات لکھاری دوستوں کی جانکلی ہے تو یہاں آصف علی مہک کا تذکرہ مناسب سمجھوں گا۔ ان سے ملاقات ایک ''سانحہ'' ہی تھا۔ آصف مہک کے ساتھ مل کر ''مہک'' کے نام سے ایک میگزین

نکالنا چاہا اور قدرتی طور پر ہم کامیاب بھی ہو گئے۔ میگزین شائع ہوا ادبی حلقہ احباب میں سراہا بھی گیا، مگر صد افسوس.....! کہ آصف صاحب منور حسین منور کے اشاروں پر ناچنے لگے۔

مجھے بہت جلد احساس ہوا کہ میں ہر مسکراہٹ کے پیچھے چھپی ''حقیقت'' جاننے کے فن سے نا آشنا ہوں۔ اگر یہ فن مجھے آتا تو کم از کم میں تین مرتبہ اپنے ادبی دوستوں سے دھوکا نہ کھاتا۔ خیر خدا جو کرتے ہیں بہت بہتر کرتے ہیں۔ بہت اچھا ہے کہ میں ہر مسکراہٹ کو ''اپنی'' سمجھتا ہوں، زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت محسوس بھی نہیں کرتا۔

شیر محمد رحمانی کا محراب پور آنا جانا اکثر رہتا ہے، کیوں کہ محراب پور میں اُن کا سُسرال ہے، مگر مجال ہے کہ موصوف نے ہم سے ملاقات کریں، کیوں کہ وہ بھی اپنے اعلیٰ حیثیت کے ادباء کے روابط میں ہیں۔ خیر اس سے نہ تو میری صحت پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ ہی پڑے گا۔

درمیان میں ایک سال میرے لیے ایسا گزرا کہ بس! بڑے بھائی نے اپنا کاروبار کرنے کی ٹھانی، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور وہ ہماری حیثیت سے بڑھ کر قرض تلے دب گئے۔ والد محترم نے کہا کہ ایک سال کے اندر اندر قرض چکانے کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔ میرے کریانے اسٹور کی آمدنی صرف اتنی ہی تھی کہ میں اپنا اور پڑھائی کا خرچ نکال سکتا تھا، مگر قرض کا بوجھ اس آمدنی سے نہ بٹنا، اس لیے والد محترم کی حکم بجا آوری کرتے ہوئے مجھے رختِ سفر باندھنا پڑا، میری اگلی منزل کراچی تھی، مگر کام دھندا ہاتھ میں نہ تھا۔ دو چار دن ایک دوست کے ساتھ رہا اور بمشکل ایک گارمنٹس کمپنی میں کام مل ہی گیا۔

دو ہی ماہ میں اندازہ لگا چکا تھا کہ میری آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہیں۔ ادب کو تب تک کے لیے خیر باد کیا جب تک قرض آفت سے جان نہ چھوٹی۔ میں نے سوچا کہ اس سلسلے میں کسی ادبی دوست سے ملاقات ہو جانی چاہیے۔ شاید وہ کہیں کوئی اچھے کام کی سبیل بنا دے۔

اسی سوچ کی بنا پر ماہ نامہ چندا کے شبیر حسین صاحب سے ملاقات کی، انہوں نے حنیف سحر کی طرف روانہ کیا۔ حنیف سحر صاحب سے ملاقات ہوئی تو موصوف نے پریس چیمبر کا راستہ دکھایا اور وہیں مجھے میرے پسندیدہ ادیب ''نوشاد عادل'' سے ملنے کا موقع ملا۔

نوشاد صاحب کھیل کھیل میگزین کے آفس میں براجمان تھے۔ میرے سلام کے جواب میں

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

انہوں نے سر اُٹھایا۔ میں نوشاد عادل کے نام سے واقف تھا..... صورت تو دیکھی نہ تھی، اس لیے پہچان نہ پایا۔

اُن سے پوچھا۔ ''صدیقی صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''نہیں وہ اس وقت آفس میں نہیں ہیں۔''

''مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ وہ نہیں ہیں، مگر ہیں کہاں؟''

''آپ بیٹھیں اور پہلے بتائیں کہ کہاں سے آئے ہیں..... کون ہیں؟''

نوشاد صاحب نے مکمل چھان بین کرنی چاہی۔ بھلا ہم اپنا تعارف کرواتے کیوں جھجک محسوس کرتے، فٹ سے بول دیا۔

''اجی میں رضوان بھٹی ہوں اور محراب پور سے آیا ہوں!''

''ہوں ں ں ں.....'' نوشاد نے لمبا سا ہنکارا بھرا اور مجھے غور سے گھورا۔

''تو آپ ہیں رضوان بھٹی..... میں جانتا ہوں آپ کو..... پڑھا بھی ہے!''

مگر جب میں نے اُن کا نام پوچھا تو وہ شرمائے، مسکرائے اور بولے۔ ''جب میں حیدر آباد میں ہوتا تھا تو اکثر میگزین کے سلسلے میں وسیم صاحب آپ کی کہانی کے متعلق بات کرتے تھے کہ شائع ہونی چاہیے یا نہیں.....''

میرے لیے اتنا اشارہ ہی کافی تھا، کیوں کہ اُن دنوں مشہور تھا کہ نوشاد عادل، وسیم خان سے بہت رابطے میں تھے اور حیدر آباد چھوڑ کر تلاش معاش کے لیے کراچی آ پہنچے ہیں..... اور ابن آس کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ مگر کیسے دکھتے ہیں..... تو پہچاننا مشکل نہ ہوا میرے لیے۔

''نوشاد عادل.....'' میں نے کہا تو وہ مسکرائے اور سر ہلا دیا۔

پہلے تو سوچا کہ اپنی آمد کی وجہ نوشاد بھائی سے بیان کروں، مگر پھر خود ہی انکار کیا کہ وہ خود انہی حالات سے گزر رہے ہیں، کہنا مناسب نہیں ہے۔ نوشاد صاحب سے ملاقات کے بعد دل واقعی ''باغ باغ'' ہوا۔

ان ملاقاتوں کے بعد مجھ میں ایک بار پھر وہی ذمہ دار رضوان بھٹی اُبھرا، جو ورکشاپ میں کام کرتا تھا، میں نے اپنی تمام خواہشات کو پس پشت کیا اور صبح نو سے رات بارہ تک کام کرنے کی

ٹھانی۔ نائٹ اور ڈے کی دونوں شفٹوں میں کام کیا اور سلیری پیکج بڑھوالیا۔

اللہ کا کرم ہوا کہ قرض جیسے وبال سے ایک سال میں ہی جان چھوٹی اور میں کراچی کو خیر باد کہہ کر ایک بار پھر محراب پور آ گیا، مگر کام دھندے کو کچھ نہ تھا۔ اس مشکل کا حل بھی والد محترم نے نکال ہی لیا۔ غلہ منڈی میں ایک ٹریڈنگ کمپنی میں ملازمت مل گئی، جو تا حال جاری و ساری ہے۔

میرے گھر میں اور قریبی دوستوں میں یہ بات میرے متعلق بہت مشہور ہے کہ میں بے وجہ غصہ ور، ضدی اور خود غرض ہوں۔ پہلی دو باتیں، بلکہ ''الزامات'' تو سو فیصد درست ہیں، ہاں تیسرا الزام درست نہیں! بہر حال جو بھی ہے مجھے ایسا ہونے پر فخر ہے، کیوں کہ ''دو غلے'' قسم کی باتوں کے بجائے بات منہ پہ کہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

میں بذات خود ایک ایسے ماحول میں پرورش پا چکا ہوں، جو کہ نہایت منفی سوچ کا حامل تھا۔ میں اس منفی کو مثبت طرز میں ڈھالنے کے لیے کوشاں تھا کہ کچھ خاص بات نہ بن پائی اور مجھے دوسری بار گھر چھوڑنا پڑا۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں کریانہ اسٹور چلاتا تھا۔ دوپہر کے وقت گھر والوں سے جھگڑا کر کے اپنا سامان باندھا اور گھر کو ہمیشہ الوداع کہہ کر اسٹیشن کی سمت رواں دواں ہوا۔ وہ وقت مجھے واقعی میری ہی کسی کہانی کا منظر لگ رہا تھا، مگر یہ کہانی نہیں حقیقت تھی۔ میرے ذہن میں تھا کہ گھر تو چھوڑ دیا۔ اب جس طرف کی ٹرین پہلے آئی اُسی طرف چلا جاؤں گا۔ خوش قسمتی کہہ لیں یا بدقسمتی ٹرین نواب شاہ سے کی آئی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک سفر ہو گیا۔

نواب شاہ پہنچ کر شیر محمد رحمانی سے رابطہ کیا اور کہا کہ دو چار دن کے لیے رہائش کا بندوبست کرتے۔ اُس کے بعد میں آگے کہیں اور روانہ ہو جاؤں گا۔ موصوف نے مجھ سے حامی بھری اور میرے والد محترم کو فون کر دیا۔

رات دو ڈھائی بجے بڑے بھائی شیر محمد رحمانی کے گھر آن پہنچے۔ کان سے پکڑا اور واپسی کے لیے کہا۔ میں ضدی پن پہ اُڑا ہوا تھا۔ زور زبردستی وہ مجھے واپس محراب پور لے ہی آئے۔

حقیقت میں شیر محمد نے میرے ساتھ اچھا کیا۔ ایسا نہیں سوچتا۔ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی جو وہ رات میں شیر محمد کے پاس رہ گیا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ابتدا میں، میں بتا چکا ہوں کہ مجھے خود سے نفرت ہے۔ یہ بات آج تک مجھے سمجھ نہیں آئی کہ کیوں؟ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو خود کو اذیت پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔

آپ کے لیے حیرت کی بات ہوگی کہ ایک ادیب..... اور خود سے نفرت کرے؟!

ارے جناب میں مکمل ادیب نہیں ہوں۔ ابھی طفل مکتب ہی ہوں، یعنی ادب، ادیب کی کھیل کہانی کی پہلی سیڑھی پر ہوں۔ اسی لیے میں خود کو ادیب نہیں کہتا۔

اپنا قیمتی وقت دینے کا اور میری بے کار روداد، آپ بیتی پڑھنے کا شکریہ.....

آخر میں ایک بات کہوں گا..... میری آپ بیتی جیسی بے کار تحریریں پڑھنے سے بہتر ہوتا کہ آپ کوئی ڈھنگ کی کتاب پڑھ لیتے..... خیر اب کیا ہو سکتا..... وقت تو چلا گیا..... ہاتھ سے ضائع ہو گیا ناں۔ لیکن آئندہ احتیاط کیجیے گا۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

رابعہ حسن

وہ ادیبہ جس کا حوصلہ چٹانوں سے بلند ہے۔ ہمہ جہت شخصیت کی مالک متعدد شعبوں میں اپنے فن کا لوہا منوانے والی ادیبہ۔ ادیب بنی تو شاہکار کہانیاں تخلیق کیں۔ تحریر کی بہترین مقررہ قرار پائیں۔ کالم نگاری کی تو ان کی قلم کی کاٹ نے معاشرے کو جھنجھوڑ دیا۔ تعلیم کے میدان میں پوزیشن لینے والی۔

ایک سفر کے اذدام مگر چٹانوں سے مضبوط ارادوں والی رابعہ حسن کی تحریر گزارش۔

---

itsurdu.blogspot.com

الفاظ بھی جادوئی کلمات ہیں جو کبھی خوشبوؤں کے گل کھلاتے ہیں تو کبھی دکھوں کے سمندر بھر لاتے ہیں۔ اگر یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ لفظوں کی دنیا ایک جہان حیرت یا ونڈر لینڈ ہے۔ جس میں لکھاری کبھی تو خود بادشاہ ہوتا ہے اور کبھی بادشاہ گر۔

میرے لیے لفظوں کی دنیا ایک ونڈر لینڈ ہی ہے۔ جہاں جا کر میں زندہ اور جیتے جاگتے جسموں میں ڈھال لیتی ہوں اور میرے لفظ اتنی زیادہ Healing Power رکھتے ہیں کہ میں درد لفظوں کی صورت میں بکھیر کر خود ہلکی پھلکی ہو جاتی ہوں۔

اس ونڈر لینڈ کی میں شہزادی بھی ہوں جس کے زیر اثر ہر چیز ہے اور کبھی کبھار یہ جہان حیرت مجھے ایک اجنبی مہمان کی صورت میں خوش آمدید کہتا ہے۔

یہ قلم اور لفظ ہی ہیں جو میری پہچان ہیں اور انہی کی بدولت آج میں اپنی آپ بیتی لکھنے جا رہی ہوں۔

وادی جہلم میری جنم بھومی: میرا تعلق راجپوت خاندان سے ہے جو عرصہ دراز پہلے دہلی سے بغرض تبلیغ سری نگر جاتے ہوئے مظفر آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں آباد ہو گیا تھا۔ اپنے علمی اور ادبی رجحانات کی وجہ سے اسے ایک خاص مقام حاصل ہے۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

میں نے 7 اگست کو ایک چھوٹے، مگر انتہائی خوب صورت قصبے چکار میں آنکھ کھولی اور زندگی کے چند ابتدائی ماہ یہیں گزارے۔ میرے والد اردو کے پروفیسر ہیں (اب ریٹائر ہو چکے ہیں) اور والدہ ایک گھریلو سادہ مزاج، مگر کتاب اور علم سے دوستی رکھنے والی خاتون ہیں۔ میرا بہن بھائیوں میں دوسرا نمبر ہے، اسی لیے اکثر لوگ مجھے رابعہ کے بجائے ثانیہ کے نام سے پکارنے کے حق میں ہیں۔

مظفر آباد: چکار سے والد محترم کا تبادلہ انٹر کالج بالسیری ضلع مظفر آباد ہونے کی وجہ سے سب گھر والوں کو بھی ان کے ساتھ ہی بالسیری منتقل ہونا پڑا۔ یہ تحصیل پٹیکہ میں واقع مقام ہے، جو اپنی خوب صورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں کی یادیں میرے ذہن میں نہیں۔ مجھے ایک خواب کی طرح لگتا ہے کہ ہم ایک بڑے سے دو منزلہ گھر میں رہا کرتے تھے۔ جو ایک مربع کی صورت میں بنا ہوا تھا اور درمیان میں وسیع کشادہ صحن۔ اس گھر سے متعلق ایک چیز میرے ذہن میں بالکل واضح ہے، وہ تھا ایک رنگ بدلتا ہوا بورڈ، جو رات کے وقت روشن کیا جاتا تھا۔ میں اکثر حیران بھی ہوتی ہوں کہ وہ بورڈ مجھے کیسے یاد ہے؟ کیوں کہ جب ہم نے وہ گھر چھوڑا تب میری عمر 5 برس بھی نہیں تھی۔ اگست 1992ء میں ہم لوگ مظفر آباد منتقل ہو گئے۔

میرا پہلا اسکول: 7 اگست 1992ء میری یادداشت میں اس لیے بھی محفوظ ہے، کیوں کہ یہ میری سالگرہ کا دن ہونے کے ساتھ ساتھ اسکول کا پہلا دن بھی تھا۔ میرا یہ اسکول ٹاٹ اسکول سے بھی نچلے درجے کا تھا، جہاں بچوں کو پتھروں پر بیٹھ کر پڑھنا پڑتا تھا۔ جو بچے ذرا سہولت چاہتے، وہ اپنے گھروں سے بوری یا ٹاٹ لے آیا کرتے تھے۔ یہ بات قطعاً نہیں تھی کہ اس اسکول میں غریب بچے پڑھا کرتے تھے، بلکہ اس زمانے میں تعلیم کی اہمیت تھی نہ کہ تعلیمی اداروں کی عمارتوں کی۔ مجھے ہمیشہ سے گرمیوں کا موسم اس لیے پسند تھا کہ اس میں درخت گھنیرے اور سایہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ پھل دار بھی ہوا کرتے تھے۔ اسکول سے واپسی پر بچوں کی ایک ٹولی ان درختوں کو گھیرے میں لے لیتی اور پتھر مار مار کر کچے پکے پھل گرایا کرتی اور پھر چنگارے لے لے کر کھایا کرتی، لیکن میں اس گروہ میں شامل ہونے کے بجائے ایک جانب کھڑی ہو کر انہیں دیکھا کرتی۔ میں نے کبھی ان چوری شدہ پھلوں کا تحفہ قبول نہیں کیا۔ میں آج واپس مڑ کر دیکھتی ہوں تو

مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اپنے ہم عمر بچوں کے نسبت بہت سنجیدہ طبیعت کی مالک تھی

حسن فطرت میرا بہترین ساتھی: میرا بچپن 2015ء کے بچوں کے بچپن سے قطعاً مختلف تھا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 90ء کی دہائی میں شاید ٹیکنالوجی اتنی عام نہیں تھی جتنی کہ آج ہے۔ آج کا بچہ خوشی اور مسرت کے حقیقی احساس سے ناواقف ہے، کیوں کہ آج خوشی مادی چیزوں سے منسوب ہو چکی ہے۔ کشمیر سے تعلق ہونے کی وجہ سے میرا زیادہ تر وقت دریاؤں، درختوں اور کھیتوں کے سنگ گزرتا۔ میں آج بھی ماضی کے جھروکوں سے اس پار ایک ننھی سی رابعہ پر نگاہ ڈالتی ہوں تو میری سماعتوں میں Wordsworth کے الفاظ گونجنے لگتے ہیں:

For nature then

To me was all un all

I cannot paint. What then I was. The sounding cataract

Haunted me I like a passion: the tall rock. The mountain and the deep and gloomy wood. Their colours and their forms, were then to me.

An appetite, a feeling and a love that had no need of a remote charm. By thought splendid, nor any interest unborrowed from the eye. That time is past.

فطرت سے میرا تعلق ہمیشہ سے ہی بہت گہرا اور بہت خوب صورت رہا ہے۔ ہم اکثر ٹاہلی کے درختوں پر جھولے ڈال کر جھولتے، کھلے میدانوں میں کھیلتے اور خوشی سے قہقہے لگاتے۔ میں سوچتی ہوں خوشی کے وہ گیت کہاں کھو گئے۔ 1994ء کی موسم گرما کی ایک شام کا واقعہ ہے کہ ٹاہلی کے ایک درخت پر پڑے جھولے سے گر کر میں اپنا بازو زخمی کر بیٹھی۔ تب سے میرے گھر سے باہر جا کر کھیلنے پر پابندی لگ گئی۔ اس وقت میں دوسری جماعت کی طالبہ تھی اور یہی وہ وقت تھا، جب میں نے ونڈر لینڈ کو دریافت کیا۔

ونڈر لینڈ: غالباً 1994ء کی بات ہے۔ ایک روز میں یونہی اپنی کاپی میں لفظوں سے کھیلنے

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تھی، کچھ دیر بعد میں نے دیکھا تو میں نے ایک کہانی لکھ دی تھی۔ میری پہلی کہانی ہی میری پہلی نظم تھی، کیوں کہ ایک غنائیہ تھی یعنی Poetic Story۔ اس پہلی کہانی "پاگل شہزادہ" کے ساتھ ہی مجھے ونڈر لینڈ کے خفیہ دروازے کی چابی مل گئی اور پھر میرا زیادہ تر وقت اسی ونڈر لینڈ میں کٹنے لگا۔ مجھے یاد ہے، میری ایک دوست ہوا کرتی تھی نیہاں، اس کے ابو اسے کاپیاں بنا کر دیتے تو مجھے کہانیاں لکھنے کے لیے لا دیا کرتی اور جب میں کہانیاں لکھ لیتی تو سب بچے سنتے۔ ان ہی دنوں میری کلاس میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی، رضوانہ۔ اس نے میری کاپی کر کے کہانیاں لکھنی شروع کیں، مگر اس کا سلسلہ زیادہ نہ چل سکا۔ میں نے ابتدا اردو کہانیوں سے کی، مگر پھر کچھ انگلش کہانیاں بھی لکھیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں تو ایک عام سے پرائمری اردو میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی، کہانیاں انگلش میں کیسے لکھ لیتی تھی تو دراصل میں اسکول میں اردو میڈیم نصاب پڑھتی تھی، مگر گھر پر انگلش کی وہ کتابیں پڑھتی تھی جو بچوں کے لیے لکھی گئی تھیں۔

میری پہلی تقریر: مطالعہ کی عادت مجھ میں نہایت کم عمری سے تھی اور اسی مطالعے کی وسعت نے نہایت کم عمری میں مجھ میں فن خطابت پیدا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مطالعہ انسان کی گفتگو میں سلاست اور خوب صورتی پیدا کرتا ہے۔ مجھے ذرا ذرا سا یاد ہے کہ میں نے پہلی تقریر تیسری جماعت میں "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" کے عنوان پر کی تھی۔ یہ برجستہ تقریر نہیں تھی، بلکہ ابو نے مجھے کاپی پر لکھ کر دی تھی۔ شاید یہ میری زندگی کی پہلی تقریر تھی جو میں نے دیکھ کر کی۔ اس کے بعد سے آج تک میں جب بھی اسٹیج پر جاتی ہوں برجستہ ہی تقریر کرتی ہوں۔ میں نے پرائمری اسکول میں ہی کمپیئرنگ، تقریر اور چھوٹے موٹے خاکے لکھنے شروع کر دیے تھے۔

کہانی گھر: آج کل رات کو سوتے ہوئے بچوں کو کہانی سنانے کا تصور یا تو خالصتاً ادبی گھرانوں میں موجود ہے یا کچھ دیہی علاقوں میں، جہاں ابھی دورِ جدید کی وہ اختراعات نہیں پہنچیں، جنھوں نے بچوں کو تخیل Imagination اور کتاب سے دور کر دیا ہے۔

پیغمبروں اور صحابہؓ کے واقعات، طوطا مینا کی کہانی کے ہلکے ہلکے رنگ آج بھی میری نظروں کے سامنے لہراتے ہیں، جو امی روزانہ رات کو سونے سے پہلے سنایا کرتی تھیں۔ پھر جب لفظ لفظ پڑھنا شروع کیا تو جنگ اور اخبار جہاں کے بچوں کے صفحات پر موجود کہانیاں بڑے شوق سے

پڑھا کرتی تھی۔

قوت متخیلہ کو زیادہ جلا مافوق الفطرت کہانیوں Supernatural Stories کی وجہ سے ملی۔ عمرو عیار، ہرکولیس اور ٹارزن کی کہانیوں میں اتنی کشش محسوس ہوتی کہ میں اور میرا بھائی منصور جو مجھ سے عمر میں بس تھوڑے سے ہی بڑے ہیں، اپنا جیب خرچ انہی کی خریداری پر کیا کرتے یا اگر کبھی کسی چیز کو خریدنے کی فرمائش کرتے تو وہ عمران سیریز کے ناول ہوتے اور دیومالائی قصوں میں مجھے آج بھی اتنی ہی کشش محسوس ہوتی ہے جتنی بچپن میں ہوتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی میں ایسی کہانیاں شوق سے پڑھتی ہوں اور Animated Movies اور تخیلاتی ڈرامے یا فلمیں مجھے پسند ہیں۔

کتاب، تخیل اور میں: کبھی کتاب میرے لیے میجک ورلڈ ثابت ہوتی ہے جہاں قدم رکھتے ہی میں مسحور ہو کر واپس آنا بھول جاتی ہوں تو کبھی ایک عمر رسیدہ اور تجربہ کار بزرگ جو مجھے ڈھارس بھی بندھاتی ہے باہمت بننے کا درس بھی دیتی ہے۔ کتاب سے میری دوستی اتنی پرانی ہے جتنی کہ ہجے کر کے لفظوں کو پڑھنا سیکھنا اور یہی وجہ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے صاحب علم، نفیس اور علم سے محبت کرنے والے لوگ پسند ہیں۔

ایک خواب کی طرح یاد ہے کہ میرے ابو مجھے تیسری یا چوتھی جماعت میں ہی گلستانِ سعدی اردو ترجمے کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔ پرائمری سے قبل ہی میں نے کلیاتِ اقبال، غالب، حفیظ جالندھری (شکایتِ شیریں)، حالی (مسدس حالی)، سجاد حیدر یلدرم، ملا وجہی، بانو قدسیہ، سرشار، فانی، ممتاز مفتی، اختر شیرانی، مصطفیٰ زیدی، پنڈت دیا شنکر نسیم (گلزار نسیم) اور رجب علی بیگ (فسانۂ عجائب) پڑھ لی تھیں۔ مطلب تشریح کے ساتھ۔ اس کے علاوہ تاریخ اور تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ بھی زیر مطالعہ رہیں۔ خصوصاً تاریخ سے مجھے بے حد دلچسپی تھی اور یہ آج تک برقرار ہے۔

آج میں خود ایک معلمہ ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہماری نسل نو کورس کی کتابوں سے باہر کیوں نہیں نکلتی یا انہیں کتابیں رٹا لگانے پر ہی کیوں زور دیا جاتا ہے۔ آج ہم نے علم کو کچھ سوالات کے جوابات رٹ کر کوئی پوزیشن لے کر اگلی جماعت میں منتقل ہونے تک ہی محدود کر لیا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

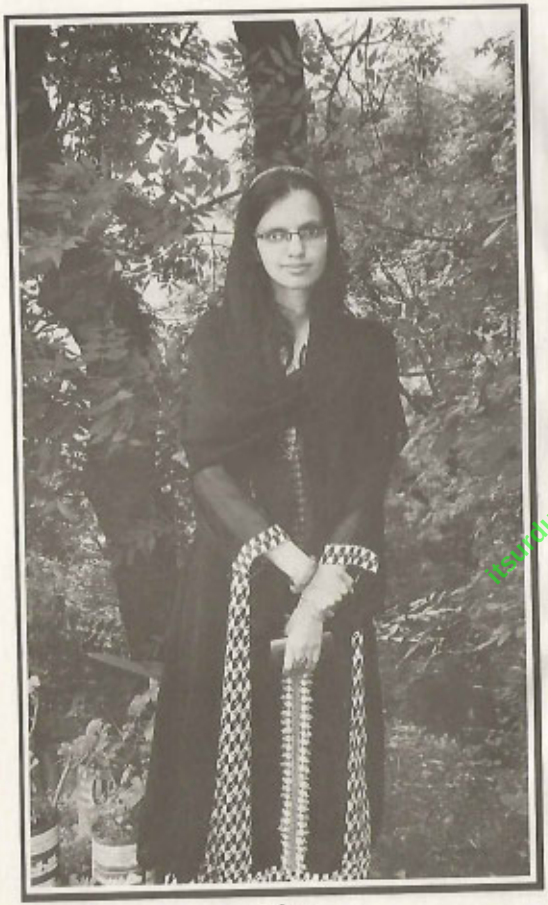

رابعہ حسن

ہے یا ہمیں اپنی نئی نسل سے یہ امید ہی نہیں کہ وہ ہمہ جہت علم کی لگن رکھ سکتی ہے۔

جب میری پہلی کہانی چھپی: ونڈر لینڈ میں داخل ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا، مگر اخبارات میں لکھنا میں نے غالباً 1998ء میں شروع کیا۔ میری کہانی جس کے بعد میں نے باقاعدگی سے اخبارات کے ہفتہ وار چلڈرنز ایڈیشنز میں لکھنا شروع کیا وہ 27 مارچ 1999ء کو روزنامہ اوصاف کے چلڈرن ایڈیشن 'نونہال' میں "یہ عید" کے عنوان سے شائع ہوئی، مگر اس پر میرا نام شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کہانی کی اشاعت کے بعد میں نے مسلسل لکھنا شروع کیا اور روزنامہ اوصاف اور جنگ راولپنڈی کے ہفتہ وار ایڈیشنز میں میری کہانیاں باقاعدگی سے شائع ہونے لگیں۔ ان اخبارات کے علاوہ میں نے روزنامہ پاکستان کے ہفتہ وار بچوں کے ایڈیشن میں اور نوائے وقت کے پھول اور کلیاں میں بھی لکھا۔ اس عرصے کے دوران روزنامہ اوصاف کے تحت ہونے والے کہانی نگاری کے کئی مقابلوں میں میری کہانیوں نے اول پوزیشن حاصل کی

کچھ یادیں بچپن کی: گرمیوں کی چھٹیاں وہ وقت ہوتا تھا جس کا انتظار مجھے اور میرے بہن بھائیوں کو ہمیشہ سے رہا کرتا تھا کیونکہ اس عرصہ میں ہم گاؤں جا سکتے تھے اور جب چھٹیاں ہو جاتیں تو ہماری کوشش ہوا کرتی تھی کہ جلد از جلد کام ختم کیا جائے اور گاؤں کی راہ لی جائے گاؤں کی زندگی کا اپنا ہی لطف ہوتا تھا، کچے پکے پھل، ندی کا پانی، مٹی کا گھر مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ بڑے آبائی گھر کی چھت پر فٹ بال کھیلا کرتے تھے اور اگر وہاں سے فٹ بال لڑھک جاتی تو وہ دور ندی میں سے اٹھا کر لانا پڑتی میں، منصور (بھائی)، سدرہ، عمر فاروق اکثر مٹی کے گھر بنایا کرتے کرکٹ بھی کھیلی جاتی ایک مرتبہ میں اور سدرہ کھیل رہے تھے، جانے کیسے ہم سے خوبانی کے درخت کی ٹہنی ٹوٹ گئی اب پریشانی کہ اب کیا ہوگا اس کا جو حل ہم نے دریافت کیا میں آج بھی سوچتی ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے، قریب ہی برآمدے میں کتابوں والی الماریوں کے آگے سفید رنگ کے پردے لٹکے ہوئے تھے، ہم نے ایک پردہ پھاڑا اور درخت کو باندھ دیا اب مجھے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کپڑا باندھا کیوں تھا؟ مگر خیر اس پر ڈانٹ نہیں پڑی۔

جب روشنی دھندلانے لگی: یہ 2000ء کی بات ہے جب میں آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی، ایک روز اچانک آنکھوں میں شدید درد ہوا، اس درد کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ میں دو دن

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

رابعہ حسن اپنی فیملی کے ہمراہ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

تک کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ان دو دنوں میں آنکھوں کی اہمیت کا احساس بڑھ کر ہوا۔ میری نظر بہت کمزور ہے اور میں اس کو ایک خزانے کی طرح سنبھال کر رکھتی ہوں۔

اگر یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ مجھے اپنی آنکھوں سے بہت محبت ہے۔ اب تو میری نظر بہتر ہو کر ٹھہر گئی ہے، مگر میرے زمانہ طالب علمی میں ایسا وقت بھی آیا ہے، جب مجھے بہت حوصلے اور ثابت قدمی سے کام لینا پڑا۔

میرے پیارے: 27 مئی 2012 کو میرے عزیز دادا جان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی محبت، شفقت اور راہنمائی خصوصاً علمی، دینی اور ادبی معلومات سے محروم ہونا ایک گہرا صدمہ تھا۔ کبھی کبھار صدمات پے در پے آتے ہیں۔ اٹھارہ روز بعد 14 جون کو نانا ابو کی وفات ہو گئی۔ رشتے سب ہی انمول ہوتے ہیں مگر ان کی قدر و قیمت تب ہوتی ہے جب وہ ہمارے پاس نہ رہیں۔

کچھ رشتے محبتوں اور شفقتوں کا پیکر ہوا کرتے ہیں جو بچھڑنے کے بعد بھی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ میں آج بھی کسی ضروری کام کے سلسلے میں باہر نکلتی ہوں تو دادا جان کی دعا کانوں میں گونجتی ہے "اللہ کامیاب کرے" اور نانا جان کی تاکید ہمیشہ ساتھ رہتی ہے کہ "اللہ پر بھروسا رکھو"۔ میری زندگی میں ان دو شخصیات کا بڑا گہرا کردار رہا ہے۔ دادا ابو کو میں ہمیشہ سے دادا ابو کو میں ہمیشہ سے علم دوستی کی وجہ سے عزیز رہی ہوں اور نانا جان کو اپنی عادات کی وجہ سے۔ مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ ان رشتوں کی صورت میں، میں نے اپنے بہت عزیز اور پیارے دوست کھوئے ہیں۔

انوکھی کہانیاں سے تعارف: یہ 2003ء کی ایک سرد صبح تھی، جب بینک روڈ پر بک اسٹال پر میری نظر اچانک انوکھی کہانیاں پر پڑی۔ نام اور سرورق انوکھا سا محسوس ہوا اس لیے خرید لیا۔ پڑھ کر نہایت ہی دل چسپ لگا اور پھر میں نے اس میں لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے انوکھی کہانیاں میں بہت کم لکھا، مگر میری کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جو بھی لکھوں معیاری لکھوں اور اب اتنے عرصے تک لکھنے کے بعد مجھے عمیر عادل کی کہی یہ بات درست محسوس ہوتی ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا اور معیاری لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ بہر حال میں اپنی فہم کے مطابق معیاری لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

انوکھی کہانیاں میں میری جو کہانیاں شائع ہوئیں ان میں سے 'نیند کے بعد، ایک تھی بستی،

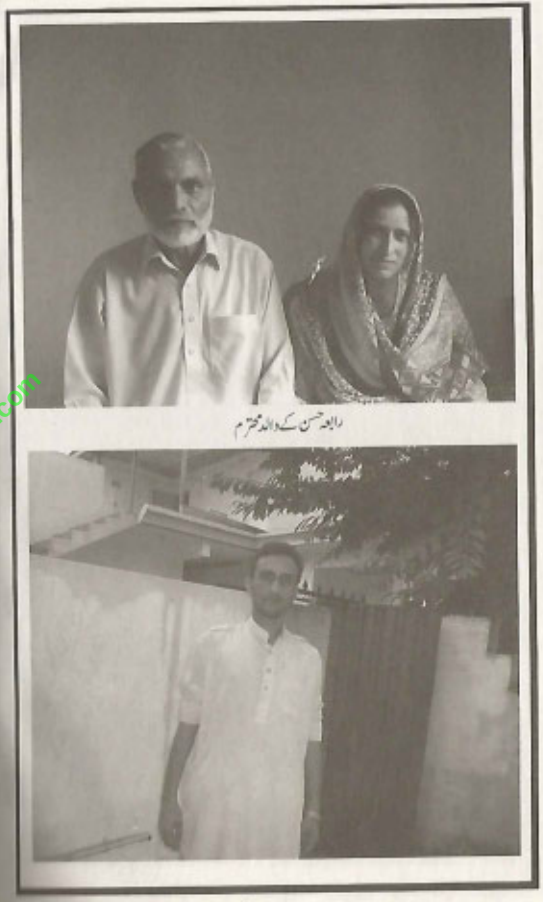

رابعہ حسن کے والد محترم

رابعہ حسن کے بھائی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

چاکلیٹ، بستہ اور گڑیا، بلاعنوان، اڑان، میں معلم ہوں گا، نورا اور بڈشاہ وغیرہ کے نام اس وقت میرے ذہن میں آ رہے ہیں۔ اگست 2005ء میں میری کہانی 'نیند کے بعد' کو انوکھی کہانیاں نے جون 2005ء کی بہترین کہانی قرار دیا تھا۔

انوکھی کہانیاں اب میرے شہر میں نہیں آتا اور یہی وجہ ہے کہ محبوب الٰہی مخمور مجھے ڈھیر سارے شمارے اکٹھے بھجوا دیتے ہیں۔

میرے نزدیک قلم، سوچ اور لفظوں کا رشتہ سب سے مضبوط اور خوب صورت ہے۔ اگرچہ میرا تعلق ایک دور دراز کے علاقے سے ہے اور میں بہت زیادہ لکھتی بھی نہیں ہوں، لیکن ان سب کے باوجود محبوب الٰہی مخمور بھائی ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

اگر میں یہاں رضیہ خانم کی محبت اور خلوص کو یاد نہ کروں تو بہت زیادتی ہوگی۔ وہ مجھ سے بہت انسیت رکھتی ہیں، مجھے اپنے خاندان کا ایک حصہ تصور کرتی ہیں اور ہر خاص و عام موقع پر بذریعہ فون یاد کرتی رہتی ہیں۔ وہ واحد خاتون رائٹر ہیں جن سے میں ذاتی طور پر واقفیت رکھتی ہوں یا رابطے میں رہتی ہوں۔

نوشاد عادل ایک اور شخصیت ہیں، جن کا تذکرہ بہت ضروری ہے اور جو میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں، بلکہ یوں کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ وہ میرے بڑے بھائی ہیں، کیوں کہ رشتے خون کے ہوں یا نہ ہوں ان میں بنیادی اہمیت محبت اور احترام کے جذبوں کی ہے اور اگر یہی جذبے خون کے رشتوں میں نہ ہوں تو وہ بھی کھوکھلے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ مجھے مسلسل لکھنے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔

ایک اور نام جس سے تعارف ''انوکھی کہانیاں'' کے ذریعے ہوا وہ عمیر عادل کا ہے۔ بطور لکھاری وہ میرے پسندیدہ لکھاریوں میں سے ایک ہیں جو بہت کم لیکن باکمال لکھتے ہیں، مگر وہ جتنا اچھا لکھتے ہیں، اتنی ہی اچھی اور مثبت سوچ کے حامل بھی ہیں۔

انوکھی کہانیاں میں لکھنے والے سبھی لکھاری اچھا اور معیاری لکھتے ہیں، اس لیے چند لکھاریوں کا نام لکھنا مناسب نہیں، کیوں کہ عہد حاضر میں قلم کو بچوں کی محبت میں اٹھانا بذات خود ایک بڑا جہاد ہے، اس لیے سبھی ادیب قابل قدر ہیں اور اس بات پر میرا ایمان ہے کہ دنیا میں ہر انسان دوسرے

سے مختلف ہے۔ شخصیت میں، سوچ سمجھ اور انداز میں۔ سو ہر لکھاری کا انداز بیاں مختلف ہے۔

درد کے فاصلے:

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

(فیض احمد فیض)

2003ء کی بات ہے جب میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی کہ ایک دن میں نے اخبار میں ایک کالم لکھ کر بھیجا، جس کے ساتھ میری ایک تصویر بھی تھی، مگر میرے ساتھ ہمیشہ سے ہی مسئلہ رہا ہے کہ میں تصویر میں بہت بڑی لگتی ہوں، اس لیے تصویر دیکھنے والا عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

اس کالم کے چھپنے کے کچھ دنوں بعد مجھے ایک روز بینک روڈ پر ایک ادھیڑ عمر شخص نے روک کر پوچھا۔ ''آپ نے کچھ دن پہلے اخبار میں کالم لکھا تھا؟

اس وقت میں کسی اور سوچ میں اتنی گم تھی کہ پہلے تو مجھے دھیان ہی نہ رہا کہ میں نے کبھی کوئی کالم لکھا بھی ہے کہ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے کہا۔ ''آپ تو بہت چھوٹی سی لڑکی ہو، مجھے خوشی ہوئی کہ اتنی کم عمر لڑکی اتنا زبردست لکھتی ہیں''۔

''میں دسویں جماعت میں پڑھتی ہوں۔'' جب میں نے انہیں بتایا تو انہیں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

''ہمارے دفتر ضرور آئیں اور اپنا مستقل کالم لکھیں۔''

یہ تھی میری پہلی ملاقات آزاد کشمیر کے سینئر ترین صحافی راجا ظفر حسین مرحوم صاحب سے، جو جب تک حیات رہے، میرے لیے صحافتی دنیا میں تحفظ کی علامت رہے اور 2012ء میں ان کی وفات کے بعد میری صحافتی زندگی کا باب بھی بند ہو گیا، کیوں کہ ہمارے ہاں اخبارات ایسے الفاظ شائع کرنے سے ہمیشہ جھجکتے ہیں جن سے بغاوت کی بو آتی ہو۔ نہ جانے یہ رجحان کب بدلے گا۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ قلم تلوار ہے تو میں اس کی دھار کند کر کے میدان میں کیوں آؤں؟ سو قلم

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

کی حرمت پر سودا منظور نہیں تھا اس لیے لکھنا چھوڑ دیا۔

تو بات وہیں سے جوڑتے ہیں جہاں سے ٹوٹی تھی۔ اس سرسری ملاقات کے بعد ''درد کے فاصلے'' کے عنوان سے میرا مستقل کالم روزنامہ محاسب میں عرصہ دراز تک شائع ہوتا رہا۔ مجھے بے باکی سے لکھنے کی وجہ سے بہت پذیرائی ملی۔ اس پذیرائی کی ایک وجہ میری کم عمری بھی تھی۔ یہاں مجھ سے پہلے کوئی اتنا کم عمر صحافی نہیں تھا۔

کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میرے کالم کے الفاظ کی کاٹ پر لوگوں نے اعتراض بھی کیا۔ محاسب کے علاوہ جب ظفر انکل (مرحوم) نے روزنامہ دوسیل نکالا تو میں نے اس میں بھی لکھا اور کچھ انٹرویوز اور رپورتیں وغیرہ بھی لکھیں، لیکن جب بعض وجوہ کی بنا پر اخبار خسارے میں جانے لگا تو ظفر انکل یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور اچانک ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مجھے آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگ کیسے اہل قلم کو سیاست کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بہت کم عمری میں انہی صحافتی سرگرمیوں کی بدولت صحافت میرا شوق بن گیا تھا، مگر گھریلو مجبوریوں کے باعث مجھے اس شوق سے کنارہ کش ہو کر تعلیم و تدریس کی طرف آنا پڑا۔

بزم اطفال: کسی رسالے یا میگزین کی ادارت کرنا میرے ونڈر لینڈ کی کسی کاپی کی بوتل میں بند خوابوں کی طرح کا ایک خواب تھا، جس کی ہلکی سی تعبیر 2005ء میں دیکھنا نصیب ہوئی اور ایک مقامی اخبار نے جب سنڈے میگزین کا اجرا کیا تو اس میں میری درخواست پر ظفر انکل (راجہ ظفر حسین مرحوم) نے بزم اطفال کا اجرا بھی کیا۔ اپنی نوعیت کا پہلا ایڈیشن یا میگزین جو بھی کہہ لیں، ہونے کی وجہ سے اس نے بے انتہا کامیابی حاصل کی۔ یہ ہفت روزہ تھا۔ اس زمانے میں، میں پہلے سیکنڈ ایئر اور پھر تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی، کالج کے بعد اس کام میں مشغول رہتی۔ ڈاک کے لفافے کھولنا، کہانیاں پڑھنا، ایڈٹ کرنا اور خطوط کا جواب دینا ایک خوبصورت احساس تھا، مگر 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلے نے ہزاروں عمارتوں کی طرح کالج کے اس خواب کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔

میں بڑا نہ تو چھوٹا: اکتوبر 2004ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی طرف سے مقابلہ کہانی نویسی منعقد ہوا جس میں، میں نے ایک کہانی بھجوائی۔ مئی 2005ء میں جب یہ بات میرے

ذہن سے معدوم ہو چکی تھی تو ایک دن میں اپنی سہیلی کے گھر سے واپس آئی تو امی اور ابو نے کہا تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔

میری سمجھ میں نہ آیا کیا سرپرائز ہو سکتا ہے؟ بہرحال کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے ایک خاکی لفافہ پکڑایا، جس میں ایک تحریری سند اور چیک موجود تھا۔ میری کہانی ''میں بڑا نہ تو چھوٹا'' نے دوسرا انعام حاصل کیا تھا جو بعد ازاں کتاب بچوں کی منتخب کہانیوں میں شائع بھی ہوئی۔

جب زمین نے کروٹ لی: آج بھی میری سماعتوں میں 8 اکتوبر 2005ء کی صبح ایف جے کالج کی اسمبلی کے اسٹیج پر کہے اپنے الفاظ گونجتے ہیں۔

''اگر کوئی علم کی راہ میں نکلے اور مارا جائے تو وہ شہید کہلاتا ہے''۔

اور چند ساعتوں بعد کلاس روم میں اپنا نام پکارے جانے کے انتظار میں تھی۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ میرے کچھ ساعتوں پہلے کہے گئے الفاظ درست ہونے جا رہے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا مگر جب ہوش آیا تو کالج کی دو منزلہ عمارت گری ہوئی تھی۔

اس وقت میرے کیا احساسات تھے یا کیا محسوسات تھے، انشاء اللہ کسی دن الگ سے لکھوں گی لیکن مجھے یاد ہے کہ میں گردن تک ملبے میں دبی ہوئی تھی اور میرے اردگرد کچھ لڑکیاں تو جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھی تھیں اور کچھ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر چیخ پکار کر رہی تھیں۔

''دیکھو تم نے کہا تھا نا کہ جو پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے اور مارا جائے تو وہ شہید کہلاتا ہے۔''

مجھے اس ملبے سے نکالنے والی میری ہی کچھ کلاس فیلوز تھیں۔ ہماری کلاس نیچے والی منزل پر تھی اور اوپر والی منزل گر کر اس کی چھت میرے برابر سامنے تھی۔ میں نے کالج کی گری ہوئی عمارت میں دبی ہوئی لڑکیوں کو دیکھا تو میں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مجھے وہ لڑکیاں بار بار وہاں سے نکلنے کے لیے کہہ رہی تھیں، مگر میں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میں اپنے جیسے انسانوں کے سروں اور ہاتھوں پر پاؤں رکھ کر نہیں چلوں گی۔ اس وقت تک مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں خود کتنی زخمی ہوں۔ جب کسی طرح گراؤنڈ میں پہنچی تو اچانک میری کزن نے مجھے دیکھ کر چیخنا شروع کر دیا۔ تب مجھے احساس ہوا میرا سر، ہونٹ، کمر اور پاؤں شدید زخمی تھے اور سفید یونی فارم خون سے سرخ ہو گیا تھا۔ ایک پاؤں میں جوتا بھی نہیں تھا۔ میرے بہن بھائیوں ناصر اور سعدیہ کا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

اسکول زمین بوس ہو گیا تھا۔ سعدیہ کو زندہ سلامت نکال لیا گیا تھا، مگر ناصر ابھی تک ملبے میں دبا ہوا تھا اور اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ دراصل اوزار گھروں کے ملبوں میں دب چکے تھے اور کنکریٹ کی چھتوں اور دیواروں کو خالی ہاتھوں توڑنا بہت کٹھن تھا، مگر اس روز میں نے انسانیت کو معراج پر دیکھا۔ جب شام کو کئی گھنٹوں بعد میرے بھائی کو زندہ سلامت نکالا گیا تو سب شکر کا ایک سجدہ اللہ کو کیا۔ اس روز میں نے بہت سی چیزیں سیکھیں کہ وقت کا احساس سکون کے ساتھ وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے سچے دل سے جب سجدہ کیا جاتا ہے تب یہ نہیں دیکھا جاتا کہ قبلہ کہاں ہے یا زمین پاک ہے یا ناپاک۔ یہ بھی کہ ہم تنہا نہیں۔ اس روز اتنا خون، اتنی لاشیں اور زخمی دیکھے کہ عام حالات میں دیکھوں تو شاید حواس کھو بیٹھوں۔

وہ رات میری زندگی کی سب سے خوف ناک رات تھی، جب کوئی تارا، کوئی امید کی کرن نہیں تھی اور شدید بارش اور اولے باری میں رات ہمیں کھیتوں میں گزارنی پڑی۔

یہ وہ وقت تھا، جب اُمید نام کی چیز ختم ہو چکی تھی اور آنے والے لمحات کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب میرے زخم ذرا بہتر ہوئے تو مجھے کالج کا خیال آیا، جہاں ابھی تک ملبے میں لاشیں دبی ہوئی تھیں۔ میں میٹرک سرٹیفکیٹ لے کر راولپنڈی یا میر پور کے کسی کالج میں ایڈمیشن لینا چاہتی تھی، مگر اس وقت کی پرنسپل ڈاکٹر شاہجہاں صائمہ نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ میں نے ارادہ بدل کر یہیں تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

14 نومبر 2005ء کو ہم نے FJ گرلز کالج میں دوبارہ کلاسز شروع کیں (شدید سردی میں کھلے آسمان تلے) تب پورے کالج میں صرف ایک اسٹوڈنٹ آئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ میری کوششوں سے کچھ ہی دنوں میں طالبات کی تعداد 144 ہو گئی۔ مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہے گا کہ جب بھی FJ کالج کی تعمیرِ نو کا نام آئے گا تو میرا نام سب سے اوپر لکھا جائے گا۔ اس دوران مجھے تین چار مرتبہ VOA واٹس آف امریکہ میں بولنے کا موقع بھی ملا۔ مجھے ورجینیا یونیورسٹی میں اسکالرشپ کی آفر بھی ہوئی، مگر یہ وہ وقت تھا جب میں گھر سے دور جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

بطور استاد میرا پہلا دن: 2007ء میں بی اے کے امتحانات کے بعد میں نے عارضی طور پر

ایک مقامی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مجھے پڑھانے کی الف۔ ب بھی نہیں آتی تھی۔ مجھے پہلی کلاس تھری ملی، چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اس وقت چڑیلیں لگ رہی تھیں اور اس پہ یہ قیامت کہ مجھے ان کو کمپیوٹر پڑھانا تھا۔ خیر پڑھانے کی نوبت تب آتی جب وہ بچے چپ ہوتے۔ یہ ہاف ٹائم کے بعد کا پیریڈ تھا بچے ابھی تک لنچ میں مصروف تھے۔ کوئی آم چوس رہا تھا تو کوئی انڈا پراٹھا کھانے میں مصروف، عجیب قسم کا دھم مچا ہوا تھا۔ میں نے کافی بار انہیں چپ کرانے کی کوشش کی، مگر انہوں نے جیسے نئی ٹیچر کو لفٹ ہی نہیں کرانی تھی۔ آخر کار میں نے تنگ آ کر رونا شروع کر دیا۔

میرا رونا تھا اور کلاس روم میں خاموشی چھا گئی۔ بچوں کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ تھوڑی دیر میں ایک بچی نے پاس آ کر مجھے اپنا آم بھی پیش کیا۔ اس زمانے میں مجھے بورڈ پر لکھنا بھی نہیں آتا تھا، سفر کشمیر کے پہاڑوں سے شروع ہوتی تھی اور کراچی کے سمندر تک چلی جاتی تھی۔ پرنسپل صاحب نے مجھے بورڈ پر لکھنا بھی سکھایا۔ میں نے چھ ماہ اس اسکول میں پڑھایا، مگر اس دوران تدریس کے وہ نقطے سیکھے، جو مجھے اب بھی کام آتے ہیں۔

پہلے دن میں رو رہی تھی اور آخری دن وہی بچے میرے لیے رو رہے تھے۔

تعلیم: میری اضافی سرگرمیوں کا کچھ لوگ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ میں شاید تعلیم پر توجہ نہیں دیا کرتی تھی، مگر حقیقت یہ ہے کہ میں ہمیشہ سے Devoted اسٹوڈنٹ رہی ہوں اور ہمیشہ سے اسکول، کالج، یونیورسٹی میں نمایاں رہی ہوں۔ 1998ء میں پرائمری کا امتحان پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ 2003ء میں، میں نے میٹرک کیا۔ نمبر بہت اچھے تھے، مگر مجھے بورڈ میں پوزیشن کی امید تھی، جو کہ نہیں آئی تو اس دن میں بہت روئی اور مجھے یاد ہے کہ میں نے تین دن تک بھوک ہڑتال کی۔

انٹر میں، میں نے پہلے پری میڈیکل میں شاہین ماڈل کالج میں ایڈمیشن لیا، لیکن مجھے سائنس میں دل چسپی تھی نہ ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، اس لیے میں نے مضامین تبدیل کر لیے۔ پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پیپرز دیے اور بورڈ میں دوسرے نمبر پر رہی۔ نومبر 2007ء میں، میں نے بی۔اے فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ میرا ارادہ ماس کمیونیکیشن میں ایڈمیشن کا تھا

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہگرامی کی خواہش تھی کہ مجھے ایم اے انگلش کرنا چاہیے اور ان کے ایک خواب کو میں پہلے ہی توڑ چکی تھی، اس لیے میں نے 2008ء میں آزاد کشمیر یونیورسٹی میں ایم اے انگلش میں ایڈمیشن لے لیا۔ یہ عرصہ بھی اچھا رہا، اس لحاظ سے کہ میرا شمار ذہین ترین، شرارتی، محنتی اور با اعتماد طالب علموں میں ہوتا تھا۔

یونیورسٹی لائف میں بھی میں ایک متحرک اسٹوڈنٹ رہی۔ فروری 2010ء میں ایم۔اے تیسری پوزیشن کے ساتھ کلیئر کیا۔ اس کے بعد ایک مقامی کالج میں دو سال تک گریجویشن کی کلاسز کو پڑھایا بھی۔ 2011ء میں بی ایڈ کیا اے کے یونیورسٹی ہی سے اور اس میں نمایاں رہی۔ 2012ء میں ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا اور ابھی ابھی میں نے ریسرچ ورک جمع کروایا ہے اور ایم فل مکمل ہو گیا ہے۔ اس سارے عرصے کے دوران میں ایم اے گریجویشن اور انٹر کلاسز کو پڑھاتی بھی رہی ہوں اور آج کل بھی پڑھا رہی ہوں۔ یونیورسٹی میں، میں نے مشاعروں اور تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا اور ہمیشہ نمایاں اور کامیاب رہی۔ اب میں AK یونیورسٹی میں بطور لیکچرار (انگریزی) تعینات ہو چکی ہوں۔ اگرچہ یہ ابھی عارضی نوکری ہے، مگر اُمید ہے جلد مستقل بنیادوں پر نوکری مل جائے گی۔ میں نے ریڈیو پر بھی کام کیا، اس کا آغاز تو بچوں کے پروگرام سے کیا تھا، لیکن بعد ازاں طلبا کے پروگراموں کے مقالے پڑھے اور بعد ازاں کمپیئرنگ بھی کی، مگر یہ سلسلہ میرے گریجویشن تک ہی جاری رہا۔

آخری الفاظ: میں نے انوکھی کہانیاں کے علاوہ روشنی میں بھی کچھ کہانیاں لکھیں، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ علاوہ ازیں ''دلکش'' (جو کچھ عرصہ شائع ہوا) اور ''پاکیزہ ڈائجسٹ'' میں بھی ایک دو مرتبہ لکھا (بہت پہلے)۔ کچھ افسانے کچھ سنڈے میگزینز میں بھی شائع ہوئے۔ اب میرا مستقل لکھنے کا ارادہ ہے۔ کچھ کتابوں کی بھی اشاعت کا ارادہ ہے۔

میری پہلی کتاب ''ایک تھی بستی'' کے عنوان سے جلد شائع ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اپنے افسانوں کے مجموعے پر کام کروں گی۔

میں سادہ مزاج ہوں۔ شاید مجھ میں لوگوں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی کچھ خاص نہیں، مگر میری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ میری ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ ہمیشہ دوسروں کے کام آنے کی

کوشش کرتی ہوں یہی وجہ ہے کہ اکثر غیب سے میرے بہت مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ میری تنگ نظر اور غیر تعلیم یافتہ ذہن رکھنے والوں سے نہیں بنتی اور نہ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں۔

میرا ذاتی خیال: میرا ذاتی خیال تھا کہ میں بچوں کی اچھی ادیبہ ہونے کے بجائے بڑوں کے لیے اچھا لکھ سکتی ہوں۔ میں خود افسانے ہی لکھتی ہوں، مگر میرا ادب کے بارے میں نقطہ نگاہ بھی مختلف ہے، کیوں کہ میں ادب برائے کاروبار یا ادب برائے مقصد کے خلاف ہوں۔ میں اپنے لیے لکھتی ہوں، کیوں کہ مجھے لکھ کر سکون ملتا ہے۔ میرا ارادہ اسی سال کے آخر میں افسانوں کا مجموعہ شائع کرانے کا ہے۔ واضح رہے یہ افسانے پہلے شائع نہیں ہوئے، کیوں کہ میں خالصتاً ادبی نقطہ نظر سے لکھتی ہوں، سو کسی بھی میگزین کی ردی کی ٹوکری میں افسانے پھینکوانے سے بہتر ہے کہ میں انہیں اپنے پاس سنبھال کر رکھوں۔

میرا خاندان: کچھ باتیں شاید مجھے آپ بیتی کے شروع میں لکھنا چاہیے تھیں، مگر وہ غالباً اس وقت ذہن سے نکل گئی تھیں۔ مثلاً میرے خاندان کے متعلق۔ میرا تعلق ایک خالصتاً علمی و دینی گھرانے سے ہے، جن کی متاع علم ہی ہوتی ہے۔ ہمارا گھرانہ یوں تو چھ نفوس پر مشتمل ہے، مگر ہم چھ کے چھ کٹھے کئی سالوں بعد ہی ہوتے ہیں۔ ابو رینائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں، امی ایک گھریلو خاتون ہیں۔ کتاب دوستی کا زیادہ اثر میں نے ابو سے لیا۔ میری امی ایک صلح جو خاتون ہیں، جن کے اخلاق اور اچھائی کی ہر ایک تعریف کرتا ہے میں آج جس مقام پر بھی ہوں، اس میں میری والدہ کا ہاتھ بہت زیادہ ہے ان کے خیال میں عورت کے پاس تعلیم کا ہتھیار ہونا چاہیے اور اسے کبھی بھی کمزور نہیں ہونا چاہیے۔ اکثر لوگوں کو حیرت ہوگی کہ مجھے ماسٹر کرنے تک گھر کا کوئی کام نہیں آتا تھا، میں نے گھریلو کام MA کرنے کے بعد سیکھے۔

میری امی مطالعے کی بہت شوقین ہیں۔ رات کو کوئی کتاب پڑھے بغیر نہیں سوتیں۔ مجھ سے بڑا بھائی منصور روزگار کے سلسلے میں شہر سے باہر ہی رہتا ہے۔ وہ ایک زمانے میں اخبارات کے بچوں کے ایڈیشن میں لکھا بھی کرتا تھا۔ مجھ سے چھوٹا بھائی ناصر ابھی کالج میں زیر تعلیم ہے اور سب سے چھوٹی بہن سعدیہ ایبٹ آباد میں MBBS کی طالبہ ہے۔ وہ کہانی نگار بھی ہے اور کبھی کبھار کالم بھی لکھتی ہے۔ وہ ایک اچھی مصورہ بھی ہے۔ ہماری عمر میں کافی فرق ہے، لیکن اس کے باوجود

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ہماری گہری دوستی ہے۔ یہاں اگر میں چھوٹی فاطمہ کا ذکر نہ کروں تو میری آپ بیتی ادھوری رہے گی۔ وہ میری خالہ زاد اور چچا زاد ہونے کے ساتھ ساتھ میری بڑی اچھی دوست بھی ہے۔ اسے کہانیاں سننا بہت پسند ہے اور اسے کہانیاں سنا کر میں اپنے بچپن کو از سر نو تازہ کرتی ہوں۔

آزاد کشمیر اور بچوں کا ادب: آزاد کشمیر میں اگرچہ شرح تعلیم پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں بچوں کے ادب کا وجود نہیں۔ اگر کچھ لکھنے والے لوگ ہیں بھی تو باقاعدہ لکھنے والے کم ہیں اور سب سے بڑا مسئلہ رائیٹرز کے درمیان رابطے کا فقدان ہے۔ میں یہاں سے ایک رسالہ نکالنے کا سوچ رہی تھی، مگر وسائل کی کمی کے سبب یہ ممکن نہیں۔ دوسرا ایک تنہا ادیب یہ کام کر بھی نہیں سکتا، جب تک کہ کوئی تجربہ کار آدمی آپ کے ساتھ نہ ہو۔ کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر آزاد کشمیر میں بچوں کے ادیبوں کے لیے ایک متحرک فورم بنانے کا ارادہ ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان کچھ کرنے کا ارادہ کرے تو رستے خود بخود ہی بن جاتے ہیں۔ یہاں ایک نام اگر نہ لکھوں تو زیادتی ہوگی، جناب منظور گیلانی یہ شفیق اور مہربان بزرگ علم کا خزانہ ہیں، جن کے خیال میں اگر میں زندگی میں مستقل مزاجی سے محنت کروں تو بہت آگے جا سکتی ہوں۔

دو آپ بیتیاں: کہتے ہیں کہ دوسروں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے، اس سے زندگی گزارنے کا عزم و حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ گزشتہ دنوں مجھے پرانے نٹ کھٹ میں نوشاد عادل کی آپ بیتی پڑھنے کا اتفاق ہوا، جسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ اگر انسان کچھ کرنے کی لگن رکھتا ہو اور مشکلات کی پروا کیے بغیر اگر مستقل مزاجی سے اس پر ڈٹا بھی رہے تو کامیابی اس کا مقدر بنتی ہے۔ دوسری آپ بیتی احمد عدنان طارق کی ہے، جس میں ان کی کتاب سے محبت واقعی قابل تعریف ہے۔

آنے والے وقت کے بارے میں میری کوئی منصوبہ بندی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی اکثر وہ نہیں دیتی جو ہم چاہتے ہیں اور آنے والا کل تو بالکل ان دیکھا ہوتا ہے۔ میں ویسے بھی "آج" پر یقین رکھنے والوں میں سے ہوں، کیوں کہ ہمارا آنے والا کل ہمارے آج ہی کا پھل ہوگا۔

میری زندگی میں ایسا کچھ نہیں کہ جسے پڑھ کے متاثر ہوا جائے، مگر ایک بات یقیناً آپ نے محسوس کی ہوگی، وہ ہے لفظوں سے محبت، کتاب سے دوستی۔

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

ببرک کارمل جمالی

بچوں کے ادب سے محبت کرنے والے بلوچستان کے ایک ایسے ادیب کی داستان جنہوں نے بہت کم عرصے میں بچوں کے ادب میں اپنا نام نمایاں کیا۔ فروغ اردو ادب کے لیے کٹھن حالات کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔

میں اس وقت پیدا ہوا جس وقت ببرک کارمل افغانستان کے حکمران تھے۔ اس وقت ایم آر ڈی کی تحریک عروج پر تھی۔ لوگ پے در پے اس تحریک کا حصہ بن رہے تھے۔ عظیم مصنف جام ساقی اس وقت ہمارے گاؤں میں موجود تھے۔ انہوں نے میرے ماموں سکندر اور میرے دادا کو میرا نام ببرک کارمل رکھنے کی تجویز دی۔ اس وقت تک میں اس دنیا میں آیا بھی نہیں تھا لیکن میرا نام پہلے ہی تجویز ہو گیا تھا۔ جب میں پیدا ہوا اس وقت میرا آبائی گاؤں ترقی پسند لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ میرے گاؤں والوں نے اس وقت وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کو للکارنے کی جنگ شروع کر دی۔ یہ جنگ ووٹ کی طاقت سے شروع ہوئی جو آج تک جاری ہے۔ میں بچپن میں بہت شرارتی تھا۔ جب میں ایک سال کا ہوا تو ایسی ایسی شرارتیں شروع کر دیں کہ سب لوگ حیران ہوتے تھے۔ کبھی کرکٹ کے بیٹ سے کسی کا مٹکا توڑا تو کبھی کسی کی کھڑی فصل سے کچے آم توڑے کبھی اسکول کے کسی بچے کو گتھی سے مار کر گھر واپس آیا۔ مسلسل تین سال کی عمر تک اتنی شرارتیں کیں کہ امی آج بھی مجھ سے کہتی ہیں کہ دس سال کی عمر کے بعد جا کر میری شرارتیں کم ہوئیں۔ میں نے پہلی جماعت سے لے کر پانچویں جماعت تک اول پوزیشن لی مگر میں نے اپنے انعامات کو ہمیشہ خود استعمال کیا۔ میں نے پرائمری اپنے گاؤں گوٹھ غلام محمد جمالی سے پاس کیا۔ یہ پرائمری اسکول 1840ء میں بنا تھا جو آج تک حکمرانوں کی عدم توجہی کی وجہ سے پرائمری ہے۔ پھر میں نے گورنمنٹ مڈل اسکول فیض الفقیر سے مڈل پاس کیا۔ ہر سال کی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

طرح ششم سے لے کر آٹھویں جماعت تک اول پوزیشن لی۔ اسی دوران نور محمد جمالی بھائی کو کہانیاں پڑھتے دیکھ کر مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوا۔ ابتدا میں سید قاسم محمود کی تحریریں پڑھنی شروع کیں۔ میں نے ان کی پہلی تحریر ''وفادار کتے'' پڑھی تھی جسے آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ میں نے پہلی تحریر 1999ء میں لکھی جو ماہنامہ ذہین میں چھپی۔ اس وقت میں نہم جماعت کا طالب علم تھا۔ تحریر چھپنے کی خوشی کی انتہا کسی کو بتانے کے قابل نہ تھی اس تحریر کو میں نے گھر والوں سے چھپا کر ایک بڑی کتاب خریدی اور اس میں چسپاں کر دیا۔ جو آج تک میرے پاس موجود ہے۔ اسی دوران میں نے لکھنے کا باقاعدہ آغاز کر دیا پھر لکھتا ہی رہا۔ آج تک قلم کو نہیں چھوڑا۔ البتہ کچھ ماہ کے لیے بچوں کے ادب کو خیر باد کر کے بڑوں کے ادب میں چلا گیا۔ بلوچستان کے تمام اخبارات میں تحریں لکھنے لگا تو علاقے کے کئی صحافی مجھے جاننے کی کوشش میں لگ گئے۔ جب ان سے ملاقاتیں ہوئیں اور خبروں پر تبصرے شروع ہوئے تو اخبارات نے مجھے نیوز رپورٹر کی دعوت دی جس پر میں نے روزنامہ آزادی جوائن کر لیا۔ کافی وقت تک روزنامہ آزادی میں لکھتا رہا۔ 2012ء میں میری 120 تحریریں روزنامہ آزادی میں شائع ہوئیں جن میں اکثر بلوچستان کے حالات پر فیچر رپورٹ تھیں اور چند کہانیاں تھیں۔ اسی دوران روزنامہ مشرق کوئٹہ کے لیے فیچر رپورٹ لکھنا شروع کیں مگر پھر اخبارات کے نہ ملنے اور ادارے کی عدم توجہ کی وجہ سے رانا مقبول ایڈیٹر مشرق کے لیے لکھنا کم کر دیا۔ ایک ماہ میں صرف ایک تحریر روانہ کرنے لگا۔ اس دوران ریگولر تعلیم کی بجائے پرائیویٹ امتحانات دینا شروع کیے۔ 2000ء میں میٹرک کی تعلیم مکمل کی تو گورنمنٹ ہائی اسکول گنداخہ میں نقل اتنی تھی کہ پوزیشن لینا میرے بس کی بات نہ تھی۔ پھر میں نے اس سال سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ اسی دوران تعلیم کو ذاتی مصروفیات اور گھریلو کام کاج کی وجہ سے خیر باد کہہ دیا مگر پھر 2004ء میں ایف اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا جبکہ یکم مئی 2006ء کو میری پوسٹنگ محکمہ ہیلتھ میں نرسنگ اردلی کے ہو گئی تو پھر 2007ء میں نے بی اے پاس کیا اور تعلیم کے ساتھ اپنی پوسٹنگ بھی جاری رکھی۔ جبکہ 2012ء میں ایم اے بین الاقوامی تعلقات عامہ پاس کیا۔ اس طرح اپنی تعلیم مکمل کی۔ بچوں کے ادب میں کافی لکھا جتنا لکھا اس کا صلہ آج تک نہ ملا۔ نہ میں نے اپنی کوئی کتاب شائع کروائی نہ کبھی کسی ادارے

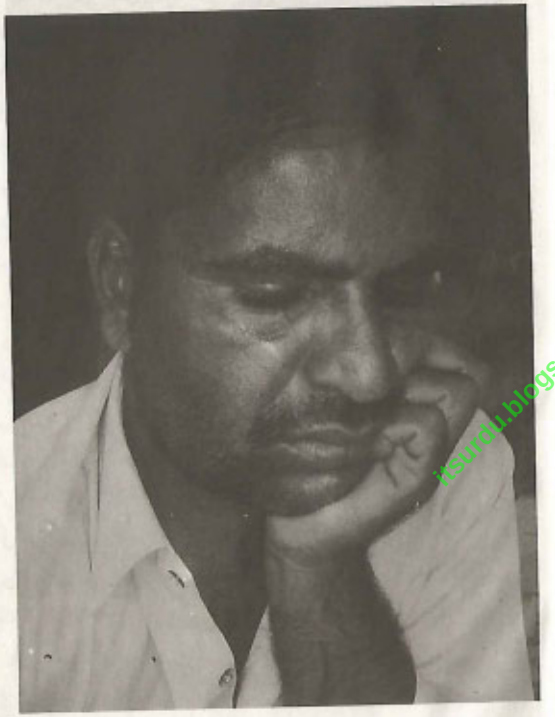

ہیرک کارل جمالی

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

رابطہ کیا۔ میری دو تحریریں ایک محبوب الٰہی مخمور بھائی کی شائع کردہ کتاب میں شائع ہوئی اور ایک تحریر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی کتاب ''اوور اسٹوراوور روڈز'' میں شائع ہوئی۔ اس طرح بچوں کے ادب کے حوالے سے میں نے پاکستان کے تمام رسائل میں لکھا۔ ماہنامہ ذہین، ماہنامہ پھول، ماہنامہ انوکھی کہانیاں، ماہنامہ بزم منزل، ماہنامہ نٹ کھٹ، ماہنامہ کرن کرن روشنی، ماہنامہ تعمیر ادب، ماہنامہ پیغام، ماہنامہ روشنی اور دیگر کئی رسالے ہیں جن میں قلم آزمائی کر چکا ہوں جبکہ اخبارات میں روزنامہ مشرق، روزنامہ آزادی کوئٹہ، روزنامہ جنگ کوئٹہ، روزنامہ باخبر کوئٹہ، روزنامہ ایکسپریس اور بلوچستان کے کئی دوسرے اخبارات میں اپنے قلم کا جادو جگا چکا ہوں۔ اخبارات میں کچھ نہ کچھ لکھ چکا ہوں جبکہ ماہنامہ جہاں نما کوئٹہ میں دو قسط وار تحریریں بھی لکھ چکا ہوں اور بلوچستان کے مسائل اور ان کے حل کے حوالے سے گزشتہ چار ماہ سے سلسلہ شروع کر چکا ہوں جو نائنٹل اسٹوری کے تحت ہر ماہ چھپ رہا ہے جس میں بلوچستان کے ہر موضوع پر لکھ رہا ہوں۔ بزم قرآن لاہور میں میری قسط وار ایک تحریر ابھی بھی چل رہی ہے۔ پاکستان کے تمام مشہور مقامات گھومنے کا شوق تو ہے مگر ان پر تحریر لکھنے کا بھی ارادہ رکھتا ہوں۔ مستقبل میں ایک ایسا سلسلہ سیر و تفریح کا شروع کرنے کا ارادہ ہے کیونکہ پاکستان میں ایسے مقامات ہیں جہاں آج تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے اور نہ کوئی جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بلوچستان میں کئی ایسے علاقے میں نے دیکھے ہیں جہاں پر حیرت انگیز چیزیں تو موجود ہیں مگر توجہ طلب ہیں اور ان کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ماضی میں ہمارے آباؤ اجداد نے کیوں اتنا سفر کر کے پاکستان کا رخ کیا۔ محمد بن قاسم نے ہمارے علاقے سے کیوں سندھ پر حملہ کیا۔ ہزاروں سال پرانے کنویں اور 1840ء میں قائم اسکول کیوں یہاں بنایا گیا۔ اور پہلے انگریز گورنر نے بلوچستان کو سونے کی چڑیا کیوں کہا۔ ایسے سوالات ہیں جس کو میں گزشتہ دس برس سے پڑھ رہا ہوں اور لکھ رہا ہوں۔ ان چیزوں پر مزید لکھوں گا۔ حالات اور واقعات کے ساتھ ہمیں تاریخ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہر شخص کی طرح میری زندگی بھی دکھوں اور خوشیوں سے بھری پڑی ہے۔ سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوا جب چھوٹا بھائی فرحان ایک حادثے میں شدید زخمی ہوئے اور ان کی ایک ٹانگ مشین میں چلی گئی اس کو ہم فوری طور پر لاڑکانہ لے گئے مگر پھر بھی اس کی ٹانگ سیدھی نہ ہو سکی تو ہم اس کو

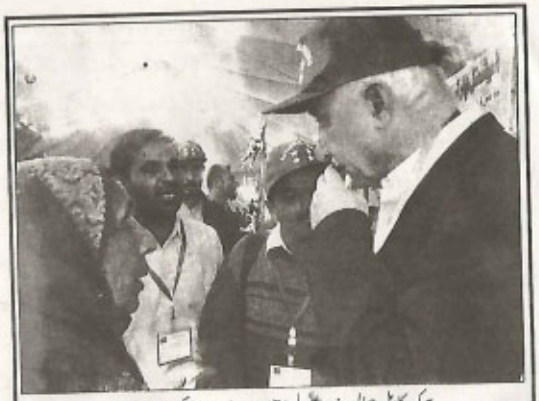

ہرک کارمل جمالی، وزیر اعلیٰ بلوچستان سے بات چیت کرتے ہوئے

ہرک کارمل جمالی، وزیر اعلیٰ بلوچستان کے ساتھ

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

لے کر کراچی چلے گئے وہاں ایک نجی اسپتال میں ان کا آپریشن ہوا اور اس کی ٹانگ الحمد للہ ٹھیک ہو گئی۔ ماشاءاللہ اب وہ نہم جماعت کا طالب علم ہے اور ہر روز اسکول جاتا ہے تو میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے لیے خوشی کا اور کوئی مقام نہیں ہے، میرے والدین بھی بے حد خوش ہیں۔ اس دوران میں نے کراچی میں کئی ادیبوں سے ملاقاتیں بھی کیں جن میں محبوب الٰہی مخمور، ابن آس، سعید سعیدی، ایم مجاہد، عمران اسحاق، رمضان چمن، اعظم طارق کوہستانی، ایڈیٹر ساتھی، فصیح حسینی بھائی، ڈاکٹر فاطمہ حسن، غلام محی الدین ترک اور دیگر کئی دوست تھے جن سے میری پہلی ملاقات تھی۔ 2003ء کے اسلام آباد کیمپ میں بھی کافی ساتھیوں سے ملاقات ہوئی تھی جن میں سید قاسم محمود، رضوان ثاقب، ڈاکٹر افتخار کھوکھر، ڈاکٹر طارق ریاض، شعیب مرزا، نذیر انبالوی، آفتاب گل، عمران اسحاق، جنید علی فریدی، اکرام صدیقی، عامر حسن، سید صفدر رضا شامل ہیں۔ زندگی میں کئی اہم شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں سیاست دان بھی کافی ہیں۔ کے علاوہ اخبارات کے ایڈیٹر سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں بلوچستان کے تقریباً تمام اخبارات شامل ہیں۔ میری زندگی میں کئی واقعات ایسے ہیں جنہیں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک مرتبہ میں لیب میں کام کر رہا تھا کہ میرے استاد نے غلط رپورٹ دے دی جس کی وجہ سے زندگی کے لالے پڑ گئے۔ یہ میری زندگی کا یادگار واقعہ تھا۔ بچپن میرا سارا شرارتوں سے بھرا پڑا ہے اسی وجہ سے بچپن کی چوٹیں آج تک مجھے لگی ہوئی ہیں۔ میری پسندیدہ سبزی ساگ، پالک، آلو اور تمام سبزیاں ہیں۔ میرے پسندیدہ شاعر احمد فراز، فیض احمد فیض، حبیب جالب اور انور شعور ہیں جبکہ پسندیدہ ادیب دوست کافی ہیں۔ بچوں کے ادب میں نذیر انبالوی، اشفاق احمد، نوشاد عادل، ابن آس محمد، اختر عباس، غلام محی الدین ترک، محبوب الٰہی مخمور بھائی شامل ہیں۔ بڑوں کے ادب میں تارڑ صاحب، احمد ندیم قاسمی، جاوید چودھری، خورشید اقبال اور ہر اچھا لکھنے والے ادیب کو پسند کرتا ہوں۔ پسندیدہ رسالوں میں سب بچوں کے لیے شائع ہونے والے میگزین ہیں۔

میرا پسندیدہ جملہ کہانی کے آخری جملے کو اتنا اچھا ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جائے اور ہر ابتدائیہ جملہ حیرت انگیز ہوتا کہ پڑھنے والے کے دل کو چھو لے۔ میری آپ بیتی اس [illegible] ہے۔ اس آپ بیتی کو سچ بیتی سمجھ کر لکھ دیا ہے۔

itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

حیرت انگیز، ایڈونچر، ایکشن اور خوف ناک ناول

سرد جہنم

مصنف: نوشاد عادل

☆ دنیا کے سرد ترین خطے میں کھیلا جانے والا ایک ہول ناک ڈراما۔

☆ خون رگوں میں جمد کر دینے والے ایڈونچر اور ایکشن سے بھرپور واقعات۔

☆ ناول پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کوئی خوف ناک انگلش فلم دیکھ رہے ہیں۔

☆ ایڈونچر پسند کرنے والوں کے لیے بطور خاص۔

☆ بار بار پڑھنے اور ہمیشہ محفوظ رکھنے والا یادگار ناول۔

---

itsurdu.blogspot.com

دل چسپ اور بہترین کہانیوں کا خوب صورت مجموعہ

بہترین کہانیاں

مدیر: محبوب الٰہی مخمور

☆ ملک کے مشہور ادیبوں کی دل چسپ اور

مزے دار کہانیوں پر مشتمل ایک شان دار مجموعہ۔

☆ اس مجموعے میں ندیم اختر، رانا محمد شاہد، ابن آس محمد، رابعہ شاہین، وجاز ہرا، ایس امتیاز احمد، لیاقت علی تلمبہ، ڈاکٹر عمران مشتاق، الطاف حسین، ڈاکٹر رضیہ عزیز، شازیہ فرحین، محمد شاہد حفیظ، محمد عادل منہاج، غلام محی الدین ترک، نوشاد عادل، عبدالرشید فاروقی، رضیہ خانم، انور آس محمد، وقاص یوسف، شیخ فرید، فتح محمد عرشی اور محمد سعید عباس کی بہترین کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

دونوں کتابیں دو دو مصنفات پر مبنی ہیں۔ ہارڈ بائنڈنگ اور عمدہ سرورق کے ساتھ ایک کتاب کی قیمت 300 روپے ہے۔ دونوں کتابیں ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت بمعہ ڈاک خرچ 400 روپے ہے۔

منگوانے کا پتہ: پوسٹ بکس 4252 کراچی۔ موبائل 0333-217237

itsurdu.blogspot.com

itsurdu.blogspot.com

یہ پاکستان کی پہلی تاریخ ساز کتاب ہے کیوں کہ اس سے قبل اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ جب بھی آپ بیتیاں کے حوالے سے تاریخ لکھی جائے گی تو ہماری کتاب کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ اس پہلے حصے میں جن شخصیات کی آپ بیتیاں شامل ہوئی ہیں، میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور باقی شخصیات کی آپ بیتیاں بھی جلد آئندہ حصوں میں شائع کی جائیں گی۔

محبوب الٰہی مخمور

نامساعد حالات، مالی مسائل، پبلی کیشن میں عدم دل چسپی، مالی منفعت کی کمی اور بے حسی سے بھرے اس منظر نامے میں سب کے "محبوب" محبوب الٰہی مخمور اور "شاد بھرے" نوشاد نے مشکل اور صبر آزما کام کو منزل مقصود تک پہنچانے کی ٹھانی تو پھر ناممکن نظر آنے والا ناسک ممکن نظر آنے لگا۔

مصطفیٰ ھاشمی

کہنے کو تو یہ قلم کاروں کی آپ بیتیاں ہیں لیکن درحقیقت یہ ادب کی ایک تاریخ مرتب ہو رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بڑھے گی۔ سالوں گزرنے کے بعد جب یہ آپ بیتیاں پڑھی جائیں گی تو لوگ جان سکیں گے کہ پچھلے عشروں میں کون کون لکھنے والے تھے۔

نوشاد عادل

محبوب الٰہی مخمور کی محنت رنگ لائی ہے۔ انہوں نے بچوں کے ادب کے جرنیلوں کی زندگی سے اقتباسات اُن کی اپنی زبانی کہلوا کر اُسے ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر کے امر کر دیا ہے۔ یہ کارنامہ محبوب الٰہی مخمور کے سینے پر کامیابی کا میڈل بنا جگمگا رہا ہے۔

ڈاکٹر عمران مشتاق آسٹریلیا

SBN:978-969-9562-35-8
itsurdu.blogspot.com
قیمت 600 روپے